اسلامی ثقافت کے سنگِ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

ترجمہ و تلخیص: راجہ ف۔م۔ ماجد

Institute of Islamic Culture
ادارہ ثقافت اسلامیہ
Lahore - Pakistan

Marfat.com

Marfat.com

اسلامی ثقافت کے سنگِ میل

Marfat.com

Marfat.com

اسلامی ثقافت کے سنگِ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

ترجمہ و تلخیص: راجہ ف۔ م۔ ماجد

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ، لاہور

Marfat.com

۲۹۷٫۶۰۱
۱۶۲۳ ع
۱۵۸۳۶۵

جملہ حقوق محفوظ ہیں

عنوان:	اسلامی ثقافت کے سنگِ میل
مصنف:	ڈاکٹر عبدالکریم عثمان
مترجم:	راجہ ف۔م۔ ماجد
طبع اوّل:	2012ء
مطبع:	طیب اقبال پریس، لاہور
ناشر:	قاضی جاوید ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
قیمت:	-/450 روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

Marfat.com

مندرجات

(1)	اسلامی ثقافت کے سنگِ میل	1
(2)	اسلام اور عصرِ حاضر کے چیلنج	95
(3)	اسلامی کی آفاقیت اور انسان دوستی	125
(4)	اسلام کے مختلف نظام	166
(5)	اقتصادی نظام	238
(6)	امدادِ باہمی	255
(7)	عائلی نظام	264
(8)	فرد اور معاشرہ	280
(9)	اخلاقی نظام	287
(10)	اسلام کے اثرات	295

Marfat.com

Marfat.com

اسلامی ثقافت کے سنگِ میل

بیسویں صدی کے تیسرے ربع میں دنیا نے عالم اسلام کی بیداری کا مشاہدہ کیا اور عالم اسلام کا بڑا حصہ غیر ملکی تسلّط سے آزاد اور آزادی کی زندگی سے متمتع ہوا۔ اسلامی ممالک کے ذرائع اور خزائن رفتہ رفتہ ان کے باشندوں کو واپس مل گئے۔ اس کے علاوہ کئی ممالک میں زندگی کے تمام معاملات میں نظامِ اسلامی رائج کرنے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں اور علمی، اقتصادی اور صنعتی ترقی کی خواہش رکھنے والے نیک نفس انسانوں کے خواب اور آرزوئیں پوری ہوتی نظر آئیں۔

مگر یہ صورتِ حال مکمل طور پر واضح اور روشن رہتی کیونکہ عالمِ اسلام عرصہ دراز تک مصائب و آلام کا شکار رہا اور صراطِ مستقیم سے انحراف اور دوری اور تفرقے بازی کے ایسے مظاہر کی آماجگاہ بنا رہا جو گزشتہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بغض اور کینے کے منصوبے آخری حد کو چھونے لگے اور ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ امتِ اسلامیہ میں انتشار پیدا ہوا، تفرقے بازی ہوئی اصلی طاقت کے سرچشمے خشک ہونے لگے۔ عالم اسلام کا رقبہ سکڑنے لگا، کمزور علاقوں پر حملے کیے گئے (جس میں خود اپنوں کا زیادہ حصہ تھا) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یروشلم پر قبضہ کر لیا گیا اور بیت المقدس کی، جس کی زیارت کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان آتے تھے، بے حرمتی کی گئی اور یہ ایسا ابتلا تھا کہ چشمِ فلک نے آٹھ صدیوں سے نہیں دیکھا تھا۔

Marfat.com

لیکن ان مصائب و آلام میں فطری طور پر خیر و شر، تیز رفتاری اور سست گامی اور موت و حیات دونوں کے پہلو شامل ہیں۔ جب مسلمانوں کو ان آلام کی حقیقت کا ادراک ہوا اور انہوں نے ان کے اسباب کا اندازہ کر لیا تو وہ نئی اور خوشگوار زندگی کی ابتدا کرنے کے قابل ہو گئے اور دوست دشمن میں پہچان کرنے لگے۔ قوموں کی زندگی میں مصائب، اضطراری لمحات بن کر آتے ہیں اور انہیں ان مصائب کے اسباب پر غور و فکر کرنے کا موقع مہیا کرتے ہیں اور اس صورت حال سے نمٹنے اور اس کی اصلاح کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہ ادراکِ ذات کر سکیں اور اپنی زندگی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اس کی حفاظت کر سکیں اور پر فخر کریں۔

کبھی کبھی یہ مصائب قوموں کے لیے زہرِ قاتل بھی بن جاتے ہیں، جن کی وجہ سے قوم اپنے سے غالب قوم میں ضم ہو جاتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ یہ اس کی کشمکش، موت و حیات اور عدم وجود کا معرکہ ہے اور وہ سنگ ریزوں کو گوہرِ آب دار سمجھ لیتی ہے۔ وہ معاملات کی حقیقت تک پہنچنے کی بجائے ظاہری اصلاح پر قناعت کر لیتی ہے۔ اس صورت میں اس قوم کی فنا یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے۔

جس طرح کسی کے قریبی عزیز کی وفات یا تو اس فرد میں اقدار کی نعمتوں اور پائیدار نصب العین کے احیا کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے اس کا ایمان مضبوط ہو اور ارادہ پختہ ہو اور وہ ثابت قدم بن جائے یا پھر اس آفت کی وجہ سے بالکل تباہ و برباد ہو سکتا ہے، اسی طرح قوموں کا معاملہ ہے مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صحیح رُخ پر ڈالیں اور اپنے اختیار کردہ افکار یا ترک کردہ روایات کو صحیح تنقید اور فکرِ صالح کی کسوٹی پر پرکھیں تاکہ ان کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کے بہترین مقاصد پورے ہو سکیں۔ مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے اور صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی طرف یہ پہلا قدم ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اسلام، اس کے نظاموں اور روایات کے بنیادی اصول یہاں بیان کریں اور ابتداء ہی میں خلوصِ دل سے ان کی اہمیت کا جائزہ لیں۔

اس عرضِ حال کے کئی اسباب ہیں:

مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کئی فکری چیلنج در پیش ہیں۔ افکار کی منڈی میں طرح طرح کا مال پیش

Marfat.com

کیا جا رہا ہے۔ معاشرتی، فکری اور سیاسی نظریات و عقائد حدِ شمار سے باہر ہیں اور ان افکار و عقائد کے ماننے والے، انہیں عوام الناس میں مقبول بنانے کے لیے تہذیب جدید کے جملہ وسائل کو کام میں لا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے قلم، کتب، رسائل، مجالس، تقاریر اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ ان جدید ذرائع کی وجہ سے ہماری دنیا سکڑ کر ایک وحدت بن گئی ہے جس کے ایک کونے میں کہا ہوا لفظ دوسرے کونے تک سنا جاتا ہے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی قوم ان افکار سے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین کی حقیقت، وسعت اور مسلمانوں اور انسانوں کے لیے جو کچھ اس نے پیش کیا ہے اس کی قدر و قیمت کو دقت نظر سے جان لیں۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے دل و دماغ میں ایمان کی بنیادیں ہل جائیں گی اور وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے بے بہرہ رہ جائیں گے اور ہر سمت سے حملہ آوروں کی زد میں ہوں گے

مسلمانوں میں ایسی آراء اور افکار رواج پا گئے ہیں جو اسلام سے مطابقت نہیں رکھتے اور اس کے بنیادی اصولوں اور مقاصد سے متعارض ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نظریہ جو مسلمانوں میں رائج ہوا، سیکولرازم تھا، یعنی دین و دنیا میں جدائی یا دین کی امورِ زندگی میں عدم مداخلت۔ اسلام کے لیے یہ تصور بالکل اجنبی ہے۔ اس کی ابتدا "قیصر اور خدا" میں تفریق سے ہوئی جس کے مطابق دنیا امور کا مالک "قیصر" ٹھہرا اور روحانی معاملات اور عبادات امورِ دین قرار پائے یہ بات کسی تصریح کی محتاج نہیں کہ یہ مفہوم اسلام پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ اس میں دین و دنیا کی حدود الگ الگ نہیں، نہ حکومت اور مذہب میں تفریق ہے کیونکہ اسلام انسانی زندگی کا دین ہے اور اس کی پوری توانائیوں اور سرگرمیوں کو محیط ہے۔ کوئی بھی نظریہ، جو انسان کا اپنے رب سے تعلق منقطع کر دے باطل اور گمراہ کن نظریہ ہے اور وہ اسلام اور حیاتِ اسلامی کی جڑیں کھود رہا ہے۔

بعض لوگوں نے مسلمانوں میں "نظریۂ قومیت" رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظریہ بھی دینِ اسلام، تاریخِ اسلامی اور اسلام کے تہذیبی ورثے سے کٹا ہوا ہے۔ دراصل یہ نظریہ ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں نے پیدا کیا جو انیسویں صدی میں یورپ میں منظرِ عام پر آئیں۔ ان کا نصب العین ان تمام قبائل کو یکجا کرنا تھا جو مختلف سلطنتوں کے ماتحت تھے اور انہیں ان شاہی حکومتوں سے

Marfat.com

الگ، مستقل ممالک قرار دینا تھا۔

ہر قوم کے اپنی قومیت پر ناز اور تعصب نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ دین کو نظر انداز کر دیا گیا اور ان روایات کو فنا کر دیا گیا جو دین سے پھوٹتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مختلف قبیلوں، چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قومیتوں میں بٹ گئے اور پھر یہ قبیلے اور قومیتیں مزید تقسیم ہو گئیں اور یہ ثمرہ تھا ابتدائی نظریۂ قومیت پر ایمان لانے کا۔ کیونکہ جب آپ یقین کر لیں کہ اپنے وجود کی اساس نظریہ قومیت پر ہونی چاہیے جو ہمارے ماضی، ہماری تاریخ اور ہمارے عقیدے سے متعارض ہے تو وہ پھر وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو آپ کو باقی تمام مسلمانانِ عالم سے پیوستہ رکھتا ہے۔ پھر جو چیز آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں اس سے دوسروں کو کس طرح روک سکتے ہیں۔

اس کے بعد اشتراکیت یا سائنسی سوشلزم یا کمیونزم کو لیجیے اور اس کی ان مختلف تشریحوں کو پیشِ نظر رکھیے جن کی ترویج کرنے کے لیے اس کے حامیوں نے دن رات ایک کر دیئے۔ اشتراکیت کسی رنگ اور کسی نوع کی ہو، ظاہر ہو یا خفیہ ہو۔ ایسا نظریہ ہے جو دین اسلام کی اساس، بنیادی اصولوں اور تمام تفسیروں سے متناقض ہے۔ اسلام کے ماننے والے، اور ہر اس چیز سے جو انہیں اشتراکیت اور اسی قسم کے دوسرے نظریوں اور ہر اس چیز سے، جو انہیں اپنی شریعت سے اور اپنے دور اپنے معاشرے کے لیے فائدہ مند احکام کا استنباط کرنے سے باز رکھے، بالکل الگ ہیں۔ دونوں کے افق ایک نہیں۔ اسلام چودہ سو برس سے جملہ حاجات انسانی کو پورا کر رہا ہے اور کسی تغیر و تبدل حالات نے اسے پریشان نہیں کیا نہ چھوٹے سے چھوٹے یا مشکل سے مشکل مسئلے کے حل تلاش کرنا اس کے لیے دشوار ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ مغرب کی معاشرتی زندگی جو اخلاقی انحطاط کا شکار ہے اور شریفانہ و انسانی اقدار سے انحراف کر چکی ہے، اسلامی معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ مغرب اپنے زوال آمادہ طرزِ زندگی کو نشر و اشاعت کے ہر حربے سے انسانوں کے سامنے بنا سنوار کر پیش کرتا ہے لیکن یہ چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔

شرم و حیا سے عاری، اس طرزِ زندگی کے نظریات بہت بڑی حد تک افکارِ اسلامی میں دخل پا چکے ہیں اور اب یہ حالت ہے کہ مسلمان قوم کے اُن اخلاق و آداب اور اسلامی اصولوں کی

Marfat.com

جڑ کاٹی جا رہی ہے جو جدید مغربی تہذیب میں راسخ ہوتے والی مادی اقدار سے متناقض ہیں مغرب کے سیاسی، اقتصادی، فکری اور ثقافتی افکار، الحاد کی تبلیغ، مذہب سے دوری اور مسلمانوں کی اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت، اس پر مستزاد ہے اور مسلمانوں میں ایسے افراد ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام محض عقیدے اور عبادت کا نام ہے یا تاریخ میں خاص وقت تک محدود تھا جس کا زمانہ گزر گیا اور اہمیت گزر گئی۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام معاشرتی اور انسانی تنظیم کو جامد کرتا ہے جو انسانیت کے ارتقاء کے خلاف ہے۔

(اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ اسلام کی حقیقت کو واضح طور پر پیش کیا جائے جو اس کے تمام مبادیات کو صحیح صحیح پیش کرے جن میں اسلامی تعلیمات کی حکمت اور اس کے بنیادی اصولوں کی تمام ادیان و مذاہب اور دیگر نظاموں پر فوقیت ثابت کی جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ جس طرح جامعہ ریاض (سعودی عرب) جامعہ دمشق (شام) اور جامعہ اُم درمان (سوڈان) میں "نظامِ اسلام" یا "اسلامی ثقافت" کا نصاب رائج کیا گیا ہے، اسی طرح دوسری اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی جاری ہو جائے۔

اسلامی ثقافت کے موضوع کی غرض و غایت یہ ہے کہ تفصیلات میں جائے بغیر، طالب حقیقت کو اسلام کی واضح اور جامع صورت دکھائی جائے۔ اس لیے اس میں توحید، فقہ، تفسیر نفسیر یا دیگر علوم اسلامی سے بحث نہیں کی گئی کیونکہ یہ اپنی ذات میں الگ اور مکمل علوم ہیں لیکن حقیقتِ اسلامی، اسلامی ثقافت و تہذیب کی اصل، اور اس دین ممتاز کی فطرت جاننے کے لیے جو انسان کو اللہ کے راستے پر ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی عمدہ اور بہترین چیزوں سے متمتع ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان علوم سے استفادہ ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

> "اور جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسن سلوک کیا ہے تو بھی (بندوں سے) حسنِ سلوک سے پیش آ......" (القصص ۷۷)

اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم درج ذیل موضوعات کو بیان کریں۔

۱۔ دل و دماغ میں راسخ ہونے والے زندہ اور تابناک عقیدے کے طور پر اسلام

Marfat.com

کی حقیقت۔

۲۔ انسانی سرگرمیوں کی تمام انواع، مثلاً عقیدہ، عبادات، اخلاق، افکار، اقتصادیات، سیاست اور معاشرت میں نظامِ اسلام کی حقیقت۔

۳۔ عرب تہذیب و ثقافت پر اسلام کا اثر بطور دین اور دائرہ انسانیت میں اس کا نفوذ۔

اس موضوع کا ممتاز اور منفرد اسلامی شخصیت سے اساسی تعلق ہے یعنی فردِ مسلم اور اُمتِ مسلمہ کی شخصیت، کیونکہ اس سے مسلمانوں کو وہ ہیئت ملی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور یہ امت کے تمام افراد میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے فرد کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے تعلقات مرتب ہوتے ہیں اور اسی سے چھوٹے بڑے تمام امور میں اُمّت کے مؤقف کا علم ہوتا ہے۔

اس موضوع کے راستے پر چلتے ہوئے ضروری ہے کہ درج ذیل اغراض و مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے:

سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی سچائی کے بارے میں صحیح علمی شعور پیدا کیا جائے تاکہ صاحبِ کردار مسلم نوجوان اپنے عقیدے سے آگاہ اور اس کے "طول و عرض" سے واقف ہو جائے۔ اس ادراک سے وہ تمام اجنبی عقائد اور نظریات سے مکمل طور پر محفوظ ہو سکتا ہے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایسے مسلمان پیدا کرنے میں مدد دی جائے جو توانا اور صالح ہو، اپنے رب پر ایمان لانے والا ہو، اس کے آگے سجدہ ریز ہو اور ایک ایسے صالح معاشرے کی تشکیل میں کوشاں ہو جس کی تمام توانائی اعلائے کلمۃ اللہ اور شریعت الٰہی کے قیام کے لیے مخصوص ہو۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کے لیے دردمندی پیدا ہو اور اپنے آپ پر اور تمام لوگوں پر اس کی حیثیت واضح کی جائے اور اس عظیم پیغام کی اہمیت راسخ کی جائے جو انسانیت کے لیے لایا گیا۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ اس غلط تصور کی نفی کی جائے جو اسلام دشمن قوتوں نے پھیلایا ہے کہ مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے تمسک کے باعث ہے اور یہ واضح کیا جائے کہ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ اسلام پر یقین رکھنے والی قومیتوں کا زوال اس دین صحیح کے مبادیات کو ترک کرنے اور

Marfat.com

اپنی انفرادیت اور اجتماعی زندگی میں ان پر خلوصِ دل سے عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

ان مقاصد کے حصول سے، اسلامی ثقافت کی غرض وغایت برقرار پائی کہ متفرد لوگ اور آزادخیال معاشرہ قائم ہو اور یہی سیدھے راستے پر چلنے کا اولین طریقہ ہے جو عزت، ترقی اور خدا کی رضا کی طرف لے جاتا ہے۔ خدا ہمیں اس مقصد میں کامیاب فرمائے۔

اِسلام کے بنیادی اُصول

زندگی کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ

حیاتِ وجود کے بارے میں اسلام کا خاص نظریہ ہے، اور الوہیت، کائنات اور انسان کے متعلق مستقل اور جامع تصور ہے۔ اس نظریے کی بنا پر، اور اس تصور کی وجہ سے ان تمام انسانی اصولوں اور نظاموں کو سمجھنا آسان ہے جن کی اسلام نے بشارت دی ہے۔

ہر نظام میں معاملہ یکساں ہے اور اس فلسفے کو سمجھے بغیر جس پر یہ نظام قائم ہے یا اس تصور کو جانے بغیر جس پر کائنات اور زندگی کا دارومدار ہے۔ کسی نظام کے صحیح خدوخال کا ادراک ممکن نہیں کیونکہ اجتماعی نظام، اس زندگی اور انسان کے اس میں مرکزی نقطہ ہونے کی جامع تفسیر کی ایک شاخ ہے اور جو نظام اس تفسیر پر قائم نہیں وہ مصنوعی ہے جس کی تقدیر میں بقا نہیں۔

اسلامی تصورِ حیات، باقی تمام تصورات سے (خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید) مختلف ہے اگرچہ ان میں سے بعض تصورات کے ساتھ جزوی مماثلت ہے مگر ان تصورات کا سرچشمہ اور ان کی اساس بالکل مختلف ہے۔ اسلامی تصورِ حیات ایک جامع تصور ہے کیونکہ وہ تمام عناصرِ حیات کے لیے عام نظریہ پیش کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا علم ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے حقائقِ عظمیٰ یعنی حقیقتِ خداوندی، حقیقتِ کائنات اور حقیقتِ انسان کو جان لے۔ مسلمان کے لیے فقط اس ادراک سے اس زندگی میں اپنا مقام متعین کرنا اور اس کے نتیجے میں اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالنا اور اس سے مفاہمت پیدا کرنا ممکن ہے

Marfat.com

لامحالہ یہ تصور قرآن حکیم ہی میں ملتا ہے اور اسی میں یہ زندہ نظریے کے طور پر موجود ہے جو افکار و احساسات و وجدان پر حاوی ہے۔ کوئی مسلمان یا محقق قرآن کی طرف رجوع کرے تو اسے یہ نظریہ اس میں جامع اور کامل صورت میں ملے گا بشرطیکہ وہ اپنے امکان کی حد تک اُن خاص تغیرات سے گریز کرے جنہوں نے اس نظریے کی توانائی چھین لی ہے اور اُسے انحرافات اور غلط تصورات کے صحرا میں پھینک دیا ہے۔

انسان

اسلامی تصور میں انسان، اس دنیا میں بسنے والی مخلوقات میں سب سے سربلند، سب سے افضل اور سب سے اشرف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے چند اہم خصوصیات ودیعت کی ہیں۔ اُسے مخصوص صفات سے ممیز کیا ہے اور ایسے اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کیا ہے جن تک باقی ساری مخلوقات پہنچنے سے قاصر ہے۔ قرآن کریم میں متعدد بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

(ہم نے انسان کو بہترین اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے) (التین : ۴)

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے)۔ (الاسراء یا بنی اسرائیل : ۷۰)

اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین میں اپنی خلافت کے لیے اور اس کائنات کو بھلائی اور نیک عمل سے آباد کرنے کے لیے پیدا کیا۔ اس غرض سے انسان کی فطرت اور صالح بنائی ہے۔ وہ چاہے تو اُسے بھلائی کے لیے استعمال کرے، چاہے تو بُرائی میں لگا دے۔ انسان کی فطرت میں بُرائی نہیں نہ وہ کسی "ناکردہ گناہ" کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں کہ جس کا بھوت عمر بھر سایہ بن کر اس کا پیچھا کرتا رہے (جس طرح بعض مذاہب میں تصور کیا جاتا ہے) بلکہ وہ اپنے فعل و عمل سے خیر یا شر پاتا ہے:

(وہ یقیناً بامراد ہو گیا جس نے اپنی جان کو پاک کر لیا اور وہ یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا)۔ (الشمس : ۹-۱۰)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کی اہم حقیقتوں کا ادراک ودیعت کیا ہے اور ان حقائق

Marfat.com

کو جان لینے کی ہم سونپی ہے جو حواس، عقل اور وجدان کے ذریعے آفاق و انفس اور ہر چیز میں دیکھے جاسکتے ہیں (فصلت : ۵۳) زمین میں بھی مومنین کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں اور اسی طرح آسمان میں ایسی اور اس سے بڑی نشانیاں ہیں :

(کہو، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اس پر نظر ڈالو)۔ (یونس : ۱۰۱)

(اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)۔ (الذاریات : ۲۱)

انسانی فطرتِ سلیم اگر کشادہ دلی سے کائنات کا مطالعہ کرے تو اس پر اس کا مقصد، ارادہ اور تخلیق واضح ہو جائے گی۔ اور وہ اس زندگی میں اپنے مقام اور طرزِ عمل سے آگاہ ہو جائے گی۔ اس تصور کے نتیجے میں انسان کا خدا سے تعلق بھی متعین ہو جائے گا اور یہ وہ تعلق ہے جو صرف خدائے واحد کی مطلق بندگی کی تعلیم دیتا ہے اور اس بندگی کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا اولین اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ "زندگی کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں" صرف اسی خدائے واحد کی فرمانبرداری کی جائے" اور پورے خلوص نیت سے ہر حرکت، ہر قول اور ہر عمل سے اسی کی ذات کو سزاوارِ توجہ سمجھا جائے[۱] بندگی یا عبودیت، اس معنی میں صرف اللہ کو خدا اور معبود گردانتا ہے، خواہ عقائد ہوں یا شریعت، یا عبادات، "کیونکہ مسلمان خدائے واحد کے سوا کسی کو الوہیت کا مالک نہیں سمجھتا نہ اس کی مخلوق میں سے کسی کو لائق عبادت خیال کرتا ہے اور نہ اس کے بندوں میں سے کسی کو حاکمیت کا اہل قرار دیتا ہے"[۲]

بندگی سے یہ نسبت، اور انسان کا اس بارے میں اقرار اور کچھ حلقوں کی کوشش کے باوجود اس پر اصرار، تخلیق انسان سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اسے قرآنِ کریم میں یوں بیان فرمایا ہے:

(اور جب آپ کے پروردگار نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل کو باہر نکالا اور خود انہی کو ان کی جانوں پر گواہ کیا (اور کہا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں ؟ بولے ضرور ہیں ہم گواہی دیتے ہیں (یہ اس لیے کہ) کہیں قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے)۔ (الاعراف : ۱۷۲)

جب انسان اس تعلق کے مقتضیات کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کا عمل خدا وند تعالیٰ

Marfat.com

کی رضا اور حکم کے تابع ہونا ہے اور اسی سے زندگی اور روشنی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان سے اور انسان کے لیے جو کچھ چاہتا ہے وہ اپنے برگزیدہ انبیاء پر نازل کردہ پیغام کے ذریعے پہنچا دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا احسان اور کرم ہے کہ اپنا پیغام بھیج کر، انسانوں کو بلا وجہ مشقت سے بچا لیا اور اس موضوع پر، جس کی ان کے پاس کوئی دلیل ہے نہ ذرائع، اپنی کوشش صرف کرنے سے محفوظ رکھا۔ جب انسان اسے اپنا نصب العین بنا لے تو وہ کامیاب ہوتا ہے اور اسے ترک کردے تو بھٹک جاتا ہے۔ استاذ ابو الحسن ندوی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"انبیاء نے لوگوں کو ذاتِ الٰہی، اس کی صفات اور افعال کی خبر دی، اور اس دنیا کی ابتدا اور مقصدِ حیات سے آگاہ کیا اور موت کے بعد پیش آنے والی باتوں کی اطلاع دی۔ ان سب باتوں کا علم لوگوں کو انبیاء کے واسطے سے بلا مشقت اور بے قیمت حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان علوم کی بے کار بحث میں پڑنے سے بچا لیا جن کے ان کے پاس نہ مبادی ہیں نہ دلائل کہ جن پر اپنی بحث کی بنیاد رکھ کر نامعلوم چیز تک پہنچ سکیں۔ کیونکہ یہ علوم حسی ہیں نہ طبیعی۔ ان میں حواس کام آتے ہیں نہ نظر فائدہ دیتی ہے۔ ـــــ نہ لوگوں کے پاس ابتدائی معلومات ہیں، لیکن لوگوں نے اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے نئے سرے سے معاملے کو ہاتھ میں لے لیا اور بڑے دعوے سے بحث شروع کی اور ایسے گمنام علاقوں میں سفر شروع کیا جس میں کوئی مرشد تھا نہ رہنما، اور اس میں بسا اوقات انہیں گمراہی، ناکامی اور بے کار صعوبت کا سامنا کرنا پڑا۔......
مثال کے طور پر جغرافیہ میں علمِ انسانی نے جو حاصل کیا اور نسل ہا نسل سے جو کچھ نقشوں میں لکھا اور بیان کیا، انسان نے پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کو از سرِ نو ناپنے کا ارادہ کیا اور صحراؤں، مسافتوں اور سرحدوں کا دوبارہ جائزہ لیا حالانکہ عمر کوتاہ، قوت کمزور اور آلات ناپید تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی منزل کھوئی ہوئی اور ارادہ متزلزل ہو گیا اور صرف اِدھر اُدھر کی بے کار باتیں حاصل ہوئیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے الٰہیات میں بصیرت اور ہدایت کے بغیر

Marfat.com

غور و خوض کیا اُس علم میں انہیں ناقص رائے اور نامکمل معلومات ملیں یا ان کے خیالات ناپختہ اور نظریات جلد بازانہ نکلے ...... خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔"[۱۳]

کائنات سے انسان کا رشتہ دوہرا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتے، نفع اٹھانے، اور اپنی منفعت کے لیے اس کی تسخیر کے لیے آزاد ہے۔ دوسرا یہ کہ کائنات غور و فکر اور تدبّر و تعامل کا ایسا موضوع ہے جس کے ذریعے اس کے خالق اور کارساز تک پہنچنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں رشتے اللہ تعالیٰ نے اتنے مربوط اور ہم آہنگ بنائے ہیں کہ ایک جان دو قالب ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اَدل بدل میں اور ر جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں ان چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور (اس) پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں (جو) آسمان اور زمین کے درمیان مقید ہے (ان سب میں) ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، نشانیاں (موجود) ہیں۔) (البقرہ: ۱۶۴)

اور پھر فرمایا:

(وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا دیا ہے اور آسمان سے پانی اتارا، پھر تمہارے لیے غذا کو پھل پیدا کیے، سو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ اور تم جانتے بھی ہو)۔ (البقرہ: ۲۲)

اس کے بعد کہا:

(وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو، اور اسی لیے تمہارے لیے کھیتی اگاتے ہیں۔ نیز زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچتے رہتے ہیں اور اسی نے تمہارے (فائدے کے) لیے رات اور دن، اور سورج و چاند

Marfat.com

کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم کے پابند (مسخر) ہیں بے شک اس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے رہتے ہیں، اور اُن (چیزوں) کو بھی مسخر بنا یا) جنہیں زمین پر تمہارے لیے پھیلایا۔ اُن کے اقسام مختلف ہیں بے شک اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو نصیحت حاصل کرتے رہتے ہیں اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تُو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور تاکہ تم (اس کا) شکر ادا کرتے رہو۔ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیے ہیں تاکہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور دریا اور راستے (بنا دیے) تاکہ تم راہ پاتے رہو اور علامتیں بھی (بنائیں) اور ستاروں سے بھی (لوگ) راہ پاتے ہیں۔ اچھا، تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اسی جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کر سکتا؟ تو کیا تم (اتنا بھی) غور نہیں کرتے؟)۔ (النحل: ۱۰-۱۷)

انسان کو اس کائنات سے فائدہ اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس عالم سے تعاون کرے اور وہ ان قوانین کو سمجھ لے جن پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ عمل کرے۔ اس لیے اس کائنات میں ہر چیز ایک دقیق انداز سے بنائی گئی ہے اور ایسے نقشے پر تعمیر کی گئی جسے اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا:

(ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے)۔ (القمر: ۴۹)

(اس نے ہر چیز بنائی اور اسے ناپ کر ٹھیک کیا)۔ (الفرقان: ۲)

(اور ہر شے اس کے نزدیک ایک متعین اندازے ہی سے ہے)۔ (الرعد: ۸)

اس ترتیب و نظام کے موجود ہونے پر وہ تمام آیات واضح دلیل ہیں جو قرآن کریم میں تاکید سے آئی ہیں اور اس کائنات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں:

(اور ایک نشانی ان لوگوں کے لیے رات بھی ہے۔ ہم اس پر سے دن کو اتار لیتے ہیں۔ سو یکایک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ اور (ایک نشانی) آفتاب بھی ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے زبردست

Marfat.com

اور علم والے (خدا) کا۔ اور (ایک نشانی) چاند بھی کہ ہم نے اس کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ ایسے رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، اور سب ایک دائرے میں تیر رہے ہیں)۔ (یٰس: ۳۷، ۴۰)

انسان کا فرض ہے کہ کائنات و مافیہا کی حقیقت جاننے کی پوری کوشش کرے یہاں تک اُسے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہو جائے۔ ایسا کر کے وہ فرمانِ الٰہی کے تابع ہو جائے گا:

(وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سو تم اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ کی (دی ہوئی) روزی میں سے کھاؤ)۔ (الملک: ۱۵)

اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہے گا تو گویا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ اور کافروں کو مومنین پر سبقت اور مسلمانوں پر تسلّط کا موقع فراہم کرے گا۔

پھر اس انسان کی حقیقت کیا ہے جو ایک طرف تو حقیقتِ الٰہیہ تک ایمان، عبادت اور شریعت کے اتباع کے ذریعے پہنچتا ہے اور دوسری طرف کائنات میں غور و فکر کرتا، اسے تسخیر کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے؟ وہ ایسی مخلوق ہرگز نہیں جو محض مادی وجود رکھتی ہو کہ اس کی موت سے بکھر جائے۔ اسی طرح وہ محض روحانی مخلوق نہیں کہ مادی وجود نہ رکھتی ہو اور صرف عبادت اور یادِ الٰہی میں غرق ہو جائے۔ اسلام کے نزدیک انسان ایک ایسی ہستی ہے جو جسم، عقل اور روح سے مرکب ہے اور خداوند تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کرے کہ ان تمام عناصر کے مقاصد کو پورا کر سکے، کیونکہ اس کی ذات میں ہر عنصر اپنا اپنا فرض ادا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں یہ کائنات آباد ہے۔

انسان کی ذات ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے، اور خداوند تعالیٰ کے اس قول سے بھی بھی یہی واضح ہوتا ہے:

(جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں انسان کو پیدا کرنے والا ہوں گیلی مٹی سے، پھر جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم اس کے روبرو سجدے میں گر پڑنا)۔ (ص: ۷۱-۷۲)

Marfat.com

بنیادی طور پر انسان اپنے فطری میلانات، خواہشات اور جنس، بھوک اور پیاس کے احساسات کے معاملے میں حیوانات یا دوسری ذی روح مخلوقات سے مشابہ ہے:

(اور جو بھی جانور زمین پر چلنے والا ہے اور جو بھی پرندہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑنے والا ہے وہ سب تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں)۔ (الانعام: ۳۸)

اس عنصر کی موجودگی، انسان کی محافظتِ ذات و نوع کے لیے تیار کرتی ہے، لیکن وہ عقل کی وجہ سے جملہ حیوانات اور ذی روح مخلوقات سے ممتاز ہے جو فطری میلانات کا پورا کرنے کا آسان راستہ اختیار کرنے میں اس کی معاون ہے۔ اسی طرح وہ زندگی میں ترقی کرنے اور اس کائناتِ عظیم کے سربستہ راز کھولنے میں مددگار ہے:

(اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے سماعت اور بینائی اور دل پیدا کیے تاکہ تم شکرگزار بنو)۔ (النحل: ۷۸)

جہاں تک روح ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات کی مخفی قوتوں تک پہنچنے اور اس نور سے وجدان حاصل کرے جسے حواس دیکھ نہیں سکتے اور عقل پا نہیں سکتی۔ عقل اور روح ہی کی بدولت انسان اس زمین پر خلیفہ بننے کا مستحق ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اس عظیم امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہے جس سے جملہ موجودات نے معذوری ظاہر کی:

(ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اپنے ذمے لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے)۔ (احزاب: ۷۲)

کائنات

کائنات کے بارے میں اسلامی نظریے کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز، جس میں آسمان، زمین، سورج، چاند، مخلوقات اور انسان شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے پیدا کی اور اپنے آپ ظہور میں نہیں آئی، نہ وہ فطری تبدیلیوں اور تغیرات کا نتیجہ ہے۔ یہ بیکار اور بے مصرف بھی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پیدائش ایک معین مقصد کے لیے کی۔

Marfat.com

کائنات عبث، بے مقصد اور بے وجہ پیدا نہیں کی گئی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسانی سرگرمیوں کے لیے میدان مہیا کرے جس میں انسان اپنی قوتوں اور امکانات کو بروئے کار لائے اور اپنی منفعت کے لیے مسخر کرے۔ اس منفعت کا نتیجہ عبادتِ الٰہی کا حصول اور انسانی معاشرے میں شریعتِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس مفہوم تک رسائی کے لیے کسی بھی محقق کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ قرآن کریم کی کائنات اور مخلوقات سے متعلقہ آیات میں سے کسی بھی آیت کا مطالعہ کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ تسخیرِ کائنات کا مستقل ربط انسانی منفعت سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"بے شک (اللہ ہی) دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے، وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالنے والا ہے۔ وہی تمہارا اللہ ہے سو تم کہاں اُلٹے چلے جا رہے ہو؟ وہ صبح کو برآمد کرنے والا ہے اور اسی نے رات راحت کی چیز بنائی اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرایا ہوا ہے، بڑے غلبے کا، بڑے علم والے کا۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے تارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعے سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ پاؤ۔ بے شک ہم نے دلائل کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو خبر رکھتے ہیں، اور وہی تو ہے جس نے تم (انسانوں کو) پیدا کیا ایک ہی شخص سے۔ پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی اور ایک جگہ چند سے رہنے کی (ہے) بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں اور وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے ہر قسم کی روئیدگی کو نکالا۔ پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ ہم اس سے اوپر تلے چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھوں سے خوشے (نکلتے ہیں) نیچے کو لٹکے ہوئے اور (ہم نے) باغ، انگور اور زیتون اور انار کے (پیدا کیے) باہم مشابہ اور غیر مشابہ، اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو (دیکھو) بے شک ان سب میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان کی طلب رکھتے ہیں۔"

(الانعام: ۹۵-۹۹)

Marfat.com

کائنات کا نظام مضبوط اور مستقل قواعد پر مبنی ہے جس سے انسان کے لیے اس سے انتفاع آسان ہو جاتا ہے

"(کائنات میں) پیش آنے والے واقعات، ایک دوسرے سے اور ماضی و مستقبل سے، باقاعدگی اور تسلسل سے مربوط ہیں، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات اپنے وجود اور حرکات میں یعنی قواعد کی تابع ہے۔"[۲]

اور اسی کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے:

"اور ایک نشانی ان لوگوں کے لیے رات بھی ہے۔ ہم اس پر سے دن کو اتار لیتے ہیں سو یکایک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور (ایک نشانی) آفتاب بھی کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے زبردست (اور) علم والے (خدا) کا۔ اور (ایک نشانی) چاند بھی کہ ہم نے اس کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔" (یٰس: ۳۷-۴۰)

اور پھر فرمایا:

"اور ہم نے آسمان سے اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا اور ہم اس کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے سے تمہارے لیے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ اگائے، ان میں تمہارے لیے بہت سے میوے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔" (المومنون: ۱۸-۱۹)

اس کے بعد مزید کہا:

"کیا نہیں یہ علم نہیں کہ اللہ ایک ایک بادل کو چلاتا رہتا ہے، پھر اس کو باہم ملا دیتا ہے، پھر اس کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ وہ اس کے بیچ میں سے نکل کر آتی ہے۔" (النور: ۴۳)

پھر فرمایا:

"کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اُسے زمین

Marfat.com

کے سوتوں میں داخل کر دیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے۔ جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے، سو تم اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس (نمونۂ قدرت) میں بڑی نصیحت ہے اہلِ عقل کے لیے۔" (الزمر: ۲۱)

گویا جب کائنات میں پیش آنے والے واقعات کے بدیہی ثبوت موجود ہیں اور ان واقعات میں ہم آہنگی، باقاعدگی اور واضح قوانین کی پابندی نظر آتی ہے اور اسلامی تصور کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس بات پر ایمان لے آئے کہ ان تمام اسباب کے پیچھے، اللہ کا ارادہ موجود ہے اور وہ کسی ایک حقیقت کو جان لینے، یا کسی ایک سبب تک پہنچنے پر مطمئن نہ ہو جائے یا اس سے فریب نہ کھائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"ہمیں نے تمہیں پیدا کیا ہے، سو تم (بعث ثانی کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم جو نطفہ پہنچاتے ہو تو اس کے بنانے والے تم ہو کہ ہم؟ ہمیں نے تمہارے درمیان موت کو ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے (دوسرے آدمی پیدا کر دیں اور تمہیں ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے ہی نہیں، اور تم کو خوب علم ہے۔ پیدائش اوّل کا، پھر تم سمجھتے کیوں نہیں؟ اچھا، پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اُسے تم اگاتے ہو یا (اس کے) اگاتے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چورا چورا کر دیں پھر تم حیرت کرنے لگو، (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے! اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا (اس کے) برساتے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا کر دیں تو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہمی نے اس کو یاد دہانی کی چیز اور مسافروں کے نفع کی چیز بنایا ہے۔ سو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کیجیے۔" (الواقعہ: ۵۷۔۷۴)

اسی طرح انسان، عناصر کائنات کی حقیقت کی تلاش میں ہمیشہ مضبوط اور یقینی نقطۂ آغاز کی طرف لوٹتا ہے جو اسے ٹامک ٹوئیاں مارنے اور عقل اور فطرت جیسے غیر یقینی اور غیر حقیقی واقعاتی

Marfat.com

اسباب پر بھروسا کرنے سے بچا لیتا ہے، یا کسی اساطیری کائنات کی طرف جھکنے سے محفوظ رکھتا ہے جیسے کہ قدیم صنم پرستوں نے کیا، یا کئی فلسفیوں کو غلط فہمی ہوئی۔ تصورِ اسلامی کے نزدیک کائنات اور زندگی کے تمام رشتے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی نگرانی اور نگہبانی اور اختیار میں ہیں۔

جو شخص کائنات کو غور و فکر کا موضوع بناتا ہے، جلد ہی اس بات کو جان لیتا ہے کہ اس کا علم کتنا ہی وسیع و جامع کیوں نہ ہو، کائنات کے بہت معمولی حصے کو پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب "مواقع النجوم" کی قسم کھائی تو اس کا مقصد ستاروں پر غور و فکر کی طرف انسان کو متوجہ کرنا تھا۔ اس پر یہ انکشاف ہو گیا کہ ستاروں کی تعداد عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے کیونکہ وہ لاکھوں ہیں، اور ان کے حجم اتنے ہیبت ناک ہیں کہ زمین پر کام آنے والے آلات انہیں ناپنے سے قاصر ہیں۔ زمین اور دوسرے سیاروں کے حجم میں آسان سا موازنہ ہی ہماری بات کی تصدیق کرے گا، اور انسان کو معلوم ہو گا کہ ستاروں کا سائز اور ان کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے کہ اسے صرف جدید دور کے "نوری پیمانے" ہی سے ناپا جا سکتا ہے۔ ایک "نوری سیکنڈ" وہ مسافت ہے جو روشنی ایک سیکنڈ میں طے کرتی ہے۔ پھر جب ہمیں معلوم ہو کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا سفر طے کرتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ بعض سیاروں کا درمیانی فاصلہ لاکھوں "نوری سال" کے برابر ہے تو ہمیں اس کائنات کی ضخامت اور عظمت کا احساس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی ضمن میں فرمایا ہے:

> "آپ کہہ دیجئے کہ اگر سمندر (سارے کے سارے) روشنائی ہو جائیں، میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لیے، تو سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہو سکیں گی اور اگرچہ ہم اسی جیسا (اور سمندر) اس کی مدد کو لے آئیں۔"
>
> (الکہف: ۱۰۹)

جب ہم اپنی نظر "زندہ کائنات" پر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اجناس، اشکال اور رنگا رنگ نباتات میں بھی تخلیق کی وسعت، تنوع اور ایک دوسرے سے امتیاز نظر آتا ہے۔ جن کا احاطہ مشکل ہے اور یہ سب کچھ ایک ہی زمین سے نکلتا ہے اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتا ہے۔

ضروری ہے کہ ہم یہاں دو معنوں کی طرف اشارہ کر دیں: پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ اس

Marfat.com

کائنات میں غور و فکر سے مراد محض نظری اور بصری تامل یا حواس سے اندازہ نہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اس پر علمی انداز میں باقاعدہ غور کیا جائے جس سے کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور اس کے ضابطوں کا پورا پورا شعور حاصل ہو اور قرآنِ کریم میں وارد کلمات ''یتفکرون'' یا ''تدبرون'' یا ''یتعقلون'' کا مفہوم کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور اس کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد، اسی معنی میں واضح دلالت کرتے ہیں:

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور لیل و نہار کے آگے پیچھے آنے، اور ان کشتیوں میں، جو سمندر میں چلتی ہیں...... عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔'' (البقرہ : ۱۶۴)

''جو لوگ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (کہ) اے ہمارے رب! تم نے یہ (سب کچھ) بیکار نہیں بنایا۔'' (آل عمران : ۱۹۱)

دوسرا معنی یہ ہے کہ جن آیاتِ قرآنی میں کائنات کا، مع مختلف موضوعات کے، ذکر آیا ہے بعض علماء کے نزدیک ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم تو گویا سائنس کی کتاب ہے جس میں کائنات کے مفروضہ اور معینہ نظریات درج ہیں۔ اسی لیے بعض قدیم و جدید مفسرین نے قرآنِ کریم کی سائنسی شرحیں لکھیں۔ قدیم مفسرین میں امام غزالیؒ اور امام فخر رازیؒ اور جدید علماء میں علامہ طنطاوی جوہری اور عبداللہ فکری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقِ کار پر خطر اور دشوار گزار ہے، کیونکہ قرآنِ کریم فزکس یا کمسٹری یا حساب کی کتاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے رشد و ہدایت اور نظامِ حیات کی کتاب بنا کر اتارا۔ ہماری رائے میں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ ان آیات سے یہ مطلب اخذ کرے کہ یہ کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتی، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور کائنات میں غور و فکر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور کائنات میں رنگارنگی میں سوچ بچار پر ابھارتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کہا ادراک حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور علمِ یقینی اس کی رضا، مشیت اور الہام کے بغیر نہیں ملتا۔

قرآنِ کریم کی آیات کی سائنسی تفسیر درست نہیں کیونکہ سائنس کے نظریات اور قوانین بدلتے رہتے ہیں اور کبھی ایک ہی حال پر نہیں رہتے۔ آراء کا تغیر اور نظریات و قوانین کی تبدیلی

Marfat.com

سائنسی ترقی کا خاصہ ہے۔ اگر ہم کسی دور کے مقبول سائنسی نظریات کی آیاتِ قرآنی سے تفسیر کریں اور بعد میں یہ نظریات تبدیل ہو جائیں تو ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے اور لوگ ہم پر غلط بیانی کی تہمت لگانے میں حق بجانب ہوں گے۔ کوئی عقلمند اس مؤقف کی حمایت نہیں کرے گا۔

اللہ

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں اسلامی تصور مادیت پسند اور الحاد پر مبنی مذاہب سے مختلف ہے۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو ماورائے مادہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ نہ محسوسات کے سوا کسی بات پر یقین رکھتے ہیں۔ انسانیت ایسے کئی فلسفوں اور مذاہب سے آشنا ہے جو اللہ کے وجود کو ماننے پر آمادہ نہیں بعض غیر سماوی ادیان، انسانی طاقت سے بالا طاقتوں پر ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن اللہ کے ساتھ دوسرے خداؤں کو شریک بناتے ہیں۔ فارسی مذہب دو خداؤں کو مانتا ہے۔ ایک خیر کا خدا، دوسرا شر کا خدا، عیسائیت، حالانکہ بنیادی طور پر سماوی دین ہے لیکن اہلِ کلیسا نے تثلیث کا عقیدہ اپنا لیا۔ ان کے نزدیک "باپ، بیٹا اور روح القدس" تین خدا ہیں۔ اسی طرح یہودیت بھی سماوی دین ہے جو اصل میں خدائے واحد پر ایمان رکھتا ہے لیکن یہودیوں کے احبار نے خدا کو اس طرح مجسم بنا ڈالا کہ وہ انسان سے مختلف نظر نہیں آتا۔

ضروری ہے کہ ہم ان چند آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارے میں آئی ہیں، تاکہ الٰہیت کے موضوع پر تصورِ اسلامی کی حقیقت جان لیں اور اس کے بارے میں اسلامی مفہوم اور دیگر ادیان و فلسفہ کے مفہوم میں واضح امتیاز کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔" (الاخلاص: ۱: ۴)

"وہی ہے (سب سے) پہلے اور (سب سے) پیچھے، اور (وہی) ظاہر و مخفی بھی، اور وہی ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔" (الحدید: ۳)

Marfat.com

"..... اس کے سوا ہر شئے فنا ہونے والی ہے۔ حکومت اسی (ایک) کی ہے اور اسی کی طرف تم (سب) لوٹائے جاؤ گے۔" (القصص : ۸۸)

"ہر چیز کا خالق۔" (الانعام : ۱۰۲، الراعد : ۱۶، الزمر : ۶۲، مومن : ۶۲)

"اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔" (الاحزاب : ۲۷)

"اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی)، سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو، اللہ ہی کی ذات ہے۔" (البقرہ : ۱۱۵)

"اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اُسے (خوب) دیکھ رہا ہے۔" (البقرہ : ۹۶، آل عمران ۱۶۳، المائدہ : ۷۱)

"یاد رکھو، اسی کے لیے خاص ہے آفرینش (بھی) اور حکومت بھی"۔ (الاعراف : ۵۴)

"یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔" (حم السجدہ : ۵۴)

"اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں، تو میں تو قریب ہی ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس لوگوں کو چاہیئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پا جائیں۔" (البقرہ : ۱۸۶)

"کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔" (الشوریٰ : ۱۱)

"اسے نگاہیں نہیں گھیر سکتیں اور وہ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے، اور وہ بڑا باریک بین، بڑا باخبر ہے۔" (الانعام : ۱۰۳)

"کوئی اس کے حکم کو ہٹانے والا نہیں۔" (الرعد : ۴۱)

"اور اللہ ہی کے آگے جھکے رہتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔" (الرعد : ۱۵)

ہم نے اوپر جن آیات قرآنی کا حوالہ دیا ہے وہ اسلام میں عقیدۂ الوہیت کا مجمل تصور پیش کرتی ہیں اور یہی مجمل عقیدہ، عقلی اور دینی دونوں لحاظ سے، سب سے مکمل عقیدہ ہے۔ یہ آیات دو وجودوں کا ذکر کرتی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ پہلا وجود وہ ہے جو خالقِ واحد ہے جس کی ابتدا ہے نہ انتہا، جو ہر شئے پر قادر ہے، ہر بات کا جاننے والا ہے، ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کی مانند کوئی دوسرا نہیں۔ دوسرا وجود عالمِ مخلوقات ہے جسے

Marfat.com

اللہ نے پیدا کیا، جو اللہ ہی کی طرف لوٹنے والی ہے اور جس طرح مشیتِ الٰہی سے وہ عدم سے وجود میں آئی اسی طرح وجود سے عدم میں بھی جانے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ کائنات کی کوئی ایسی قوت نہیں جو مخفی ہو، جیسے کہ بعض فلسفیوں نے تعبیر کیا ہے، کیونکہ وہ تو ایک ازلی ہستی ہے جو کائنات سے الگ اور ممتاز ہے اور وہ بجائے خود "فطرت" ہے نہ کائنات، کیونکہ یہ مادی تصور "ہستی کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصور کو منہدم کر دیتا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ فلسفیوں کے خدا کی طرح، ایسی "علت العلل" نہیں جو ادراک و عقل سے باہر ہو اور جس کا وجود دنیا میں محض فرضی ہو کیونکہ ایسا تصور تفسیر و تعلیل کا محتاج ہے[۵] اللہ تعالیٰ نے ایسا ازلی و ابدی وجود باکمال محض بھی نہیں، جسے تخلیقِ عالم یا کسی بات کے ارادے کی پروا نہیں، جیسا کہ ارسطو نے گمان کیا تھا، اس لیے کہ یہ بات کمال کے عقلی تصور کے ابتدائی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

استاذ عباس محمود عقاد نے اپنی کتاب "حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ"[۶] اور اپنی کتاب "اللہ"[۷] میں ان مخالف تصورات کو پیش کیا ہے جنہیں ہم فوری موازنہ کے لیے درج کرتے ہیں:

"مذہبِ ارسطو میں اللہ ایک ازلی و ابدی وجود ہے، کمالِ محض ہے جس کی ابتدا ہے نہ انتہا، کوئی عمل ہے نہ ارادہ، اس لیے کہ عمل کا مطلب کسی چیز کی خواہش کرنا ہے اور اللہ ہر خواہش سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح ارادہ دو باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ہے اور اللہ کے پاس اصلح اور افضل سے بڑھ کر کمال موجود ہے اس لیے اسے صالح اور غیر صالح یا بہتر اور کمتر میں انتخاب کی ضرورت نہیں۔ ارسطو کی رائے میں خدا کو یہ بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ زمانے کسی کام کو شروع کرے کیونکہ وہ ابدی اور سرمدی ہے اور اس پر کوئی ایسی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی کہ آمادۂ عمل کرے۔ اس کی ذاتِ مطلق کے لیے، جس کا اول ہے نہ آخر، جدید ہے نہ قدیم، کوئی نئی چیز داخل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بقا کی نعمت حاصل ہے جس سے بڑی کوئی آرزو نہیں نہ اس سے بالاتر کوئی نعمت ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں جو اس

١٠٨٣٦٥

Marfat.com

نعمت کے دائرے سے باہر رہ گئی، ہو جس کی خدا کو پروا ہو، چنانچہ خدا اسے کامل کو، جس کا کمال ہر لحاظ سے آزرد بے نیاز ہے تخلیق عالم سے یا اس مادۂ اولی یعنی ہیولی کو پیدا کرنے سے کوئی سروکار نہیں، لیکن چونکہ ہیولی میں وجود قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی اس لیے وجود میں آنے کا شوق اسے عدم سے وجود میں لے آیا ہے اور یہ وجود اس پر خدا کا فیضان ہے۔ یہ "شوق نمو" جس نے اُسے وجود بخشتا ہے، اُسے نقص سے اس کمال کے حصول پر اکساتا ہے جو اس کی حدود کے لیے ممکن الحصول ہے اسی لیے ہیولی مائل بہ حرکت و عمل رہتا ہے کیونکہ اس میں شوق و صلاحیت موجود ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہیولی خدا کی تخلیق ہے۔ ہاں مگر یہ کہ اس اعتبار سے اُسے خدا کی تخلیق مان لیا جائے......

"جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ اہلِ فارس دو خداؤں کو مانتے تھے۔ ان کے ہاں نیکی کا خدا اور تھا جس کا کام دنیا میں نیکی اور روشنی پھیلانے تک محدود تھا، اور بدی کا خدا الگ تھا جس کی قدرت میں بدی اور تاریکی تھی۔ ان کے خیال میں تخلیق کائنات سے پیشتر، روشنی اور تاریکی کی الگ الگ مملکتیں تھیں۔ "ہرمز" نے خیر و رحمت کے عناصر پیدا کرنے شروع کیے۔ "اہرمن" اپنی زیر زمین قیام گاہ میں محوِ خواب رہا۔ ایک دن جو اس نے اپنے بھائی (ہرمز) کی خبر معلوم کرنے کے لیے نظر اٹھائی تو اُسے بھائی کی مملکت کی طرف سے چمک نے خیرہ کر دیا۔ وہ اپنے انجام سے ڈرا اور سمجھ گیا کہ نور ہر طرف پھیل جائے گا اور اس کا سیلاب آ جائے گا اور اس کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں رہے گی نہ اسے امن ملے گا تو وہ گھبرا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ تاریکی کی تمام مخلوقات، یعنی بدی اور فساد کے شیاطین بھی، پریشان ہو کر باہر نکل آئے چنانچہ "ہرمز" کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور کائنات خباثت اور مصائب سے بھر گئی......"

یونان کے فلسفیوں میں سے جنہیں "الٰہیین" کہا جاتا ہے، افلوطین تیسری صدی مسیحی) کا متعدد فلاسفۂ اسلام پر خصوصاً "اشراقیین"[1] پر خاصا اثر ہے۔ وہ اپنے مزعومہ خدا کے

احد کے بیان میں مبالغے سے کام لینا ہے اور گمان کرنا ہے کہ اس خدا کی حدِ کمال یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے بارے میں نہ سوچے بلکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں بھی شعور نہیں رکھتا کیونکہ وہ اس شعور سے منزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب میں اس خدائے احد کے، جو ہر چیز سے "خالی" ہے اور مخلوقات علویہ اور مخلوقات سفلیہ (خصوصاً ایسی مخلوق کے جو روح و جسم کا مرکب ہے) درمیان میں رابطے کے لیے، کئی واسطوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس وجہ سے افلوطین کو کہنا پڑا کہ اس "ایک" عقل کو پیدا کیا، عقل نے روح کو پیدا کیا اور روح نے بالترتیب دوسری پست موجودات پیدا کیں جو آنے والے مختلف ادوار میں درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے، عالم ہیولی و فساد تک پہنچیں۔ گویا افلوطین کے نزدیک، اس خدا کا کام صرف عقل کی تخلیق تک محدود ہے، اور اس کے بعد اس کا دردِ سر ختم ہو جاتا ہے!

جہاں تک بنی اسرائیل کے تحریف شدہ تصورات کا تعلق ہے، تو وہ خدا کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو کسی صاحبِ دبدبہ و جبروت انسان کی تصویر سے مختلف نہیں۔ ایسا انسان جو مشتعل ہوتا ہے، دوسروں سے حسد کرتا ہے، کینہ پرور ہے، اپنی ذات یا قبیلے کے لیے جوش میں آجاتا ہے، انتقام پسند ہے اور شکست و ریخت کا دلدادہ ہے! یہودیوں کے پاس جو توریت ہے، یہاں ہم اس میں سے تین تصویریں پیش کرتے ہیں جو ہماری بات واضح کرتی ہیں:

پہلی تصویر (کتاب تکوین سے):

"رب اللہ نے کہا: یہ انسان، جو ہمارے جیسا ایک ہوتا جا رہا ہے اور خیر و شر جاننے لگا ہے تنا بد اب بڑھ کر شجر حیات سے بھی کچھ پا لے جسے کھا کر تا ابد زندہ رہے گا..... پھر رب اللہ نے اسے جنتِ عدن سے نکال کر واپس دنیا میں بھیج دیا کہ جائے اور وہیں کام کرے"......

دوسری تصویر (کتاب تکوین ہی سے)

"جب روئے زمین پر آدمی بڑھنے لگے اور ان کے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں اور جن کو انہوں نے چنا، ان سے بیاہ کر لیا۔ تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے...... اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی

Marfat.com

بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا بُرے ہی ہوتے ہیں
تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا اور خداوند
نے کہا کہ میں انسان کو، جسے میں نے پیدا کیا، روئے زمین سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان
سے لے کر حیوان اور رینگنے والے جاندار اور ہوا کے پرندوں تک، کیوں کہ میں ان
کے بنانے سے ملول ہوں"......

تیسری تصویر (کتاب سموئیل ثانی، باب ۲۴ سے):

"سو خداوند نے اسرائیل پر وبا بھیجی جو اسے صبح سے لے کر وقتِ معینہ تک رہی،
اور دان سے بیرسبع تک لوگوں میں سے ستر ہزار آدمی مر گئے اور جب فرشتے
نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ یروشلم کو بھی ہلاک کرے تو خداوند اس وبا سے ملول ہوا اور
اس فرشتے سے جو لوگوں کو ہلاک کر رہا تھا، کہا: بس اتنا کافی ہے۔ اب تھم جاؤ!"

حضرت عیسیٰؑ کی فطرت، ان کے ارادے اور ان میں الوہیت کا عنصر ہونے کے بارے میں کلیسا کے تصورات بھی یہودیت سے بہتر نہ تھے، چنانچہ متعدد عوامل کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی اور شرک داخل ہو گئے، مثلاً رومی سلطنت میں عیسائیت سرکاری مذہب قرار پانے کے بعد منافقین کا ایک گروہ امورِ حکومت پر مسلط ہو گیا، جنہوں نے روم کے بُت پرستانہ عقائد اور روایات کو عیسائیت میں منتقل کر دیا۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مفکرِ اسلام نے کہا:

"روم عیسائی نہیں ہوا بلکہ عیسائیت رومی بن گئی اور روم کے اخلاق و روایات، اور یونانی فلسفیوں کے نظریات و عقائد میں سے تثلیث کا عقیدہ لے لیا: قاضی عبدالجبار الھمدانی نے اس پر اضافہ کیا کہ": عیسائیت میں تثلیث کا عقیدہ رومی فلسفیوں نے داخل کیا جو یہ سمجھتے تھے کہ عقل، عاقل اور معقول ایک ہو جاتے ہیں گویا ایک میں تین اور تین میں ایک!"[۱]

الوہیت کے تصور پر ان میں فرقے بن گئے: ایک فرقہ کہتا ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین مختلف صورتیں ہیں، جن کے ذریعے خدا نے خود کو لوگوں پر ظاہر کیا۔ ان کے خیال میں خدا تین "اقانیم" (شخصیتوں) کا مرکب ہے۔ یعنی باپ، بیٹا (مسیحؑ) اور روح القدس؛ چنانچہ اللہ جو باپ

Marfat.com

ہے، اپنے مقام سے اتر کر، روح القدس کی صورت بنا، پھر مریم ؑ کی شکل میں انسانی جسم اختیار کیا اور اُن سے یسوع کی صورت میں پیدا ہوا...... وغیرہ وغیرہ

یہ سب فاسد تصورات اس شرک، بت پرستی، دیومالائی داستانوں اور دیگر خرافات کے علاوہ ہیں جن کے تلے عیسائیت پہلے ہی دبی ہوئی تھی، یعنی بتوں کی پوجا سے ستارہ پرستی سے ملائکہ کی عبادت تک۔ وغیرہ۔

ان سب کے برعکس، الوہیت کا اسلامی تصور یکتا اور جمنا تہ ہے کہ اللہ ایک کامل اور مطلق وجود ہے جو جسم ہے نہ ایسا جو ہر جس کی حدود جانی جاسکیں یا جسے ناپا تولہ جاسکے اور نہ کسی چیز سے مماثل ہے۔ وہ زمان و مکان میں محدود نہیں، نہ وہ کسی چیز میں حلول کرتا ہے، نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے، اور جو کچھ کائنات میں ہے اس سے بے نیاز ہے۔

وہ ذات جو ابدی، کامل اور محض کمال ہے، صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور اس باعث یہ تصور ان تمام تصورات سے مختلف ہے جو شرک اور بت پرستی پر قائم ہیں۔ یہ کمال محض قدرت اور فیضان کے بغیر ممکن نہیں اور قدرت اور فیضان تخلیق و ایجاد کے بغیر ممکن نہیں تھے اس طرح انسان کا معاملہ ایسے خدائے حیّ و خالق، صاحبِ ارادہ محافظ و نگران، اور قادرِ مطلق سے ہے جو "اپنے ارادے کو عملاً بروئے کار لانے والا اور مکمل صلاحیت فعل و اختیار کا مالک ہے۔ تمام امور کا مرجع اسی کی ذاتِ واحد ہے اور اس کائنات کی تخلیق ابتداً بھی اس کے ارادے سے ہوئی اور جو کچھ یہاں بعد میں پیدا ہوتا ہے وہ بھی اسی کے ارادے کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس کائنات میں ہونے والی ہر حرکت اور ہر تغیر و تبدّل، الغرض جو کچھ بھی یہاں وقوع پذیر ہوتا ہے اسی کے ارادہ و تدبیر سے اور اسی کے علم و تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ذاتِ پاک اپنے ارادے، علم و تدبیر کا براہِ راست رابطہ اپنے ہر بندے کے ساتھ قائم رکھتی ہے اور اس کے تمام حالات میں اس کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ اس کائنات کے ہر ذی حیات اور ہر چیز کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔"[11]

اگر یہ تصور انسان کے وجدان میں راسخ ہو جائے تو اس سے یقیناً اس کی شخصیت بلکہ پوری زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور اس کی زندگی باقاعدہ اور منظم ہو جائے گی جس میں لاتعداد الٰہ پر اعتقاد کے سبب، کوئی خلفشار نہیں ہوگی، اور یہ زندگی مطمئن اور پُرسکون بھی ہوگی، کیونکہ یہ خدائے حکیم و خبیر کے حضور اطاعت گزار ہوگی جو جانتا ہے کہ بندے کے لیے اچھا ہے اور کیا بُرا۔

Marfat.com

ایسی زندگی کی بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے دانا و بینا رب کا ارادہ پالے، خواہ اپنی عقل سے یا خداوندی پیغامات کے ذریعے جو انسان پر بتدریج رب کائنات کی عنایت و حکمت کے مطابق نازل ہوتے رہتے ہیں۔

کسی مخلوق یا کسی گروہ کا انسانوں پر ان کے عقائد میں کوئی تسلط نہیں نہ ان میں صفاتِ خداوندی میں سے کوئی صفت پائی جاتی ہے اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ" حتیٰ کہ خود رسول بھی خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے اور اس پر داروغہ یا حاکم نہیں۔ اس لحاظ سے اللہ کے بارے میں اسلامی عقیدہ وحدانیت کا مکمل ترین مفہوم اور اس کی سادہ ترین شکل پیش کرنے میں خاص انتہائی پسندانہ ہے اور اسلام خداؤں کی کثرت کی کسی بھی نوع یا تعدد خدا کے بارے میں کسی رمز و کنایہ تک کو ناپسند کرتا ہے[12]

اسلام کے قائم کردہ مثالیے

اسلام نے تمام ادیان اور خداوندی رسالت کو ختم کر دیئے، اس لیے مثالیوں، اشیاء اور اخلاقیات کی اقدار کو بدلنے میں اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس طرح بعض اشیا کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور بعض کی گھٹ گئی، چنانچہ زندگی کے اصول و ضوابط وہ نہ رہے جو کل تک تھے گویا اسلام فطری طور پر اُن بلند اقدار اور بلند شاہیوں میں شامل ہو گیا جن کی انسان نے ہمیشہ آرزو کی ہے۔ ان اقدار کا مقصد انسان کی خیر و سعادت کو حقیقت بنانا اور ایک مثالی اور پائیدار زندگی کی ضمانت دینا ہے جو انسان کی شان بڑھائیں۔ اس کی عزت و توقیر میں اضافہ کریں اور اُسے ہمیشہ یہ یاد دلاتی رہیں کہ وہ اس زمین میں خدا کا خلیفہ اور اشرف المخلوقات ہے۔

مثالیوں اور اقدار کے مفہوم پر کسی فلسفیانہ بحث میں پڑے بغیر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان عقلی، دینی اور ثقافتی افکار و نظریات اور مقاصد و احکام کا مجموعہ ہیں جن پر کسی فرد کو یقین و اعتماد ہو، خواہ ان اقدار کا منبع کچھ بھی ہو۔ ان کا منبع دین بھی ہو سکتا ہے اور قوانین یا انسانی اور اخلاقی تجربات بھی ہو سکتے ہیں۔ انسانی معاشروں میں یہ اقدار ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک فرد یا چند افراد، دوسرے معاشروں سے الگ اقدار رکھتے ہوں۔ ان دلائل کے بعد اسلام کی

Marfat.com

پیش کردہ اقدار ہیں۔ انسان پسند فلسفیوں کے لیے بہت بڑے محرکات موجود ہیں۔ انسانی تہذیبوں پر تحقیق کرنے والوں نے فلسفہ یا نظریۂ اقدار کے عنوان کے تحت ان حاصل شدہ اقدار پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

اگر اقدار کو ان کی رخصت اور انسانیت کی عام فلاح کے حصول کے پیمانے سے ناپا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام، انسان کو انسان بنانے کے لیے سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ ترقی پسندانہ اقدار پیش کرتا ہے۔ اسلامی اقدار کے کئی پہلو ہیں۔ اُن اقدار میں، جو فرد سے متعلق ہیں، اسلام کی کوشش یہ ہے کہ انسان کو اس کی زندگی سے بلند تر مرتبہ عطا کرے۔ جس میں اس کی زندگی رہن ہے اور اس حیوانی سطح سے جو صرف کھانے، پینے اور جنسی زندگی تک محدود ہے، اوپر لے جا کر ایسا منصب عطا کرے جو انسانی شرافت کے لائق ہو، بلکہ اس میں اضافہ کرے۔ وہ امور جو معاشرے سے متعلق ہیں۔ ان میں اسلام افراد میں رابطے کے سب سے بڑے عامل (یعنی اخوت) کو حقیقت بناتا ہے اور پھر اس معاشرے کو تہذیب و تمدن کے بلند ترین مرتبے پر پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ، وہ افراد اور معاشرے کے دوسرے اداروں کے درمیان عمدہ اور شریفانہ بنیادوں پر رابطے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔

ایمان

ایمان کے دو معنی ہیں۔ ایک عام، دوسرا خاص۔ عام معنی میں اس میں ہر وہ عقیدہ داخل ہے جسے انسان مانتا ہے، چاہے اس عقیدے کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو۔ اس لیے اپنے افکار و عقائد پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کو ہم "مومن" کہہ سکتے ہیں، اور "انسان" کا مفہوم صرف کسی فکر یا عقیدے یا دین پر ایمان ہی سے مکمل ہوتا ہے۔ خاص معنی میں ایمان کا مطلب وہ مثالیہ ہے جس پر اسلام قائم ہے اور جس پر ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد ہے۔

اس خاص معنی میں ایمان کا شروع ہی میں، اور مفصل، تذکرہ ضروری ہے، کیونکہ یہ تمام اقدار کا مشترک عنصر ہے، بالخصوص جب ہم اس میں ان موضوعات کا اضافہ کر دیں جو اسلام کا خاصہ ہیں، یعنی سچائی، عدل و انصاف، مساوات اور تکریم انسانی، ورنہ تمام اقدار محض نعرے بازی ہے جن کا انسان کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس پر مستزاد وہ ارکان جن کو اسلام

Marfat.com

ضروری قرار دیتا ہے اور جن کے بغیر مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا اور یہ ارکان ہیں : اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قضا و قدر پر اور بعث و حیات پر ایمان۔ ان میں سب سے برتر اور بنیادی بات، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ تو بات یہیں سے شروع ہو جانا چاہیئے کہ ایمان بالکتب کا سرچشمہ، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان ہے، اور اسی طرح قضا، قدر اور بعث بعد الموت پر ایمان اسی سے وابستہ ہے۔ جب انسان خدائے واحد و خالق و مدبر پر ایمان لے آئے تو اسے باقی باتوں پر اسی ترتیب سے ایمان لانا ہوگا۔ یعنی ایمان بالکتب، پھر قضا و قدر پر ایمان، پھر حشر و نشر اور جزا پر ایمان۔

ایمان باللہ

اسلامی تصور میں الوہیت کے مقام کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس پر اتنا اضافہ اور کریں گے کہ اللہ پر ایمان، انسان کی بنیادی ضرورت بن جاتا ہے۔ خواہ وہ عقلی لحاظ سے، یا فطری طور پر جذباتی انداز میں اس پر غور کرے، کیونکہ جب بھی انسان کسی معاشرے میں فطری حالت میں پایا گیا۔ یہ سوال اس کے سامنے ضرور رہا کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں جائے گا، کب جائے گا، کس طرح وجود میں آیا؟ یہ سوالات انسان کے ذہن میں ایمان کے موضوع کو ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں، پھر مظاہر فطرت۔ عام ہوں یا شاذ۔ قوانین جاریہ، اور ایسے حوادث جو کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ انسان کو کائنات کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا احساس دلاتے ہیں، چنانچہ وہ اللہ پر ایمان کی پناہ ڈھونڈتا ہے اور زندگی میں اس سے توانائی پاتا ہے۔ انسانی عادت اس احساس کو دبا دیتی ہے لیکن کبھی کبھی جب انسان کو فکر و تامل کا ذرا سا بھی وقفہ ملتا ہے تو پھر وہ تیزی سے سیدھے راستے پر چل پڑتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے ___ تو اُسے اپنا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے اور وہ اللہ سے تعلق قائم کر لیتا ہے اور اس کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ کی طرف سے مکمل اور مسلسل نعمتیں ملتی ہیں تو وہ اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

مومن بننے کے لیے انسان کے لیے اوّل شرط یہ ہے کہ وہ دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھے، کیونکہ اگر اُسے خدا کے وجود کا یقین نہ ہو تو اس پر ایمان کیسے لائے۔ اس کی اطاعت کس طرح کرے گا اور اس کے قانون کی پیروی کیسے کرے گا۔ اللہ پر ایمان لانے کے راستے جدا جدا

Marfat.com

ہیں۔ کچھ لوگ عقل و فکر سے وہاں تک پہنچتے ہیں، کچھ جذبات و واردات کے ذریعے، بعض آباؤ اجداد سے ورثے میں پاتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو شعور و جذبات دونوں سے اس تک پہنچتے ہیں۔ عقلِ انسانی اپنے خالق تک پہنچنے میں بھٹک جاتی ہے۔ اور بے عقلی یا نادانی بن جاتی ہے۔ چنانچہ پتھروں یا حیوانات یا انسان کو خدا ماننے لگتی ہے اور ان کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہے۔ پھر آسمان سے رسالت آتی ہے۔ تاکہ خدا کے رسولوں اور انبیاء کے ذریعے انسان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جائے۔[31]

اللہ کی معرفت کے جن راستوں پر انسان چلتا رہا ہے۔ اُن پر بحث کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ معرفت یا تو خدا کی حقیقت اور فطرت پر غور کرنے یا اس کی نشانیوں اور مخلوقات پر توجہ مرتکز کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی معرفت تو ناممکن ہے کیونکہ اشیاء کی حقیقت جاننے کے انسانی وسائل اس قابل نہیں کہ خدا کی حقیقت اور ذات کا ادراک کر سکیں۔ حقائق و موجودات کا عرفان، انسان کو اپنے حواس و عقل یا مشق و تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک ناقص اور تغیر پذیر ہے۔ اگر اس طرح ہمارے حواس معرفت الٰہی پر قادر نہ ہو سکیں تو اس سے خدا کے وجود کا انکار لازمی نہیں آتا۔ کیونکہ ہم کئی "دنیاؤں" مثلاً عالمِ جراثیم اور عالم افلاک وغیرہ سے ناواقف ہیں، لیکن ہماری لاعلمی ان کے ہونے کو مانع نہیں۔ نہ ان بے شمار نتائج کو روک سکتی ہے جو ان کے ہونے سے حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ کسی چیز کا وجود اس کے ادراک سے مختلف ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر ہم ذرا دھیان سے غور کریں۔ تو ہمیں اس کا عرفان اور اس پر ایمان لانا مشکل نہ ہوگا۔ اللہ کی فطرت کی معرفت بھی ناممکن ہے، لیکن اللہ کے کاموں کے ذریعے اس کا عرفان معقول بات ہے۔ ہمارے حواس اللہ تعالیٰ کی کُنہ اور ماہیت جاننے سے قاصر ہیں، لیکن ہمارے حواس دنیا کی ہر چیز سے آگاہ ہیں؟ وہ تو اس دنیا کی بہت کم چیزوں سے واقف ہیں۔

آسمانی مذاہب میں دوسروں سے اپنی بات تسلیم کروانے کے طریقے خواہ کتنے ہی مختلف ہوں ان کا اظہار زیادہ تر وجدان اور جذبات کو اپیل پر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ادراک اور غور و فکر کی قوتوں میں بھی تحریک پیدا کرتے ہیں، کیونکہ خدائے خالق کی حقیقت افکار کی حدود سے باہر ہے، کیونکہ عقل کتنی ہی قوی اور نیز کیوں نہ ہو حواس میں سے ایک حس ہی ہے جو ہمیں

Marfat.com

ہماری محدود دنیا سے وابستہ رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے عقل کے لیے اپنی حد سے بڑھنا، یا معطل رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

ایمان کو اجاگر کرنے کے لیے اسلام فطرت پہ بھروسہ کرتا ہے، اور فطرت صرف عقل ہے نہ محض جذبات، بلکہ دونوں کا امتزاج ہے۔ جب دونوں ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر چڑھائی نہیں کرتے فطرتِ سلیمہ اللہ ہی کی طلب گار ہوتی ہے، اور نزدیک ترین راستے سے اس تک رسائی حاصل کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے لوگو ایک بڑی بات بیان کی جاتی ہے سو اسے سنو۔ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ وہ ایک مکھی (تک تو) پیدا نہیں کر سکتے چاہے سبھی اس غرض کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان کے سامنے سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ اس سے چھڑا تک نہیں سکتے۔ کیا ہی کمزور ہے طالب (بھی) اور (ایسا) مطلوب (بھی)!" (الحج: ۷۳)

بے شک فطرتِ سلیمہ اس آیت کے سامنے ـــــ اور ایسی سینکڑوں آیات کے سامنے ـــــ جن کی طرف قرآنِ کریم نفسِ انسانی کو متوجہ کرتا ہے ـــــ دنگ رہ جاتی ہے۔

ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات سے واقف ہو، کیونکہ اگر وہ یہی نہیں جانتا کہ اللہ ایک ہے، جس کا خدائی میں کوئی شریک نہیں (جیسا کہ مودودی فرماتے ہیں[۵]) تو اُسے غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے یا دستِ دعا دراز کرنے سے کیسے باز رکھا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ سننے جاننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے تو اُسے خدا کی نافرمانی اور حکم عدولی سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اس کے صراطِ مستقیم پہ چلنے کے لیے جن اخلاق و اعمال کا اپنانا ضروری ہے۔ ان سے مزین ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُسے صفاتِ الٰہی کا پورا علم نہ ہو اور ان کا پوری طرح احاطہ نہ کرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ صفات جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا ہے انسان کے سامنے روشنی کے مینار ہیں جن سے وہ اپنے افکار طرزِ عمل میں روشنی پاتا ہے۔ کرم، حلم، احسان، شفقت اور رحمت سب ایسی صفات ہیں جو اللہ نے خود بیان کی ہیں۔ وہ معاشرہ کتنا بلند اور اعلیٰ ہوگا جو ان صفات سے مزین ہوگا۔

Marfat.com

ایمان کے ثمرات

ایمان باللہ اور توحید سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ فرد اور معاشرے دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم اور بے شمار ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کی غلامی اور اس کے سوا کسی کے سامنے عاجزی سے انسان کی رہائی۔ اسی باعث قرآن تمام انسانوں کو اس ایمان کی طرف بلاتا ہے:

"آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب ایسے کلمے کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔" (آل عمران: ۶۴)

قرآن غیر اللہ کے سامنے عجز و نیاز سے اتنی مکمل آزادی کا حامی ہے کہ وہ کسی بھی شخص میں تقدس اور عظمت کا شائبہ تک نہیں چاہتا۔ خواہ وہ رسول اور نبی ہی کیوں نہ ہو۔

"اور محمدؐ صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے (کئی) رسول گزر چکے ہیں۔" (آل عمران:۱۴۴)

قرآن نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپؐ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں (خدا) خواہ ان کی توبہ قبول کرے، خواہ انہیں عذاب دے"...... (آل عمران: ۱۲۸)

حکومت سب کی سب اس کی ہے حکم تمام کا تمام اسی کا ہے۔

غیر کے غلبے اور اس کے خوف سے نفس کی آزادی، کیونکہ لوگ جن سے ڈرتے ہیں وہ ان کے نفع و نقصان کے مالک نہیں:

"اور اللہ کے علاوہ کسی (اور) کو نہ پکارو جو تمہیں نفع پہنچا سکے نہ نقصان۔ پھر اگر تو نے (ایسا) کیا تو یقیناً ظالموں میں سے ہو جائے گا اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچا دے تو کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں (بجز (خود) اسی کے اور اگر وہ تجھے کوئی راحت پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے فضل کا ہٹانے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کر دے۔ وہ بڑا مغفرت والا، بڑا رحم والا ہے۔" (یونس: ۱۰۶۔۱۰۷)

"...... اور خود اپنے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں، نہ کسی نفع کا، اور

Marfat.com

نہ (کسی کی) موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (کسی کی) زندگی کا اور نہ (کسی کی) دوبارہ اٹھائے جانے کا۔" (الفرقان: ۳)

نفس جب غیر کے خوف سے آزاد ہو جائے تو وہ غیر اللہ کے سامنے ذلت، بندگی اور عاجزی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انسان غیر کے سامنے اس لیے ذلیل ہوتا ہے کہ اسے اپنی زندگی یا رزق کا ڈر ہوتا ہے، یا پھر جلبِ منفعت اور دفعِ شر کے لیے ذلیل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ نفع و نقصان اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس طرح موت وحیات اور رزق اسی کے حکم کے تابع ہیں:

"تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں تمہاری موت آئے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں ہو۔" (النساء: ۷۸)

"اور کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک میعادِ مقرر پر حکم خدا کے بغیر مر جائے۔" (آل عمران: ۱۴۵)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم گھروں میں ہوتے (جب بھی) وہ لوگ تو جن کے لیے قتل مقدر ہو چکا تھا، اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل ہی پڑتے....." (آل عمران: ۱۵۴)

چونکہ رزق بھی، موت وحیات کی طرح، اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اس معاملے میں بھی انسان کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے:

"اللہ روزی کھول دیتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔" (العنکبوت: ۶۲)

"اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی انہیں روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی......" (العنکبوت: ۶۰)

"اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمے اس کا رزق نہ ہو۔" (ہود: ۶)

اللہ پر جاندار ایمان، نفس میں اطمینان، سکون اور اعتماد بھر دیتا ہے۔ انسان کی روحانی اور ذہنی قوت میں اضافہ کرتا ہے اور یاس و قنوطیت سے بچاتا ہے اس لیے مومن ہمیشہ رجائیت پسند ہوتا ہے، جس کا اپنے اوپر اور اللہ کی مدد پر اعتماد ہوتا ہے۔

"جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں ہاں

Marfat.com

اللہ ہی ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔" (الرعد : ۲۸)

"وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں اطمینان نازل کیا تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ ایمان بڑھے۔" (الفتح : ۴)

"اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔ اُن کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔ جو کفر کرتے ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں (جو) انہیں نور سے نکال کر ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں۔" (البقرہ : ۲۵۷)

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، انہیں ان کا رب ان کے ایمان (کی وجہ) سے ہدایت دے گا۔" (یونس : ۹)

جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے مایوسی کسی حال میں بھی اس کے دل میں سرایت نہیں کرتی۔ جب اس پر زندگی گراں ہو جائے اور جملہ مادی وسائل منقطع ہو جائیں تو بھی اللہ کی آنکھ اس سے غافل نہیں ہوتی اور اُسے اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتی۔ چنانچہ وہ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے اور ہر حالت میں اس کی مدد کا طلب گار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں خودکشی کے واقعات کم ہیں جبکہ ملحدین اور کافروں میں کثرت سے ہیں۔

ایمان، انسان کو قانونِ خداوندی کا پابند بھی بنا دیتا ہے اور وہ اس کی حفاظت بھی کرتا ہے ایمان، انسان کو دل بیدار عطا کرتا ہے جو اپنے تمام قول و فعل اور افکار میں اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ اپنی آنکھوں کی بے راہروی اور دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

رسالت پر ایمان، اللہ تعالیٰ اور انسانی معاشرے کے درمیان انبیاء کے ذریعے سے تعلق پر ایمان ہے اور یہ اسلامی نظریے کی خصوصیت اور طرۂ امتیاز ہے۔ درحقیقت نبی وہ انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص پیغام اپنے بندوں تک پہنچانے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے مذاہب ہیں جو اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن نبوت سے منکر ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ انہیں اس واسطے اور حاملینِ رسالت کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے خیال میں انبیاء جو کچھ لاتے وہ یا تو عقل کے مطابق ہے، اس لیے عقل کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں یا عقل کے خلاف ہے، تو بھی اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم عقل ہی کے ذریعے سب باتوں کی حقیقت

Marfat.com

پر استدلال کرتے ہیں۔

اس رائے کو ماننے والوں کو یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ یہ محال ہے کہ ہم کسی خالق مدبر کی موجودگی کو تسلیم کر لیں لیکن اس بات پر ایمان نہ لائیں کہ وہ خالق، کائنات کی تدبیر اور مخلوق کی مسلسل دیکھ بھال نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ ضروری نہیں کہ عقل انبیاء کے لائے ہوئے پیغام کی مخالف ہو۔ اس لیے عقلِ صحیح، جو منظم اور سائنسی فکر پر انحصار کرتی ہے۔ ان تمام نظریات اور قوانین کی تائید کرتی ہے جیسے آسمانی رسالت نے نازل کیا۔ اس میں اتنا اضافہ کر لیا جائے کہ عقل اور وحی دونوں کا کئی مسائل میں الگ الگ دائرہ کار رہے۔ ہم تجرباتی منطق اور ریاضی کے ذریعے حیات و کائنات کے حقائق تک تو پہنچ سکتے ہیں لیکن وحی کے بغیر ماورائے مادہ حقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کے پسندیدہ طریقوں، حساب آخرت جزا و سزا، اس کی اطاعت اور اس کی اوامر و احکام کی پابندی، اور ہر وہ چیز جس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے، انبیاء کے واسطے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

خدا اور اس کے انبیاء کے درمیان واسطہ کئی ذریعوں سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ وحی کی ابتدائی شکل رویائے صادقہ ہے اور انبیاء کے قصوں میں رویائے صحیحہ کے کئی واقعات ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے خواب کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح انہیں حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم ملا:

"جب وہ (اسمٰعیلؑ) دوڑنے کے قابل ہوا تو اس (ابراہیمؑ) نے کہا: اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ کہا: اے میرے باپ! آپ وہی کریں جس کا آپ کو حکم ملا ہے۔" (الصافات:۱۰۲)

اس کے علاوہ حالتِ بیداری میں الہام، رابطے کا دوسرا طریقہ ہے جیسا کہ رسولِ کریمؐ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپؐ مسلمانوں کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے کہ الہام ہوا۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

"یہ رب العالمین کے رسول ہیں اور میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنا رزق پورا نہ کر لے۔"

رابطے کا ایک اور ذریعہ اللہ تعالیٰ اور نبی کے درمیان آمنے سامنے گفتگو، جیسا کہ قرآن کریم میں،

Marfat.com

حضرت موسیٰ کے بارے میں آیا ہے:

"جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو انہیں آواز آئی اس میدان کے داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰؑ یہ تو میں ہوں اللہ رب العالمین......" (القصص: ۳۰)

معروف طریقہ نزولِ وحی کا حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے ہے:

"اسے روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا تا کہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں، صاف عربی زبان میں۔" (الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)

کبھی کبھی جبریلؑ جسداً بھی تشریف لائے جنہیں مسلمانوں نے دیکھا۔ جیسا ارکانِ ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کی نشانیوں کے بارے میں حدیث میں ہے جسے حضرت عمر بن الخطابؓ نے روایت کیا ہے۔

جب کوئی شخص اس بات کا مدعی ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ سے رابطہ حاصل ہے اور وہ اس کی طرف سے پیغامبری کے منصب کا حامل ہے تو اس پر چند ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں کیونکہ قدرتی طور پر لوگ اس سے اس کی بات کے سچ ہونے کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بات کو معقولیت سے خارج قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ حصولِ علم و آگہی کے لیے سوال کرنا جائز ہے:

"اور جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ ارشاد ہوا: کیا تمہیں یقین نہیں؟ عرض کیا: ضرور ہے، لیکن اس لیے کہ قلب کو (اور) اطمینان نصیب ہو جائے"..... (البقرہ: ۲۶۰)

اسی سے نبوت کی ضرورت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اسی بناء پر معجزات کو اس کا اہم وسیلہ شمار کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ہاتھوں اس لیے دکھائے کہ لوگ اس بات پر ایمان لے آئیں کہ انبیاء اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نبیوں پر ایمان ایک طرف تو ایمان باللہ سے اور دوسری طرف ایمان بالغیب سے مربوط ہے اور یہ وہ ایمان ہے جو کسی متقی مسلمان کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے:

"الم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں (جو متقیوں) کے لیے ہدایت

Marfat.com

ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں"..... (البقرہ: ۱-۳)

معجزہ دراصل ایسی نئی بات ہے جو اُن عادات اور قوانین کے خلاف ہو جنہیں لوگ عام دیکھتے ہیں جو کائنات کا روزمرہ کا چلن ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نبی کی تائید کے لیے دکھاتا ہے بعض لوگوں نے معجزات کو معمول کی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر معجزات سے "خرقِ عادت" کی صفت ہٹا دی جائے تو اس کا مفہوم اور نبی کی صداقت پر اس کا دلیل ہونا بھی مٹ جاتا ہے اگر مدعی نبوت اپنی سچائی پر دلیل لائے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے جبکہ عادتاً وہ مشرق سے نکلتا ہے تو یہ بات اس کی گواہ اور تائید ہوگی۔ اگر وہ اپنی قوم سے یہ کہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو اس میں کوئی نئی بات نہ ہوگی۔

معجزات، بالخصوص مادی معجزات پر بہت بحث ہو چکی ہے اور جو لوگ معروضیت کے حامی ہیں ان سے انکار کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے مادی اور روحانی دونوں طرح کے معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جب اسلام معجزاتِ انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ ایسے معجزات کا دین ہے جو سمجھ میں آسکتے ہیں بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے اور وہ ایسے معجزات کا دین نہیں جو عقل و غور و فکر سے روک دے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مسلمان معجزات کے امکان پر ایمان رکھتا ہے وہ کائنات کے قوانین کا منکر ہے کیونکہ معجزات ارض و سماوات، اور ان میں موجود عجائبات اور دنیاؤں کی تخلیق سے زیادہ حیران کن نہیں۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا عالم پیدا کیا ہے تو پھر ہمارے لیے کسی ایسی غیر معمولی بات کو ماننا دشوار نہیں جو قوانین و معمولات کے خلاف ہو۔ غیر معمولی باتیں ممکن ہے جن میں کوئی ناممکن بات نہیں اور جو شخص انہیں ناممکن کہے اس پر ثبوت لازم ہے کیونکہ وہ انہیں عقلاً، بلا دلیل محال کہتا ہے۔ معجزہ عقل کی ضد نہیں، لیکن عقل سے بالاتر ضرور ہے اور ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے جو خلافِ عقل ہے وہ لغو ثابت ہوتا ہے، اور جو عقل سے ماوراء ہے۔ اس کی معقولیت کی ایک حد ہے اور جہاں عقل کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ تھم جاتی ہے[۱۶]

جن مادی معجزات کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان میں، مثلاً حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے جس کے بارے قرآن نے کہا:

"وہ لوگ بولے کہ تم پر تو کسی نے سخت جادو کر دیا ہے۔ تم تو بس ہمارے ہی جیسے

Marfat.com

ایک آدمی ہو، سو کوئی نشانی پیش کرو، اگر سچے ہو۔ (صالح نے) کہا یہ ایک اونٹنی ہے، پانی پینے کے لیے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری۔ اور اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہیں ایک بڑے سخت دن کا عذاب آپکڑے گا۔" (الشعراء : ۱۵۴ - ۱۵۶)

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا کا، جو زندگی سے عاری تھا، تبدیل ہونے کا واقعہ ہے :

"(فرعون) بولا، اگر تم نے میرے سوا اور کوئی معبود اختیار کیا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا۔ (موسیٰؑ نے) کہا اور جو میں کوئی کھلی بات پیش کر دوں تو؟ (فرعون) بولا، اچھا تو وہ لاؤ اگر تم سچے ہو۔ پھر (موسیٰؑ نے) اپنی لاٹھی ڈال دی سو وہ یک بیک ایک نمایاں اژدھا بن گئی اور اپنا ہاتھ (گریبان سے) باہر نکالا تو وہ یک بیک دیکھنے والوں کے سامنے چمکدار ہو گیا۔" (الشعراء : ۲۹ - ۲۳)

اور پھر حضرت عیسیٰؑ کے معجزات ہیں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے :

"(اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندوں کی مانند صورت بنا دیتا ہوں پھر اس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو اچھا کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں۔ بے شک (ان سارے واقعات میں) تمہارے لیے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران : ۴۹)

گزشتہ امتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ ان میں سے بیشتر مادی معجزات پر ایمان نہیں لاتی تھیں اور انکار و الحاد پر مُصر رہیں۔ ہدایت تو اللہ ہی کے اختیار میں ہے، خواہ معجزہ کتنا ہی دہلا دینے والا کیوں نہ ہو کیونکہ بعض دل تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں:

"اور اگر ہم ان کے لیے کوئی دروازہ آسمان میں کھول دیں پھر یہ روزِ روشن میں اس میں چڑھ جائیں تب بھی بس یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی بلکہ ہم پر تو جادو ہی کر دیا گیا ہے۔" (الحجر : ۱۴ - ۱۵)

Marfat.com

اسی طرح مادی معجزات کتنے ہی قوی کیوں نہ ہو بعض لوگ یہی کہیں گے کہ یہ جادو ہے یا نظر کا دھوکا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے مخاطب ہو کر اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اور ہم معجزات کے بھیجنے میں بس یہی امر مانع ہوا کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں اور ہم نے (قوم) ثمود کو اونٹنی دی تھی، بصیرت کے طور پر، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا، اور ہم معجزات تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔"
(بنی اسرائیل : ۵۹)

جہاں تک عقلی اور روحانی معجزات کا تعلق ہے تو ان میں سب سے اہم قرآن کریم ہے جو خاتم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ انفرادی اور شخصی معجزہ ہے جس کا رسالت سے گہرا ربط و تعلق ہے اور رسالت کی ماہیت اور جوہر سے وابستہ ہے۔ یہ ایسا معجزہ ہے جسے عقل ہمیشہ قبول کرے گی کیونکہ اس کا مخاطب انسانی ذہن ہے اور یہ عقل کے لیے بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور محض حواس پر دستک نہیں دیتا جو مادی معجزات کی جڑ ہے۔ رسول کریمؐ کی بعثت تک انسانیت عقلی ترقی میں بہت آگے بڑھ چکی تھی جس سے عقل کے روبرو بات کرنا ممکن ہو گیا۔ عقل کا اندازِ خطاب زیادہ جامع، پائیدار، پا تمکین اور قرار پذیر ہوتا ہے اسی لیے قرآن کریم، رسولِ خدا اور اسلام کا رہتی دنیا تک کا معجزہ ہے قرآن کی معجز نمائی کی حقیقت کے بارے میں مباحثین کے تین بڑے بڑے نقطہ ہائے نظر ہیں:

ایک نقطۂ نظر وہ ہے جو یہ رائے رکھتا ہے کہ قرآن کا اعجاز، اس کے ان الفاظ کی ساخت میں ہے جو عام انداز سے ہٹ کر ہیں، اور اس نکھری ہوئی بلاغت میں ہے جس کا مثل پیدا کرنے سے عرب عاجز ہو گئے۔

دوسرا نقطۂ نظر وہ ہے جو قرآن کے اعجاز، غیب کی باتوں اور سابقہ امم کے حالات اور تاریخ و عقائد سے منسوب کرتا ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ قرآن نے مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ اسی طرح پیش آئے جس طرح بیان کیے گئے۔ مثلاً:

"الٓمّٓ۔ دب گئے ہیں روم (والے) پاس کے ملک میں، اور وہ اس دبنے کے

Marfat.com

بعد چند برس میں غالب ہوں گے۔۔۔۔۔" (الروم : ۱۔۴)

اور پھر ہوا یہ کہ فارسیوں نے رومیوں پر غلبہ پا لیا۔ قرآن نے اس واقعے کی خبر دی اور یہ بتا دیا کہ رومی چند سال بعد اپنے دشمنوں سے اس شکست کا بدلہ لیں گے اور بالفعل ایسا ہی ہوا۔ (اور اس قبیل کے کئی واقعات قرآن میں ہیں) چونکہ کسی انسان کو علم غیب حاصل نہیں تو اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے اور اس میں وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کے علاوہ، قرآن نے سابقہ امتوں کی تاریخ و مذاہب کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے چھوٹے بڑے تمام واقعات و حالات کا احاطہ کیا ہے۔ حالانکہ رسول کریم ﷺ اُمّی تھے جنہیں پرانے واقعات کا علم نہ تھا اور نہ ماضی کے حالات آپ ﷺ تک تفصیل و دقتِ نظر سے پہنچے تھے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہی ان باتوں کی خبر اپنے نبی ﷺ کو دی۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ رائے رکھتا ہے کہ قرآن کا اعجاز، ان ترقی یافتہ نظام ہائے انسانی میں ہے جن کی مثال زمانۂ حال یا ماضی میں انسانیت نے کبھی نہ دیکھی جو بنی نوع انسان کی عام خوشحالی کی ضمانت، اور اسے قابلِ رشک زندگی کی نوید دیتے ہیں۔ انسان کی رنگارنگ سرگرمیوں مثلاً سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور اخلاقی وغیرہ کے بارے میں قرآن میں مختلف نظاموں کا ذکر آیا ہے اور چونکہ ان نظاموں کی اختراع کسی بھی انسان کے تصور و اختیار سے باہر ہے اس لیے بھی قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اپنے نبی ﷺ کی رسالت کا ثبوت ہے۔

لیکن سچ ہے کہ قرآنِ کریم کا اعجاز ان سب باتوں پر مشتمل ہے؛ اس کے اچھوتے الفاظ اور بلاغت اور ندرت سے آراستہ تراکیب معجزہ ہیں، اس کی غیب کی باتیں اور سابقہ امتوں کے حالات بھی معجزہ ہیں اور اس کے بے مثال اور بلند پایہ نظام بھی معجزہ ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم اس کا اعجاز صرف ایک ہی رُخ سے متعین کریں کیونکہ قرآن مختلف زمانوں اور مقاموں کے تمام انسانوں کے لیے رسول ﷺ کا معجزہ ہے اور اس کا اعجاز ان تمام اور متعدد وجوہ پر حاوی ہے۔ جب کوئی عرب اس کی زبان کی سلاست کو معجزہ سمجھتا ہے تو رومی اس کے سابقہ امتوں کے احوال پیش کرنے کی وجہ سے ایمان لاتا ہے اور عجمی اس کے مختلف نظاموں پر یقین رکھتا ہے۔ گویا قرآن اپنے الفاظ و معانی اور پیش کردہ نظام، سب کے لحاظ سے معجزہ ہے۔

Marfat.com

وحی

معجزات کی طرح وحی بھی ان غیر معمولی مظاہر میں سے ہے جو نبوت کا حصہ ہیں۔ وحی کے لغوی معنی "تیز رفتار، خفیہ اطلاع" ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی "اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کو احکام شریعت وغیرہ کی "اطلاع" ہیں اور جہاں کہیں یہ لفظ استعمال ہوگا اس کے یہی معنی مراد ہوں گے۔ اس کے علاوہ وحی اصطلاحی معنوں میں اللہ کے عام بندوں اور دوسری مخلوقات کو خبر دینے کے معنوں میں بھی ہے۔ مثلاً:

"اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی بھیجی (القا کیا) کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے"..... (النحل: ۶۸)

اسی طرح امِ موسیٰؑ کو وحی بھیجی:

"اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی بھیجی (الہام کیا) کہ تم اسے دودھ پلاؤ۔ پھر جب ان کی طرف سے خدشہ ہو تو تم انہیں دریا میں ڈال دو اور نہ اندیشہ کرو اور نہ غم کرو۔ ہم ضرور ان کو تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے"...... (القصص: ۷)

اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے دل میں وا وحی بھیجی:

"اور جب میں نے حواریوں کو وحی بھیجی (حکم دیا) کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور آپ شاہد رہیے کہ ہم (پورے) مسلمان ہیں"۔ (المائدہ: ۱۱۱)

ملائکہ پر بھی اسی طرح وحی بھیجی گئی:

"جب آپ کا پروردگار فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو"...... (الانفال: ۱۲)

اصطلاحی معنوں میں وحی کا لفظ قرآن میں تمام انبیاء کے حوالے سے آیا ہے۔ مثلاً:

"یقیناً ہم نے آپ پر وحی بھیجی جیسی کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور اولادِ یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی بھیجی تھی۔ اور ہم داؤدؑ کو ایک صحیفہ دیا تھا اور (دوسرے) پیغمبروں پر ان کا حال ہم پیشتر آپ سے بیان کر چکے ہیں اور

Marfat.com

(ہم نے وحی بھیجی تھی) ان پیغمبروں پر بھی کہ ان کا حال آپ سے بیان نہیں کیا، اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور پیغمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کو پیغمبروں کے بعد اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑی حکمت والا" (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

انبیاء کے لیے وحی الٰہی کا مفہوم ہے: اس کائنات کے خالق کا کسی ایک انسان سے رابطہ، جسے وہ اپنی مخلوق کے لیے رسول منتخب کرتا ہے۔ اور یہ رابطہ (جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے) روحانی الہام کے ذریعے ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ اس پر وہ بات کرتا ہے یا کسی فرستادہ فرشتے کے ذریعے، جیسا کہ فرمایا:

"اور یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر ہاں یا تو وحی سے یا کسی حجاب کے پیچھے سے، یا کسی قاصد کو بھیج کر، سو وہ وحی پہنچا دے اللہ کے حکم سے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے......" (الشوریٰ: ۵۱)

وحی، ایمان بالغیب کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اور ایمان بالغیب ہی اسلام، بلکہ تمام ادیان کی اساس ہے۔ دیندار اور بے دین میں فرق اسی سے ہوتا ہے کہ کون ایمان پر غیب پہ ایمان لاتا ہے اور کون نہیں، اور یہ اس بات کا بھی اظہار ہے کہ مادیت سے ماوراء بھی کوئی طاقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"الٓمٓ۔ یہ کتاب کہ کوئی شبہ نہیں اس میں، ہدایت ہے ڈر رکھنے والوں کے لیے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپؐ پر اتارا گیا اور جو آپؐ سے پہلے اتارا گیا اور جو آخرت پر بھی پورا یقین رکھتے ہیں" (البقرہ: ۱-۴)

استاذ محمد ابو زہرۃ (مرحوم) نے کیا خوب کہا ہے کہ:

"جو غیب پر ایمان نہیں لاتا وہ منکر ہے، اور جو غیب پر ایمان رکھتا ہے، دیندار ہے۔"[۱۸]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے جسم مبارک پر سخت کرب طاری ہو جاتا اور چہرے سے اس کا اظہار ہوتا جو سرخ ہو جاتا اور اس سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ روایت ہے کہ صحابہؓ بعض اوقات آپؐ کی تکلیف دیکھ کر آپؐ کے سر مبارک کو کپڑے سے ڈھانپ

Marfat.com

دیتے تھے اور اس وقت آپ میں عجیب قسم کی قوت پیدا ہو جاتی۔ اس حالت کے بارے میں بعض مستشرقین نے ایسی باتیں کی ہیں جو اسلام کے خلاف تعصب اور ان کے کینے کا اظہار کرتی ہیں اس کے رد میں جدید علماء نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں استاذ عبداللہ دراز مرحوم کی کتاب "النبا العظیم عن القرآن" سب سے عمدہ ہے۔

یوں تو وحی قوانین فطرت کے خلاف، لیکن عقل کے لیے اس کا سمجھنا محال نہیں، اور بعض فطری مظاہر کے ذریعے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وحی کی فطرت مختلف ہے، لیکن اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ عمل تنویم کے ذریعے معمول تک بعض باتیں اور کام کی ہدایات پہنچائی جا سکتی ہیں، لیکن عمل تنویم اور وحی میں فرق ہے: عمل تنویم میں کسی شخص کے ارادے اور مرضی کا دوسرے انسان پر تسلط ہوتا ہے لیکن وحی میں خفیہ اطلاع ہوتی ہے، جس میں کوئی تسلط نہیں اور یہ وجدان سے مشابہ ہے۔ گویا ایسا عرفان ہے جس کا منبع انسانی نہیں، لیکن حقیقت میں وہ اس سے بھی مختلف ہے کیونکہ یہ کسی قابل غور مسئلے کا براہِ راست حاصل ہونے والا علم ہے یا ایسا علم ہے جس میں عقل بالفعل غوطہ زن ہوتی ہو، لیکن اس میں اعضائے انسانی کا کوئی دخل نہ ہو جیسے ہر نبی کو وحی حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک وحی لانے والے فرشتے کا تعلق ہے تو صحابہ کرامؓ نے کئی بار خود اس کا مشاہدہ فرمایا اور حضرت عمرؓ کی مشہور حدیث کے مطابق جس میں ارکانِ اسلام اور ایمان اور احسان کا ذکر ہے۔ حضورؐ کی مجلس میں حاضر ہونے والے صحابہؓ نے خود حضرت جبریلؑ کو رسول کریمؐ سے گفتگو اور سوالات فرماتے دیکھا۔

اغلب یہ ہے کہ صرف رسولؐ خدا نے تنہا ہی حضرت جبریلؑ کو نہیں دیکھا، اور اس میں عقلی لحاظ سے کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ ہم اس کا مقابلہ "رنگ اندھے" لوگوں سے کر سکتے ہیں بعض آنکھیں چند خاص رنگ نہیں دیکھ سکتیں، اسی طرح تحت الاحمر اور فوق البنفشی شعاعیں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں اور سائنسی طور پر ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ ہر آنکھ ان شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کائنات کی تمام مخلوق کے حواس، اشیاء کے ادراک میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اسے "قانونِ صلاحیت" کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حواس کے لیے ایک پست ترین درجہ

Marfat.com

ہے جس سے پیچھے مخلوقات اور موجودات کا کوئی درجہ نہیں ۔ اسی طرح حواس کا ایک بالائی درجہ ہے جس کے بعد کسی مخلوق یا موجود کے پاس مزید کوئی درجہ نہیں ۔ گویا تمام مخلوقات انہی دو درجوں کے درمیان ہی احساس رکھتی ہیں اور یہ دو درجے انسان میں جملہ تمام مخلوقات سے مختلف ہیں ۔ مثلاً کتے کے کان ایسی آوازیں سن لیتے ہیں جنہیں انسانی کان نہیں سن سکتے اور گھوڑے کی آنکھ ایسی چیزیں دیکھ لیتی ہے جو انسان کی حس باصرہ سے باہر ہیں ۔

ہم نے یہ سب کچھ ذہن انسانی کو وحی سے متعارف کرانے کے لیے بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ عقلی لحاظ سے یہ کوئی ناممکن بات نہیں ، ورنہ یہ ان غیر معمولی واقعات میں سے ہے جن پر ایمان ، اللہ تعالیٰ پر ایمان کا جزو ہے جو تمام کائنات اور عجائبات کا خالق ہے اور جسے اپنے ہی تخلیق کردہ قوانین و قواعد کے خلاف دوسرے قوانین و قواعد بنانے میں کوئی بات مانع نہیں ۔

تعدّد انبیاء

اب جبکہ ہم نبوت اور ایمان پر گفتگو کر رہے ہیں ، تو ایک اور اہم مسئلے ، یعنی تعدّدِ انبیاء کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ کیا مسلمان کے لیے سب پر ایمان لانا ضروری ہے ؟ اور پھر اس تعدد کا سبب کیا ہے ؟

اسلام جب تمام سماوی نبوتوں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے تو یہ حقیقت میں اس بات کا اعلان ہے کہ انبیاء کے پیغام کا سرچشمہ ایک ہے ان کا پیغام ہے اور انسانیت ایک ہے :

"کہہ دو کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا ، اور جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ (یعقوبؑ) پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے حکمبردار ہیں ۔"

(البقرہ : ۱۳۶)

اور پھر فرمایا :

"پیغمبر ایمان لائے اس پر جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے

Marfat.com

اور مومنین (بھی) یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر۔ ہم اس کے پیغمبروں کے درمیان باہم کوئی فرق بھی نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم نے اطاعت کی۔ ہم تیری مغفرت (طلب کرتے ہیں) اے ہمارے پروردگار اور تیری ہی طرف واپسی ہے۔" (البقرہ: ۲۸۵)

تعددِ انبیاء کے تین سبب ہو سکتے ہیں: ماحول اور حالات کا اختلاف، انسانی عقل و تجربے کا تنوع اور قوانین و تشریعات میں تدریجی ارتقاء۔

انسانی ماحول ایک سا نہیں رہا، اسی طرح انسان کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی عقل و ذہن، انسانی تجربے میں ترقی اور انسانی علم کی فراوانی کی بنا پر مسلسل ارتقاء پذیر رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان تغیرات کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ قوانین میں تدریجی ارتقاء اس لیے بھی ضروری تھا تاکہ اس کے نتائج ظاہر ہوں اور ان کا صحیح قرینے سے نفاذ کیا جائے یہ اس لیے ہوا کہ جو بات بعض لوگوں کے لیے مخصوص زمان و مکان میں مخصوص تھی وہی بات دوسروں کے لیے مختلف حالات و زمانے میں غیر مناسب ہو گئی۔ انسانی سرگرمیوں کے ہر پہلو پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ تعدد رسالت الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ ان کے درمیان تناقض ہے یہ تو خدائے دانا و بینا کا انسانی حالات کو ملحوظ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ انہیں ہمیشہ وہی دیا جو ان کی عقلوں اور سمجھ کے مطابق تھا۔ گویا سماوی نبوتیں عقلوں اور روحوں کے لیے ویسا ہی طریقہ علاج ہیں جس طرح جسم و بدن کے لیے طب ہے اور جس طرح طبیب دوا دیتے ہوئے مریض کی عمر اور حالت کو ملحوظ رکھتا ہے اور اسے ساری دوا ایک ہی گھونٹ میں پی جانے سے منع کرتا ہے کہ کہیں زہر ہی نہ بن جائے۔ بعینہ اسی طرح خدائی نبوتوں اور رسالتوں کا حال ہے جو وجدانی تبدیلیوں اور عقل و فہم کے معیار کی مقررہ حدود کو ملحوظ رکھتی ہیں۔

رسالتِ محمدیؐ کی خصوصیات

رسالت پر ایمان کے مفہوم کی عام تشریح کے بعد، اب مناسب ہے کہ ہم بات کو محمدؐ کی نبوت

Marfat.com

کی خصوصیات بیان کر کے ختم کریں۔ ان خصوصیات کا چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے وہ:

۱۔ ہمہ گیری اور ناقابلِ تغیر پذیری۔

۲۔ باقی ماندہ جملہ رسالتوں کے مقابلے میں قابلِ اعتماد ہونا۔

۳۔ جامعیت اور کمال۔

۴۔ تمام رسالتوں کا تتمہ اور تکملہ۔

جہاں تک نبی کریم ﷺ کی رسالت کی ہمہ گیری اور ناقابلِ تغیر پذیری کا تعلق ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب انسانوں کے لیے بھیجی گئی اور صرف ایک نسل، یا ایک گروہ یا ایک زمانے سے مخصوص نہ تھی:

"کہہ دیجئے کہ اے انسانو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف ...."

(الاعراف: ۱۵۸)

اس سے پہلے کی رسالتیں مخصوص امتوں کے لیے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا کہ آپ ﷺ کی رسالت، قیامت کے دن تک، تمام بنی نوع بشر کے لیے ہو جس طرح خود ہی یہ ذمہ لیا کہ قرآن کریم بھی ابد الآباد تک محفوظ رہے جو اس نبوت کی دستاویز ہے:

"اس ذکر کو تو ہمیں نے نازل کیا اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔" (الحجر: ۹)

اس کے بعد رسالتِ محمدی ﷺ ان تمام رسالتوں کے مقابلے میں، جن میں تحریف و تغیر ہو چکا ہے، زیادہ محفوظ رہی ہے اور حضور ﷺ کی سیرت تمام انسانوں اور انبیاء کی سیرت سے زیادہ صحیح حالت میں موجود ہے۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اس طرح بالتواتر نقل یا روایت کیا ہے کہ ہم کسی تردد کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ صدیاں گزرنے پر بھی اس کا ایک لفظ تک متغیر نہیں ہوا۔ اسی طرح حضور ﷺ کی سیرت، آپ ﷺ کے اقوال، عمل سب ہمارے پاس کتبِ حدیث و سیرت میں محفوظ ہیں۔ اسلام کی اشاعت کے ساتھ کچھ مخصوص علوم بھی وجود میں آئے جن میں اہم ترین صحیح سیرت اور صحیح حدیث کو پیش کرنے سے متعلق ہیں۔ اسی لیے ہمیں حضور ﷺ کی زندگی کی ایک ایک بات، چھوٹی ہو یا بڑی، معمولی ہو یا اہم، صحیح صحیح اور مکمل طور پر معلوم ہے۔ کتبِ حدیث و سیرت میں حضور ﷺ کی زندگی کے تمام واقعات۔ آپ ﷺ کا کھانا پینا، سیاسی زندگی، جہاد میں شجاعت، اخلاق اپنے اصحاب، ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور عام مسلمانوں سے سلوک۔ واضح طور پر درج ہیں۔ یہ سب

Marfat.com

کچھ اس حالت میں موجود ہے کہ ہم فخر سے بہ بجا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حیاتِ رسولؐ تمام تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ صحیح حالات زندگی پیش کرتی ہے۔

رسالتِ محمدی کی جامعیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کے تمام تقاضوں اور ضرورتوں کا احاطہ کرتی ہے جن معاملات میں لوگ نبیؐ کی زندگی کو نمونہ بنانا چاہتے ہیں، ان سب میں سیرتِ نبیؐ ان کو رہنمائی عطا کرتی ہے۔ اسلام نے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس کا علاج اور حل پیش نہ کیا ہو۔ چنانچہ، سیرتِ رسولؐ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ صفاتِ کمال، جو باقی تمام انبیاء پر تقسیم کی گئیں، نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی میں جمع کر دی گئیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ تبلیغ میں بڑے حوصلے، جفاکش اور تحمل کے مالک تھے۔ حضرت ابراہیمؑ جود و کرم کے مالک اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے تھے۔ حضرت داؤدؑ نعمتوں کا شکر ادا کرنے والوں میں سے تھے اور حضرت ذکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ترکِ دنیا کرنے والوں اور شہوات پر غلبہ پانے والوں میں سے تھے اور حضرت یونسؑ اُن لوگوں میں سے تھے جو فراخی میں شکر اور تنگ دستی میں صبر کرتے ہیں۔ حضرتِ موسیٰؑ صاحبِ شجاعت و جرأت تھے اور ہارونؑ نرم دل اور حلیم الطبع تھے، لیکن سیرتِ محمدؐ ان تمام صفاتِ کمال کا مجموعہ ہے۔ صاحبِ ہمت و شجاعت لوگ اس میں ایسا انسان پائیں گے جو حاکم بن کر ثابت قدم رہتا ہے۔ سخاوت و کرم کے مالک اس میں ایسا کرم دیکھیں گے جو بلا حساب عطا کرتا ہے، اور یہی حال باقی تمام صفات کا ہے۔[۱]

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ رسالتِ محمدیؐ جملہ تمام رسالتوں کی خاتم ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی معنی میں فرمایا ہے:

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، البتہ رسول اللہ اور خاتم النبییّن ہیں۔" (الاحزاب: ۴۰)

یعنی حضورؐ اس لیے مبعوث ہوئے کہ انبیاء کے مشن کی تکمیل اور زمین تک پہنچنے والی آسمانی نبوتوں کا اختتام فرمائیں۔ حدیث میں آیا ہے:

"میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی عمارت بنائی اور اسے خوب سنوارا، نکھارا، مگر ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ رہ گئی۔ لوگ اس کے گرد چکر لگاتے، تعجب کرتے اور کہتے: بھلا یہ اینٹ کیوں نہ

Marfat.com

لگائی ہے تو میں ہی وہ اینٹ ہوں اور خاتم النبیین"۔

انبیاء کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ یا کسی امت میں اس سے پہلے کوئی رسول آیا ہی نہ ہو، یا پھر گزشتہ رسالت میں تحریف ہو چکی ہو، یا پھر اس لیے کہ سابقہ رسالتوں کی دعوت جامع اور پیغام مکمل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و علم کے مطابق یہ مقدر فرمایا کہ حضور کے زمانے میں انسانیت بلوغ پہنچ گئی ہے اور اس کے نتیجے میں یہ ممکن ہو گیا کہ رسالت الٰہی کا خاتمہ فرما دیا جائے اور اسے آخری رسالت سے سرفراز کیا جائے۔ بہرحال، علوم میں پیش رفت اور ایجادات میں تسلسل کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت سے اب تک انسانیت عقلی طور پر بلوغ و ہدایت تک نہیں پہنچی کیونکہ یہ ترقی تو محض علم اور تجربے کی نشوونما اور اس کی پختگی اور اس میں کام آنے والے آلات کے ارتقاء کا فطری نتیجہ ہے، ورنہ عقلی و فکری اساس تو ایک ہی ہے جو تبدیل نہیں ہوتی۔

ایمان کے موضوع کو ختم کرنے سے پہلے، یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ایمان باللہ اور تمام انبیاء پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام باتوں پر ایمان لایا جائے: جزا و سزا، بعث بعد الموت اور یوم حساب کو اللہ کے سامنے حضوری، جہاں ہر انسان کو اس کے اعمال اور زیادتیوں کی تفصیل پیش کی جائے گی۔ چنانچہ ہر انسان کا محاسبہ ہوگا، برے کو اس کی برائی کا اور نیکوکار کو اس کی نیکی کا بدلہ ملے گا۔ پیغام نبوی، فرائض و احکام کا مجموعہ ہے اور چونکہ انسان مکلف ہے اس لیے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس یوم عظیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نیکوکاروں کو نعمتیں اور بدکاروں کو عذاب شدید ملے گا۔ اس اہم بات کا تقاضا ہے کہ ہم عبادت، عمل اور جواب دہی کے موضوع سے الگ باب میں بحث کریں۔

حق و صداقت

"حق" ان مثالوں میں سے ہے جن پر اسلام، مسلمانوں کے تزکیۂ نفس اور رفعت شان کے لیے زور دیتا ہے۔ اپنی مثالی شکل میں "حق" صحیح عقیدے، علم نافع، عمل صالح اور اخلاق کریم میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "حق" کا اطلاق، قرآن کریم میں اسلام پر ہوتا ہے:

"وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔" (الفتح: ۲۸)

Marfat.com

"اور آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے ہی والا تھا۔" (بنی اسرائیل : ۸۱)

"اور ہم نے اس (کلام) کو حق کے ساتھ نازل کیا اور حق کے ساتھ نازل ہو گیا اور ہم نے آپ کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔" (بنی اسرائیل : ۱۰۵)

اس معنی کے لحاظ سے اسلام تمام انبیاء کی رسالتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ کیونکہ بلا استثناء تمام انبیاء کی دعوت، دعوتِ حق تھی۔

"لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ کتبِ حق نازل کیں کہ وہ لوگوں کے درمیان اس بارے میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا، مگر انہی نے جنہیں وہ (کتاب) ملی تھی انہی کی ضد کے باعث، بعد اس کے کہ انہیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں۔ پھر اللہ نے اپنے فضل سے انہیں جو ایمان والے تھے وہ امرِ حق بتا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست بتا دیتا ہے۔" (البقرہ : ۲۱۳)[11]

حق و باطل دو متضاد چیزیں ہیں۔ کوئی عمل اور عقیدہ ان میں سے کسی ایک طرف مائل ہونے سے خالی نہیں ہو گا کیونکہ حق و باطل اکٹھے نہیں ہو سکتے۔[12] اگر اسلام ہی دینِ حق ہے تو دوسرے عقائد کی طرف دعوت دینے والے باطل ہیں۔ حق و باطل میں آویزش بھی لازمی بات ہے اور یہ آویزش انسانیت ہی جتنی قدیم ہے بلکہ اس وقت سے موجود ہے جب سے دنیا میں حق باطل کی تمیز پیدا ہوئی۔ بعض اوقات باطل کیسا ہی غالب کیوں نہ آجائے آخر میں فتح حق ہی کی ہوتی ہے اور وہی قائم رہتا ہے اور نفع بخش ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جھاگ تو مٹ جاتا ہے اور جو چیز نفع بخش ہے وہی دنیا میں باقی رہتی ہے۔ اسلام مسلمانوں کو دعوت ہے کہ وہ حق کو تھامے رہیں اور ہر کام میں اسی کو اختیار کریں اور اپنی بساط بھر اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جدوجہد کریں یہاں تک کہ کلمۂ حق بلند ہو جائے اور حق کی پاسداری تمام انسانیت کا شیوہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ حق بذاتِ خود قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ کام عالی صفت اور بلند ہمت لوگ سرانجام دیتے ہیں۔

Marfat.com

حق کی دعوت دینے والوں کی صفات : داعین الی الحق کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ وہ حق پر جمے رہیں۔ اور اسی کو تھامے رہیں، کیونکہ کسی شخص کی شرافت و کرامت کا معیار اتنا ہی ہے جتنی اس کی حق کی معرفت اور اس پر ثابت قدمی اور یہی بات اس کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث ہے۔

"بہرحال آپ اس سے تمسک کیے جایئے جو آپ پر وحی کیا گیا ہے بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں اور یہ (قرآن) آپ کے اور آپ کی قوم کے لیے بڑے شرف کی چیز ہے......" (الزخرف : ۴۳، ۴۴)

یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے لوگ جری ہوں کہ وہ بے خوف و خطر، اور بزدلی کے بغیر، اعلان حق اور اس کا کھلم کھلا اظہار کر سکیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشاعتِ حق اور لوگوں میں اس کی تبلیغ کے لیے نامزد ہیں :

"اور ضرور ہے کہ تم میں سے ایسی جماعت رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے ......" (آلِ عمران : ۱۰۴)

بے شک، حق کا علی الاعلان اظہار بہت فضیلت ہے کیونکہ باطل، حق کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہی قدم جماتا ہے۔ جب تک داعین الی الحق اس کا کھلم کھلا اعلان اور اس کی اشاعت کرتے رہیں گے اس وقت تک باطل دبکا ہوا اور مقہور رہے گا۔ کسی جماعت یا امت کی نہضت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں حق کی طرف بلانے والے نہ ہوں۔ اگر یہ گروہ مفقود ہو جائے تو یہ گویا اس امت کی قوت کے زوال کا اعلان اور اس کے ارکان کی کمزوری کی ابتدا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا :

"جب میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر جائے تو اس سے الگ ہو جاؤ۔"

داعین الی الحق کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی سے ڈریں نہ خوفزدہ ہوں، کیونکہ حق کے لیے آواز اٹھانے سے رزق کم ہوتا ہے۔ نہ موت وقت سے پہلے آتی ہے اس لیے کہ زندگی اور رزق صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے :

"(یہ وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے پیغامات پہنچایا کرتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتے تھے، اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔" (الاحزاب : ۳۹)

Marfat.com

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو فرعون تک دعوتِ حق پہنچانے کا حکم دیا اور ان پر بشری کمزوری غالب آگئی جو ظالموں اور جابروں کے سامنے ہر انسان پر غالب آسکتی ہے تو آپ نے کہا:

"...... ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا کہ زیادہ سرکشی نہ کرنے لگے۔" (طٰہٰ: ۴۵)

تو رب العزت نے جواب دیا:

"...... تم ڈرو نہیں، تم دونوں کے ساتھ میں ہوں، (سب) سنتا اور دیکھتا ہوں" (طٰہٰ: ۴۶)

اور جس کے ساتھ خدا ہو وہ کمزور ہوتا ہے نہ پشیمان کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے قوت عطا کرتا ہے اور ایسی جرأت بخشتا ہے جس کے سامنے تمام سرکش و جبار حقیر نظر آتے ہیں۔

ابراہیمؑ نے جب کسی ڈر اور گھبراہٹ کے بغیر اعلانِ حق فرمایا تو ان کا یہی موقف تھا، حالانکہ اس وقت ان کا کوئی حامی یا مددگار نہ تھا حتیٰ کہ ان کے والد بھی بت پرستوں کے ساتھ تھے۔ اس کے باوجود شیخ الانبیاءؑ نے کسی ہچکچاہٹ اور تردد کا اظہار نہ کیا اور لوگوں میں اعلان کیا کہ:

"یقیناً میں نے تو اپنا رخ یکسو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔" (الانعام: ۷۹)

جب آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا کیا تو فرمایا:

"کیا یہ جھگڑا مجھ سے اللہ کے معاملے میں کرتے ہو درآنحالیکہ وہ مجھے ہدایت کر چکا ہے میں ان سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اللہ کے شریک ٹھہرا رہے ہو، ہاں البتہ اگر میرا پروردگار ہی کوئی چیز چاہے۔ میرا پروردگار ہر چیز کو علم سے گھیرے ہوئے ہے، تو کیا تم خیال نہیں کرتے؟ اور میں اس سے کیوں ڈروں جس کو تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے۔ درآنحالیکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے بارے میں اس نے تم پر کوئی بھی دلیل نہیں اتاری سو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حقدار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے مخلوط نہیں کیا، ایسوں ہی کے لیے تو امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔" (الانعام: ۸۰-۸۲)

Marfat.com

اصحابِ رسول ؐ کے مقابل، مشرکین کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ وہ انہیں دعوت الی الحق سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں خوفزدہ کرتے تھے لیکن ہوا یہ کہ وہ حق پر اور زیادہ ثابت قدم ہو گئے اور ان کا ایمان زیادہ قوی ہو گیا؛

"یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے والوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کیا ہے، ان سے ڈرو، لیکن اس نے ان کا (جوش) ایمان اور بڑھا دیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کے انعام و فضل کے ساتھ سے واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری پیش نہ آئی اور یہ لوگ رضائے الٰہی کے تابع رہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے دوستوں کے ذریعے سے ڈراتا ہے سو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھی سے ڈرو اگر ایمان والے ہو۔" (آل عمران: ۳: ۱۷۵-۱۷۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف حالات اور تنگی و ترشی میں داعی الی الحق کی ثابت قدمی کے نتیجے ہی میں حق کی جڑیں زمین میں گہری اترتی ہیں اور دنیا میں اسے ثبوت و بقا حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ نتائج داعی الی الحق سے صبر، قوتِ برداشت اور تکالیف پر استقلال کا مطالبہ کرتے ہیں، اسی طرح وہ جان، مال، جدوجہد اور وقت کی قربانی بھی چاہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس طرف کئی آیات میں اشارہ کیا ہے:

"کیا لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوٹ جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے اور ہم تو انہیں بھی آزما چکے ہیں جو ان سے قبل گزرے ہیں۔ سو ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے تھے اور جھوٹوں کو جان کر رہے گا۔" (العنکبوت: ۲-۳)

"کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے درآنحالیکہ (ابھی) تم پر تم ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی اور انہیں ہلا ڈالا گیا یہاں تک کہ پیمبر اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی؟ سن رکھو، اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔" (البقرہ: ۲۱۴)

Marfat.com

"پہلے بھی مہلتیں دی جاچکی ہیں) حتیٰ کہ پیمبر مایوس ہو ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے غلطی ہوئی (کہ انتے ہیں) انہیں ہماری مدد آپہنچی، سو ہم نے جس کے لیے چاہا وہ بچا لیا گیا، اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹتا نہیں۔" (یوسف: ۱۱۰)

اسی حق، اس پر ثابت قدمی، اس کی طرف اور اس کے نتائج کی برداشت سے مسلمان بدر و خندق حدیبیہ اور فتح مکہ میں سربلند اور کامیاب ہوئے اور ان تمام معرکوں میں جو انہیں فارسیوں، رومیوں، صلیبیوں، تاتار اور آبادکاروں کے خلاف پیش آئے فتح مند ہوئے۔ یہ کامیابیاں صرف شجاعت، ایمان باللہ، خدا پر بھروسے، تمسک بالحق اور اس پر ثابت قدمی کی بدولت حاصل ہوئیں۔ چونکہ حق پائیدار ہے، اس لیے اسلام زمانے میں سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ زندہ و جاوید اور اس سے زیادہ بقا کا حامل ہے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسلمان بحیثیت فرد و قوم اپنے موقف میں صرف حق اور اس کی حمایت کے جذبے کی بدولت آگے بڑھے چاہے اس کے نتیجے میں انہیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑا، کیوں کہ صرف حق ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ افراد و اقوام جب بھی اپنی مصلحتوں اور خواہشوں کے جذبوں کے تحت مصروفِ عمل ہوتے ہیں تو صرف اسلام ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ وہ ایسا بلند مطمح نظر اور اصول پیش کرے جس کے مطابق تمام افعال و اعمال صادر ہوں اور وہی حق قرار پائیں۔

حرّیت

اسلامی اقدار میں سے ایک اہم قدر حریت ہے۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر انسان کو بنایا گیا اور انسان کا فطری حق ہے اور فقط انسان ہونے کی وجہ سے اس سے لطف اندوز ہونا اس کے لیے لازمی ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کا اہم تقاضا ہے اس سے انسان اور باقی تمام حیوانات میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ حیوانات اپنی جبلت وغیرہ کے تابع ہیں اور حریت کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں لیکن انسان قصد و ارادے کا مالک ہے اور اس کا ارادہ ایسی کامل اور ہوشمندانہ حریت کی فضا کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا جو معاشرے کے بنیادی اصولوں سے متعارض نہ ہو اور دوسرں کی آزادی میں دخل اندازنہ ہو۔

Marfat.com

اسلام انسانی آزادی کی ضمانت دینے آیا ہے، اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ لوگوں کی آزادیوں کو بحال کرے اور انہیں کھیل تماشا نہ بننے دے اور انہیں جبر و اکراہ سے باز رکھے خواہ وہ حریت دینی ہو یا سیاسی یا فکری۔ کیونکہ حریت ان تمام عقائد کی بنیاد ہے جنہیں اسلام نے پیش کیا اور انسانی تشخص کے اعلیٰ ترین اصولوں میں سے ہے اور ہر صحت مند انسانی معاشرے کی اساس ہے۔

دینی آزادی

دینی آزادی درج ذیل امور پر مشتمل ہے:

۱۔ کسی کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہ کرنا، یا کسی خاص عقیدے کو ماننے پر اصرار کرنا۔

۲۔ تمام مذاہب، بالخصوص اہل کتاب کو اپنے شعائر یا عبادات، اسلامی معاشرے میں، ادا کرنے کی پوری آزادی۔ اس لیے ان کا کوئی کلیسا نہیں گرایا جائے گا۔ نہ صلیب توڑی جائے گی۔

۳۔ کھانے پینے میں ان کے مذاہب نے جو اجازت دی ہے، اس کی آزادی۔

۴۔ شخصی معاملات، مثلاً شادی بیاہ، طلاق، وراثت وغیرہ میں انہیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کی آزادی۔

۵۔ ان کے حقوق کی حفاظت اور ناموس کی حمایت اور عقل و منطق اور اخلاق کی حدود کے اندر رہتے ہوئے انہیں آپس میں بحث و مباحث اور تکرار کی آزادی۔

اسلام نے جس دینی آزادی کا اعلان کیا ہے اور جس کی ضمانت لوگوں کو دی ہے۔ اس کی مثال گزشتہ یا موجودہ دور میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ تاریخ اسلام میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی شخص کو اپنا دین ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، نہ کسی شخص کو اپنے معبد میں اپنے دین کے مقررہ طریقے پر عبادت کرنے سے روکا گیا۔ مسلمانوں کے لشکر ظہور اسلام کے چند برس بعد ہی، شہروں اور آبادیوں میں داخل ہو گئے اور ان لشکریوں کے امکان میں تھا کہ وہ لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرتے، لیکن مسلمانوں نے ایسا سوچنا بھی گوارا نہ کیا کیونکہ ان کا دین، لوگوں کو اپنے مذہب اور عبادت کو برقرار رکھنے کا حکم دیتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی اسوۂ حسنہ کی بنا پر، دوسرے مذاہب، اہل ذمہ کو کبھی ایذا نہ دی گئی اور اسی سنت پر عمل کرتے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عساکر کے سرداروں کے نام خطوط میں تاکید کی کہ کسی معاہد کو اپنا مذہب ترک کرنے

Marfat.com

اور اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، اور راہبوں کو ان کی خانقاہوں میں تنگ نہ کیا جائے اور نہ اسی ہدایت کی رہنمائی میں حضرت عمر بن الخطابؓ جب عیسائیوں کے گرجا "کلیسائے قیامہ" کے سامنے کھڑے تو نماز اس کے باہر ادا کی اور اندر جا کر نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اسی ہدایت کے زیر اثر یہود و نصاریٰ عرصۂ دراز تک اسلامی حکومت کے زیر نگیں آباد رہے کہ یہاں انہیں وہ آسائش اور سکون میسر تھا جو عیسائی حکومتوں کے ہاں مفقود تھا اور وہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچے اور ان میں کاتب، حکیم، طبیب، انجینئر اور دانشور تھے۔ اس معاملے میں ان کے دین کا اختلاف، ان تمام امور میں رکاوٹ ثابت نہ ہوا[۲۲]۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ویسا طرز عمل نہیں ملتا جیسا کہ ہسپانویوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جب ہسپانویوں نے اندلس پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کو اختیار دیا کہ وہ اندلس چھوڑ دیں یا عیسائی ہو جائیں یا پھر قتل کے لیے تیار رہیں۔ اس طرح لاکھوں مسلمان قتل کر دیئے گئے اور اس پوری مملکت میں، جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی، اللہ کا نام تک لینا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے برعکس تاریخ اسلام، رواداری، انسانی ہمدردی اور محبت و حسن سلوک کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو پیش کریں جو مذہبی آزادی کے بارے میں اسلام کے مؤقف کی حمایت کرتی ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلام دین کے معاملے میں کسی جبر کا قائل نہیں، اور لوگوں کو اپنے رب کو اپنے عقیدے کے مطابق ماننے کی آزادی دیتا ہے۔ اس دین کا کیا فائدہ جس میں زبردستی شامل ہو؟ قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کی تاکید کرتی ہیں۔ مثلاً:

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے...." (البقرہ: ۲۵۶)

گویا یہ اعلان تھا کہ حق، واضح ہے، اور ہر انسان ان دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے اور اللہ کے سامنے اس کی جواب دہی، اسی آزادیٔ اختیار کے مطابق طے پاتی ہے۔ اس کی تاکید و تائید میں یہ آیت ہے کہ:

"اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں کہ وہ سب مسلمان ہو جائیں۔" (یونس: ۹۹)

اس کے بعد فرمایا:

Marfat.com

"کسی شخص کو یہ (قدرت حاصل) نہیں کہ وہ ایمان لے آئے بجز اللہ کی مشیت کے۔ وہ گندگی واقع کرتا ہے۔ ان لوگوں میں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم دیکھو تو کیا کیا چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور کوئی بھی نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچانے جو ایمان نہیں لاتے۔" (یونس: ۱۰۰-۱۰۱)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امکان میں تھا کہ وہ تمام انسانوں کو مسلمان بنا دے، لیکن یہ ان کی تخلیق کی حکمت سے متعارض تھی۔ اس لیے اللہ نے انہیں پیدا کیا اور ان کی عقلوں کو سلیقہ بخشا اور ان کی عقل و حواس کے سامنے مختلف نشانیاں اور دلائل پیش کیے جو اللہ کی طرف دلالت کرتے ہیں اور صحیح عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ ایمان لائیں یا گمراہ ہو جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت کیے جائیں تو خیر آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں (وہ بھی) اور آپ اہل کتاب سے اور امیوں سے دریافت کیجئے کہ تم اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ اسلام لے آئیں تو بس راہِ ہدایت پر آ گئے اور اگر وہ روگرداں رہے تو آپ کے ذمے تو بس تبلیغ ہی ہے اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔" (آل عمران: ۲۰)

شعائر دینی پر عمل کی آزادی کی اسلام میں اس طرح ضمانت دی گئی ہے کہ اس کی مانند کسی اور دین یا نظام میں نظر نہیں آتی۔ رسول کریم ﷺ نے غیر مسلموں کو اپنے عقائد کی آزادی دے رکھی تھی۔ اور یہود و نصاریٰ اسلامی حکومت کے سائے میں اپنی اپنی عبادت گاہوں میں آزادانہ آتے جاتے تھے، اور یہ کہیں بھی نظر نہیں آتا کہ کسی مسلمان حاکم نے کسی کلیسا کو منہدم کیا ہو یا کسی خانقاہ کو مقفل کر دیا ہو یا انہیں مسجد میں تبدیل کر دیا ہو۔ درآنحالیکہ غیر مسلم حکومتوں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے شعائر ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اندلس میں تمام مساجد شہید کر دی گئیں یا انہیں کلیساؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح کئی ممالک میں مسلمانوں کو اپنے اسلام کا اعلان بالجبر کرنے یا آپس میں اور اپنے طور پر اس پر عمل کرنے سے روک دیا گیا۔ تاریخ اسلام مسلمانوں کی رواداری کی آئینہ دار ہے اور ہر اس شخص کی جو مسلمانوں پر شعائر دینی پر عمل کرنے سے روکنے کی تہمت عائد کرتا ہے، سختی سے تردید کرتی ہے۔ اسلام میں رواداری کی انتہا یہ ہے

Marfat.com

کہ کسی مسلمان کی یہودی یا عیسائی بیوی کو بھی اپنے کلیسا یا معبد میں جانے کا حق دیا ہے اور اس کے شوہر کو اس سے روکنے کی اجازت نہیں دی۔

جہاں تک دوسرے مذاہب کا اپنے مذہب کے مطابق کھانے پینے کا تعلق ہے تو اسلام اس میں بھی ہمیں بلندی کمال پر نظر آتا ہے اور ان کے سؤروں کو تلف کرنا ممنوع قرار دیا، کیونکہ وہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام اپنے پیروکاروں پر اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ان کی شراب کو جسے وہ پیتے ہیں ضائع کرنے سے منع کر دیا جبکہ اس کا پینا مسلمان پر حرام ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے خنزیر کو مار دے یا اس کی شراب کو ضائع کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، لیکن اگر کسی عیسائی کی شراب یا خنزیر کو نقصان پہنچائے تو اس پر اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔ کیا آزادی کی ضمانت دینے اور رواداری کی اس بلندی پر کوئی اور دین یا کوئی اور نظام پہنچ سکا ہے؟

غیر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام نے اپنے شخصی معاملات، مثلاً شادی بیاہ، طلاق، نان نفقہ اور میراث میں کسی تعرض یا جبر کے بغیر آزادی دی ہے اور شریعت اسلامی پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کیا، کیونکہ اسلام انسان کی آزادی اور شرف کا احترام کرتا ہے اور اس لیے انہیں کسی قید و بند کے بغیر اپنے معاملات نمٹانے میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو عقل، منطق اور اخلاق کے حدود کے اندر رہ کر، اور حکومت وقت کے خلاف سرکشی کیے بغیر، بحث و مباحثہ کی اجازت دی ہے، بلکہ مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کے معاملات میں بحث و تجسس کے سلسلے میں سختی اور درشتی سے کام نہ لیں۔ اس سے اللہ کا یہ قول واضح ہو جاتا ہے:

"آپ اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلایئے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقے سے بحث کیجئے۔" (النحل: ۱۲۵)

اور پھر فرمایا:

"اور تم اہل کتاب سے مباحثہ کرو، مگر مہذب طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو زیادتی کریں، اور کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر بھی جو ہم پر نازل ہوئی اور اُن (کتابوں) پر بھی جو تم پر نازل ہوئیں اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود تو ایک ہی ہے اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔" (العنکبوت: ۴۶)

یہاں اسلام میں مرتد کی سزا کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس موضوع پر فقہائے جس کی پوری طرح چھان پھٹک کی ہے کسی بحث میں پڑیں۔ لیکن درج ذیل امور کی طرف ضرور توجہ دلانا چاہتے ہیں:

۱۔ "اسلام سے خروج" (جو عموماً انفرادی فعل ہوتا ہے) اور اسلام پر خروج (یعنی بغاوت جو عموماً اجتماعی حرکت ہوتی ہے) میں فرق ہے جیسے رسول کریمؐ کے عہد میں یہودی مرتدین اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عرب مرتدین۔

۲۔ کسی کام کے حرام ہونے، اور اس کے قابلِ سزا جرم ہونے میں فرق ہے۔

۳۔ مرتد کا جرم "حدود" کے جرائم میں شمار نہیں ہوتا بلکہ تعزیری ہے، یعنی والیٔ حکومت پر چھوڑا ہوا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کی حدیث اور صحابہ کرامؓ کا عمل موجود ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں ابنِ قیم کا قول ہے:

"یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا اسلام میں دی گئی عقیدے کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ تو حکمتِ عملی ہے جس کا مقصد مسلمانوں اور مملکت اسلامی کے اداروں اور ان کے رازوں کو اُن دشمنوں کے ہاتھ میں پہنچنے سے بچانا ہے جو اسلام کا دعوے کرتے ہوئے انہیں نقصان پہنچانا چاہے یا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اسی مفہوم میں کہا ہے: 'اہلِ کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے۔ دن میں اس پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اور دن تمام ہونے پر اس سے انکار کردو، عجب کیا کہ (وہ بھی) پھر جائیں۔' (آل عمران: ۷۲)

فکر و اظہار کی آزادی

اسلام کو آزادیٔ فکر و اظہار کرنے، اور اسے جاری و ساری رکھنے پر بڑا اصرار ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عقل و علم کو کتنی بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ عقل سے انسان حیوانات سے ممیّز ہوتا ہے اور عقل ہی سے غور و فکر کرنے اور علم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر عقل ان دونوں باتوں سے الگ کر دی جائے تو انسان اپنی اہم صفت سے محروم ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم میں وہ آیات جو " یعقلون" یا " یعملون" یا " یتفکرون" یا " یتدبرون"
کے الفاظ پر ختم ہوتی ہیں ، بے شمار ہیں ۔ اس طرح غور وفکر کرنے ، سوچنے اور سمجھنے کی تلقین کرنے
والی آیات بھی بہت ہیں اور اسلام غور وفکر ہی کو اپنا مثالی طریقہ کہتا ہے جس سے اللہ کی معرفت
اس کی خشیت ، اس کی شریعت کی پابندی اور حدود کا احترام حاصل ہوتا ہے ۔ یہ سب کچھ عقل
کے غور وفکر کرنے اور غور وفکر کے اظہار کی مکمل آزادی کی فضا کے بغیر حاصل ہونا ، بعید از
قیاس ہے ۔

اسلام عقل کو اسیری سے رہا کرانے اور ان زنجیروں سے چھڑانے آیا تھا ، جنہوں نے اُسے
صدیوں سے پابند و معطل کر رکھا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

"کہہ دو کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسے (غور سے) دیکھو ۔" (یونس : ۱۰۱)

پھر کہا :

"کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کی حکومت پر نظر نہیں کی اور اس پر بھی جو
کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے ...... " (الاعراف : ۱۸۵)

ان دونوں آیتوں میں ، کسی پابندی کے بغیر ، عقل کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے
اس کی تاکید فرماتے ہوئے کہا :

"اللہ اسی طرح تمہارے لیے کھول کر احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچ لیا کرو ، دنیا
اور آخرت کے معاملات میں ...... " (البقرہ : ۲۱۹ ۔ ۲۲۰)

حریت فکر کے معاملے میں اسلام اس حد تک جا پہنچا ہے جو تقلیدی ایمان کے لیے پیامِ اجل ہے
یعنی وہ ایمان جو محض آباؤ اجداد کی تقلید پر قائم ہے ۔ اس قسم کا ایمان طوفانوں کے سامنے نہیں ٹھہر
سکتا اور نہ ایجابی ہو سکتا ہے ۔ اسلام نے فقط ایک بات میں عقل دوڑانے سے منع کیا ہے اور وہ
ہے ذاتِ باری تعالیٰ ، کیونکہ انسان کی محدود اور لاچار عقل ذاتِ خداوندی کا احاطہ نہیں کر سکتی ۔
اس موضوع پر غور وفکر کی طاقت صرف کرنا محض تضیعِ اوقات اور انسانی قویٰ کا غلط استعمال ہے
جس کا کچھ فائدہ نہیں ۔ عقل کے لیے کائنات میں اللہ کی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ ان کے بعد
ذاتِ خداوندی میں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

حریتِ فکر پر زور دینے کے بعد قدرتی طور پر اسلام مختلف طریقوں سے اس کے اظہار

Marfat.com

کی آزادی پر بھی اصرار کرنا ہے اور یہ اظہار خواہ زبان سے ہو خواہ قلم سے، اور اسی کو آزادیٔ رائے کہا جاتا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو ہر حالت میں حق بات کہنے کی تلقین فرمائی، اور یہ بھی تاکید کی کہ جسے صحیح سمجھتے ہوں اس کے اظہار میں کسی ملامت یا مذمت کی پرواہ نہ کریں اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ اسی باعث آپ ﷺ نے فرمایا:

"حق پر گونگا رہنے والا گونگا شیطان ہے"۔

آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر مسلمان کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے جابر اور ظالم حاکم غضب ناک ہو جائے تو اس سے بھی دریغ و تامل نہیں کرنا چاہیئے خواہ اس کے کہنے سے اسے قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ اور اسے سچی رائے کا اظہار کرنے پر اعلیٰ درجات کی بشارت دی: "حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور وہ شخص سیّد الشہداء ہیں جو جابر حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی، لیکن قتل کر دیا گیا"۔

اس حریتِ رائے اور اعلانِ حق کی دعوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان کسی غلطی سے متنبہ کرنے سے نہیں ڈرتے تھے اور اپنے حکام پر تنقید کرتے تھے۔ اگر ان کی رائے صحیح ہوتی تو حاکم اپنی غلطی سے باز آجاتا ورنہ اپنی رائے اور موقف کے صحیح ہونے پر انہیں مطمئن کرتا۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے آپ نے مالِ غنیمت سے ملی ہوئی ایک ایسی چادر کا کرتہ پہن رکھا تھا جس سے کسی متوسط قد کے انسان کا لباس نہیں بن سکتا تھا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دراز قد انسان تھے۔ جب آپ نے مسلمانوں سے کہا: "میری بات سنو اور اطاعت کرو"۔ تو ایک شخص نے کہا ہم بات سنیں گے نہ حکم مانیں گے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا سبب پوچھا تو سائل نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ جیسے طویل قامت شخص کے لیے اس چادر سے لباس بنوانا کس طرح ممکن ہوا؟ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اس نے زیادہ کپڑا لے لیا اور مسلمانوں پر اپنے آپ کو فوقیت دی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور کہا انہیں بتاؤ کہ میرا لباس کس طرح تیار ہوا۔ تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا کہ انہوں نے اپنے حصے کی چادر بھی باپ کو دے دی تو اعتراض کرنے والے نے کہا: "اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! اب ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے"۔

Marfat.com

آزادیٔ رائے کا اظہار تو عورتیں بھی قانونی اداروں کے سامنے برملا کرتی رہی ہیں اور حکام اس رائے کے صحیح ہونے کی صورت میں اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ لوگوں کو مہر زیادہ دینے سے روکا جائے۔ ایک عورت نے اُن سے کہا :

"اگر تم ایک بیوی کی جگہ (دوسری) بیوی بدلنا چاہو اور تم اس بیوی کو (مال کا) انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اسے (واپس) لو گے۔" (النساء : ۲۰)

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"عمر! سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتے ہیں، حتیٰ کہ عورتیں بھی! اس عورت نے درست کہا اور عمرؓ نے غلطی کی۔"

اس کے بعد آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اس آزادی کا یہ نتیجہ تھا کہ علماء اور مفکرین اپنی خواہش کے مطابق راستے اختیار کرتے رہے اور جو چاہتے تھے تعلیم دیتے رہے اور اسلام یا اسلامی حکومت ان کے راستے میں حائل نہ ہوئی۔ اس سے علوم و ثقافت کے گلزار کھل اٹھے اور اسلامی مکتبۂ فکر رنگا رنگ کے ثقافتی خزانوں سے مالامال ہو گیا، جن میں ہر قسم کے علوم و فنون، مثلاً فلسفہ، منطق، توحید، اصول، فقہ، تصوف، طب، کیمیا، طبیعات، ہندسہ، ریاضی وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے انسانیت کو ترقی کے راستے پر ڈال دیا اور درحقیقت یہی چیز جدید یورپی تہذیب کی نشاۃ کی بنیاد بنی۔

اسلام نے فقط ایک بات کو ناجائز قرار دیا یعنی دین اور اخلاق کو کمزور کرنا یا نقصان پہنچانا اور الحاد و زندقہ کی ترویج۔ کسی بھی عقلمند شخص کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ دین کو ضعف پہنچانے یا اخلاق کو تباہ کرنے یا کفر و الحاد و زندقہ کی تبلیغ، انبساطی اور خبیث دعوت ہے جس پہ پابندی لگانا اور ممانعت کرنا ضروری ہے۔

اگر ہم اس موضوع کا عملی جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ :

(۱) اسلام کے ظہور سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک (جب "اجتہاد کا دروازہ" بند ہو گیا۔ دینی اور شرعی امور میں آزادیٔ رائے کی عام طور پر ضمانت دی گئی تھی۔ اس دور کے وہ چند واقعات مستثنیٰ ہیں جو خلیفہ مامون الرشید کے "خلقِ قرآن" کے موقف سے تعلق رکھتے ہیں

Marfat.com

(۲) سیاسی معاملات میں آزادیٔ رائے کی انتہائی حد تک ضمانت دی گئی تھی، اور ہم نے اوپر اس کی مثالیں دی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم مثال حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق ہے جب خوارج ان سے کٹ گئے، جن کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی تو حضرت علیؓ نے عبداللہ ابن عباسؓ کو ان سے مناظرے کے لیے بھیجا تو ابن عباسؓ نے بحث سے تقریباً ۴ ہزار کو قائل کر لیا جو خوارج سے الگ ہو گئے جو باقی رہ گئے انہیں حضرت علیؓ نے لکھ بھیجا کہ:

"جہاں چاہو رہو، تم میں اور ہم میں یہ عہد ہے کہ اس خون کو، جسے حرام قرار دیا گیا ہے، نہیں بہائیں گے، نہ راہزنی کریں گے یا کسی پر ظلم کریں گے، اگر تمہیں یہ منظور ہو تو ہم تم سے جنگ سے ہاتھ اٹھالیں گے...... ہم اس وقت تک جنگ شروع نہیں کریں گے جب تک تمہاری طرف سے گڑبڑ اور فساد شروع نہ ہو۔"

(۳) جہاں تک علمی میدان میں عام اور خاص مسائل کے بارے میں آزادیٔ رائے کا تعلق ہے تو اس کی پوری پوری ضمانت دی گئی تھی، یہاں تک کہ مخالف حکومت کے زیر سایہ مؤرخین بھی اپنی رائے اور میلان کا حسب خواہش اظہار کرتے رہے۔

سیاسی اور شہری آزادی

دینی آزادی اور آزادیٔ رائے و فکر کے ساتھ ساتھ، اسلام نے سیاسی اور شہری آزادی بھی عطا کی ہے، جن میں:

(۱) حکومت اور حکام کے انتخاب میں اشتراک کا حق دار، اور

(۲) حکام کے اعمال کی نگرانی، ان پر تنقید اور ان کے بارے میں رائے کا اظہار، شامل ہیں۔

جہاں تک حکومت اور انتخابِ حکام کا تعلق ہے تو یہ اسلام میں "شوریٰ" کا ایسا طریقہ مقرر کرنے کا فطری نتیجہ ہے، جو عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے۔ مسلمان عوام "بیعت" یا عام انتخابات کے ذریعے حکومت کے انتخاب، اور اہل حل و عقد کے تقرر کرنے میں شریک ہوتے ہیں خلفاء راشدینؓ کے انتخاب کے طریقے سے ہمیں عوام اور اہل حل و عقد کی شرکت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ رسول کریمؐ مسلمان پر کوئی خلیفہ مقرر کیے بغیر رخصت ہو گئے۔ آپؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے آپؐ کا خلیفہ چننے کے لیے باہم صلاح و مشورہ کیا اور سب نے اپنی اپنی رائے پیش کی، اور دلیل و

Marfat.com

منطق کے ذریعے اس پر بحث کی۔ پھر سب کا حضرت ابوبکرؓ کو ولی الامر بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات سے پہلے مسلمانوں نے آپ سے پوچھا کہ ان کے بعد کون اُن کا امیر ہو گا؟ تو آپؓ نے صحابہ کرامؓ، اہل حل و عقد، امراء اور سرداروں کی رائے طلب کی۔ جب سب کا حضرت عمرؓ بن الخطاب پر اتفاق ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے وثیقۂ خلافت قلمبند کروا دیا۔ یہ دور مسلمانوں کے ارادے اور رائے کے لحاظ سے مثالی تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار ان چھ اصحاب کو دیا جن کی فضیلت پر مسلمان متفق تھے۔ ان چھ اصحاب میں طویل مشاورت ہوئی۔ یہاں تک کہ اکثریت حضرت عثمان رضی بن عفان پر متفق ہو گئی۔ اس پر بھی مسلمان، ان تمام حالات میں، منتخب شدہ شخص سے بیعتِ عام کے ذریعے اظہارِ اطاعت و قبول کرتے تھے، جو ان کی رائے، اقرار اور شرکت کا اعلان تھا۔

جب حاکم منتخب ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ امت کی طرف رجوع کرے اور امورِ حکومت خصوصاً اہم معاملات میں ان سے رائے طلب کرے۔ حاکم وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور وکالت کا تقاضا ہے کہ حاکم کے اختیارات، احکام خداوندی کے تابع ہوں۔ اس طرح احکام خداوندی اور امت سے مشاورت وہ اہم اصول ہیں جو حاکمِ صالح کے تقرر میں آزادیٔ مشارکت کی ضمانت دیتے ہیں۔

جہاں تک اظہارِ رائے کی آزادی اور مسلمان حاکم کی نگرانی کا تعلق ہے تو ہم نے چند باتوں کا ذکر آزادیٔ اظہار و افکار کے تحت کیا تھا۔ اس پر ہم یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان حکام خود اس بات پر اصرار کرتے رہے اور مسلمانوں کو اس حق کے استعمال کی ترغیب دیتے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بیعت کے بعد لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "اے لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں، مگر میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر تم مجھے حق پر پاؤ تو میرا ساتھ دو، اور غلط دیکھو تو مجھے روک دو۔ جب تک میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔"

کسی شخص نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے کہا: "اے امیر المومنین، خدا سے ڈرو!" دوسرے نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: "تم امیر المومنین سے کہتے ہو کہ خدا سے ڈرو؟" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

Marfat.com

"اسے کہنے دو۔ تم میں خیر اُسی وقت تک ہے جب تک تم یہ کہتے رہو گے، اور ہم میں خیر اسی وقت تک ہے جب تک ہم اسے مانتے رہیں گے"۔

ایک روز آپؓ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! جو شخص مجھ میں کجی دیکھے، اُسے چاہیئے کہ اُسے سیدھا کر دے"۔

کسی بدو نے جواب دیا:

"خدا کی قسم اے امیر المومنین! اگر ہم نے کبھی آپ میں کجی دیکھی تو اسے ہم ان تلواروں سے سیدھا کر دیں گے"۔

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"خدا کا شکر ہے جس نے اس امت میں ایسے لوگ پیدا کیے جو عمر میں کجی دیکھیں تو اُسے تلوار سے سیدھا کر سکتے ہیں"۔

نظام اسلامی میں اظہار رائے کی آزادی اس حد تک تھی کہ رسول کریمؐ نے منافقین کی شرانگیزی اور طعنہ زنی کے باوجود انہیں کوئی سزا نہ دی۔ عبداللہؓ ابن مسعود سے روایت ہے کہ:

"جنگِ حنین میں رسول کریمؐ نے چند لوگوں کو ان میں مال تقسیم کرنے کے لیے منتخب کیا۔ آپؐ نے اقرع بن حابس کو سو اونٹ دیے اور اتنے ہی عینیہ بن حصف کو دیئے اسی طرح آپؐ نے اشرافِ عرب کو مال عطا فرمایا اور اس دن تقسیم کے معاملے میں انہیں ترجیح دی۔ کسی سازشی نے کہا۔ اس تقسیم میں آپؐ نے انصاف نہیں کیا اور نہ خدا کی رضا جوئی شامل ہے۔ میں نے کہا: واللہ! میں یہ بات ضرور رسول اللہؐ سے کہوں گا۔ چنانچہ میں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا جو اس شخص نے کہا تھا۔ یہ سن کر حضور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "اگر اللہ اور اس کا رسول ہی انصاف نہیں کریں گے تو کون کرے گا"۔ پھر فرمایا: "اے موسیٰؑ پر رحم فرمائے، انہیں اس سے زیادہ تنگ کیا گیا مگر انہوں نے صبر کیا"۔

اس پر حضرت عمرؓ کا عمل تھا۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباس سے روایت ہے کہ عینیہ بن حصن اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس آئے (جو حضرت عمرؓ کے مقربین میں سے تھے اور قاری ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کی مجلسِ مشاورت میں شامل تھے) تو عینیہ نے کہا: "اے بھتیجے! تمہیں امیر کے پاس

Marfat.com

مقام حاصل ہے۔ مجھے اس سے (ملنے کی) اجازت لے دو۔" انہوں نے حضرت عمرؓ سے اجازت ولوادی۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو کہا۔ "اے ابن الخطاب! آپ نے ہمیں وافر دیا نہ ہم ہیں انصاف سے حکومت کی۔" حضرت عمرؓ غضبناک ہو گئے اور ارادہ کیا کہ اس سے اُلجھ جائیں تو حرؓ نے اُن سے کہا۔ "اے امیر المومنینؓ! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا: "یہ شخص "جاہلین" میں سے ہے۔" خدا کی قسم، عمرؓ نے اس آیت کی تلاوت سن کر اس کی خلاف ورزی، نہ کی۔

بے شک رواداری اور لوگوں کو آزادی عطا کرنے کا یہ مرتبہ کسی بھی نظام کے زیرِ سایہ کسی معاشرے کے لیے حاصل کرنا نادر بات ہے۔ اسلام نے کسی بھی فرد کی آزادی کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ اس پابندی میں معاشرے کی حقیقی مصلحت پوشیدہ ہو اور کسی حاکم کی ذاتی خواہشات یا اس کے دل میں انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہرگز ایسا نہیں کیا۔

سیاسی آزادی ہی کا ضروری حصہ شہری آزادی ہے۔ یہ انسان کی شخصی آزادی اور تمام انسانوں سے آزادانہ معاملہ کرنے پر قادر ہونے سے عبارت ہے۔ اسی میں نافذ شدہ قوانین کی حدود کے اندر معاہدے کرنا یا انہیں فسخ کرنا بھی شامل ہے۔ اس کی ضد غلامی ہے، جس سے انسانیت واقف ہے اور خواہ وہ کسی صورت اور کسی شکل میں ہو ضرور باقی رہے گی۔

غلامی کے موضوع کو اسلام کے خلاف افترا پردازی اور مسلمانوں کے خلاف سازش کا وسیع میدان بنا لیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام غلامی کے نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے ہمیں غلامی کے نظام پر تاریخی پہلو سے نگاہ ڈالنی چاہیئے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اسلام سے پہلے اور بعد میں موجود تھا۔ اس کے بعد ہم اس کے بارے میں اسلام کا نظری اور عملی مؤقف جان سکتے ہیں کہ اسلام نے آزادی پر زور دیا، غلامی پر نہیں اور وہ ہر قسم کی غلامی سے، خواہ وہ کسی رنگ روپ کی ہو، آزادی کا مدعی ہے۔ اس میں فرد کی غلامی یا کسی گروہ کی غلامی، مثلاً استعمار یکساں ہیں۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ اس موضوع سے مفصل بحث کر سکیں لیکن اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اپنی تحریف شدہ صورت میں یہودیت نے غلامی کی توثیق کی، اس پر اصرار کیا اور غلاموں کے حصول کے کئی طریقے ایجاد کیے اسی طرح تحریف شدہ صورت میں عیسائیت غلام کی اپنے آقا کی اطاعت کو خدا کی اطاعت

Marfat.com

قرار دے کر غلام کو اس بات پر مجبور کرتی ہے اور پھر غلامی سے نجات کو کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑتی ہے

اسی طرح یونان کے فلسفیوں وغیرہ افلاطون اور ارسطو نے غلامی کی تائید کی، اور اسے ان حالات میں سے ایک حالت خیال کیا جس پر لوگ فطرتاً پیدا کیے گئے اور انہوں نے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔

رسول کریمؐ کے معاصر عہد میں غلامی کا نظام بالاتفاق غیر نزاعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا اور اسے معاشرے کا بنیادی عنصر خیال کیا جاتا تھا۔ اس نے اس متفق علیہ بات سے بغاوت کی اور انسان کے شرف اور انسانوں میں مکمل مساوات کا اعلان کیا۔ اسلام وہ فضا پیدا کرنے آیا جس میں غلام کی آزادی کی حمایت کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے دلوں کو ہموار کیا کہ وہ مساوات اور انسانی آزادی کا استقبال کر سکیں۔ اس کے بعد اس نے ایسا نظام وضع کیا جو غلام کو مکمل آزادی عطا کرے۔ یہ نظام چار ستونوں پر قائم ہے:

۱۔ اساس فکری، یعنی اسلامی اقدار کی اشاعت کے لیے سازگار ماحول کی تشکیل، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔

۲۔ ان اسباب کا قلع قمع جو غلامی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے اسباب اسلام سے قبل بے شمار تھے لیکن اسلام نے ان میں سے صرف ایک باقی رکھا، یعنی جنگ

۳۔ غلام کو آزادی دینے کے ذرائع میں اضافہ۔

۴۔ لوگوں کو غلام آزاد کی ترغیب۔ اسلام نے اسے اللہ کی اطاعت اور تقویٰ سے تعبیر کیا۔

رسول کریمؐ اس معاملے میں لوگوں کے لیے بہترین نمونہ تھے۔ آپؐ نے اپنے چچا حمزہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اور زیدؓ سے اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ کا نکاح کیا۔ اس طرح اور بے شمار مثالیں موجود ہیں[26]۔

مساوات

اسلام سے قبل اور بعد میں، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر (یعنی انقلاب فرانس) تک ہر قوم اپنی ہی قوم کے مختلف طبقات اور افراد کے درمیان طرح طرح کے امتیازات برتتی تھی، بلکہ

Marfat.com

کئی مذاہب لوگوں میں تفریق و امتیاز کی تائید کرتے تھے اور غلامی و طبقاتی نظام کو انسانیت کے لیے طے شدہ امر تصور کرتے تھے۔ قومی اور فرقہ وارانہ تعصبات، نسلی اور طبقاتی امتیازات کو مسلسل ہوا دیتے رہے۔ یہودیوں کو گمان تھا کہ وہ خدا کی پسندیدہ قوم ہیں اور اللہ کے محبوب اور مقرب ہیں۔ اپنے قوانین میں انہوں نے یہود اور غیر یہود میں تفریق پیدا کی۔ (جرمنی میں) نازیوں نے دعویٰ کیا کہ لوگوں کو نسلی طبقات کے لحاظ سے ترتیب دیا جانا چاہیے، اور جرمن نسل، سب نسلوں اور قوموں سے برتر ہے ان قوموں پر جو ترقی یافتہ اور مہذب ہونے اور تمام بنی نوع انسان کے ایک ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ تفریق و عدم مساوات کی سوچ، دنیا کے بیشتر خطوں میں راسخ ہو چکی ہے۔ مثلاً امریکہ کے حبشی وہاں کے گوروں کے مساوی نہیں حالانکہ دونوں ایک ہی ملک کے شہری ہیں۔ امریکی سفید فام حبشیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے اور لین دین سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ افریقی سفید فام (جنوبی افریقہ میں) وہاں کے حبشیوں کو حقارت دیکھتے ہیں اور انہیں دوسرے یا تیسرے درجے کی مخلوق خیال کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں، اسلام نے لوگوں میں مساوات قائم کی اور آج سے چودہ سو برس بیشتر بنی نوع انسان کی وحدت کا اعلان کیا اور فرد کے شعور کی پرداخت اور اس کے ضمیر کی آزادی کے ذریعے اسے پروان چڑھایا، اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے مناسب قوانین وضع کیے جو حقیقی مساوات کے حصول کی ضمانت دے سکیں۔ اسلام نے نسلی، طبقاتی اور گروہی نظام کے تمام آثار کے خاتمے کا اعلان کیا اور نسل، طبقہ، رنگ، ثروت وغیرہ کے تمام امتیازات کو جنہیں لوگ تفریق اور عدم مساوات کے اسبابِ سمجھتے تھے، مسترد کر دیا۔

"اسلام اس لیے آیا کہ ابتداء و انتہا، زندگی و موت، حقوق و فرائض، اللہ اور قانون کے روبرو اور دنیا و آخرت میں بنی نوع انسان کی وحدت قائم کرے۔ یہاں نیک عمل کے بغیر کوئی فضیلت نہیں اور نیکوکاروں کے سوا کسی کو شرف حاصل نہیں۔ اسلام کا یہ فیصلہ انسانیت کے لیے ایسی جست تھی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور یہ کام ایک ایسی چوٹی ہے جسے اس سے پہلے انسان نے کبھی سر نہ کیا تھا۔ انقلابِ فرانس اور دوسری تحریکوں نے جن انسانی قوانین کو نظریاتی طور پر ضروری قرار دیا تھا، اسلام نے انہیں صدیوں پہلے نہایت عمدہ اور بلیغ انداز

میں عملی طور پہ نافذ کیا۔"[۲۷]

ساری انسانیت کا منبع و مصدر ایک ہے:

"اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے بارے میں (تقویٰ اختیار کرو) بے شک اللہ تمہارے اوپر نگران ہے۔" (النساء: ۱)

اور پھر فرمایا:

"اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے پرہیزگار تر اللہ کے نزدیک معزز تر ہے۔" (الحجرات: ۱۳)

رسول کریمؐ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے ہیں، بے شک تم میں سے پرہیزگار تر اللہ کے نزدیک معزز تر ہے، کسی عربی کے لیے عجمی پر، یا کسی عجمی کے لیے عربی پہ یا کسی سرخ فام کے لیے سفید فام پہ یا سفید فام کے لیے سرخ فام پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔"

اگر امتیاز کا سبب بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ "خدائی نسل" سے ہیں تو اللہ تو "لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ" ہے

"اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے اولاد اختیار کر رکھی ہے۔ تم نے یہ حرکت ایسی سخت کی ہے کہ کچھ بعید نہیں جو اس کے باعث آسمان ٹوٹ پڑیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ کانپ کر گر پڑیں۔ اس سلسے سے کہ یہ لوگ خدائے رحمٰن کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں اور خدائے رحمٰن کے لائق نہ (کسی طرح) نہیں کہ وہ بیٹا اختیار کرے۔ جتنے بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدائے رحمٰن کے روبرو

Marfat.com

عبد کی حیثیت سے حاضر ہوتے ہیں۔ اس نے ان کو احاطے میں لے رکھا ہے اور انہیں خوب شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک اس کے پاس تن تنہا حاضر ہوگا۔" (مریم: ۸۸ - ۹۵)

اگرچہ وجہ امتیاز "نیلے شریف خون" یا عام خون کی نسل سے ہوتا ہے، تو قرآن انسان کی توجہ انسانیت کی مشترک اور واحد اصل کی طرف مبذول کراتا ہے:

"کیا ہم نے تمہیں ایک بے قدر پانی سے نہیں بنایا ہے؟ پھر ہم نے اسے ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔ غرض ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا اور ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھہرانے والے ہیں۔" (المرسلت: ۲۰ - ۲۳)

"سو انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔" (الطارق: ۵ - ۷)

انسان۔ ہر انسان۔ مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا ہوا ہے۔ پھر کسی اعلیٰ یا برتر حسب نسب کے دعویٰ کے سبب، امتیاز و تفریق کس لیے؟

"اللہ نے تمہیں مٹی سے بنایا پھر نطفے سے اور پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔" (فاطر: ۱۱)

اسلام، تفریق و امتیاز اور ایک دوسرے پر برتری کے اسباب کی، خواہ وہ کسی شکل، صورت یا انداز کے ہوں، لڑہ میں لگا رہا کہ انہیں یکسر نیست و نابود کر دے اور رسول کریم ہمیشہ لوگوں میں یہ اعلان کرتے رہے کہ آپؐ جملہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اور آپؐ کو خدشہ تھا کہ مسلمانوں کی آپؐ سے محبت کہیں افراط و تفریط کی طرف نہ لے جائے تو آپؐ نے اس سے یہ کہہ کر منع فرمایا:

"مجھے میرے مقام سے اس طرح مت بڑھاؤ جیسے کہ نصاریٰ نے ابن مریم کو بڑھایا، کیونکہ میں تو فقط عبداللہ ہوں، اس لیے عبداللہ و رسولہ کہو۔"

آپؐ قریش کے کسی قبیلے میں تشریف لے گئے اور فرمایا:

"اے قریش کے لوگو۔ اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے بنی عبد مناف، اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے صفیہ (رسول پاکؐ کی پھوپھی) اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔"

Marfat.com

جب قریش نے زعماءِ عرب نے اس اصول، یعنی اصولِ مساوات، کا انکار کیا اور بلال حبشیؓ سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ اور دوسرے عام مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا اور حضورؐ سے تقاضا کیا کہ انہیں اپنی مجلس سے دور ہٹا دیں تاکہ وہ حاضر ہو سکیں اور آپؐ کا وعظ سن سکیں رسولِ کریمؐ نے اس بات کو رد کر دیا تو ان لوگوں نے کہا کہ پھر ایسا کریں کہ ایک دن ان کے لیے اور ایک دن ہمارے لیے مقرر کر دیں۔ قریب تھا کہ رسولِ کریمؐ اس لالچ میں کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اس خواہش کو قبول فرما لیتے۔ کہ وحی نازل ہوئی جس میں رسول اللہؐ کو متنبہ کیا گیا:

"اور ان لوگوں کو نہ نکالیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں، خاص اس کی رضا کا قصد کرتے ہوئے۔ آپؐ کے ذمے ان کا حساب ذرا بھی نہیں اور نہ ان کے ذمے آپؐ کا ذرا بھی حساب ہے جس سے آپؐ انہیں نکالنے لگیں اور آپؐ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس سے لوگ کہیں گے کہ کیا یہی لوگ ہمارے درمیان سے ہیں جن پر اللہ نے اپنا فضل کیا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے خوب واقف نہیں؟ اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپؐ کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے ...." (الانعام: ۵۲-۵۴)

ایک بار جب محمدؐ پر انسان ہونے کی حیثیت سے ضعفِ بشری کا لمحہ آیا تو آپؐ نے ایک غریب شخص ابن ام مکتوم سے توجہ ہٹا کر سردارِ قوم ولید بن مغیرہ کی طرف رخ کر لیا۔ اسی وقت عتابِ شدید نازل ہوا جو تنبیہ کی طرح تھا جس نے مطلق مساوات کے مکمل معیار قائم کر دیے:

"(پیغمبر) چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیے اس بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا..."

(عبس۔ دیکھئے آیات ۱-۱۰)

ایک مرتبہ ابوذر غفاریؓ اور کسی حبشی غلام میں رسولِ کریمؐ کے سامنے جھگڑا ہو گیا تو ابو ذرؓ نے گرمی سے پکار کر کہا: "اے کالی عورت کے بیٹے!" رسولِ کریمؐ بے حد غضب ناک ہوئے اور کہا: "بس اب حد ہو گئی، کسی گوری کے بیٹے کو کالی کے بیٹے پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ اور عملِ صالح کے سبب۔"

Marfat.com

رسولِ کریمؐ نے کئی بار حضرت بلالؓ کو مدینے کا والی مقرر کیا حالانکہ وہ آزاد کردہ غلام تھے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ درآنحالیکہ مدینے میں بڑے بڑے صحابہؓ اور مہاجرین موجود تھے۔ اسی طرح آپؐ نے باذان فارسیؓ کو یمن کا والی بنایا۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کی جگہ ان کے بیٹے کو دے دی۔ تاریخ اسلامی اور تاریخ ثقافت کے علاوہ سرداروں، امراء، اور سرداران لشکر کے حالات دیکھئے۔ ہماری بات کی تصدیق ہو گی کہ بنی نوع انسان کی حقیقی مساوات اور وحدت کا صحیح نفاذ اسلام میں کیا گیا اور فتوحات، نظامِ حکومت اور ثقافت میں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کو شریک کیا گیا۔ جن میں ایران، روم، عرب، ہندوستان کے لوگ اور آزاد و غلام اور گورے اور کالے سبھی شامل تھے۔ یہ صورتِ حال کسی اور قوم یا کسی اور ثقافت کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

پوری کی پوری نوعِ بشر کا اسلام میں وہ احترام ہے کہ اس کا استحصال گوارا نہیں کیا جا سکتا اور اسلام جب مساوات کی حمایت کرتا ہے تو محض شرف و کرامت کی خاطر، جو اس کی انسانیت ہی کا تقاضا ہے:

"اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔" (بنی اسرائیل: ۷۰)

اسلام کی بنی نوعِ انسان کی تکریم پوری کی پوری انسانیت کے لیے تھی، نہ کہ چند لوگوں یا نسلوں یا قبائل کے لیے۔ یہ تکریم بھی مطلق مساوات کی مانند ہے۔ سب کے سب آدمؑ سے ہیں اور جب آدمؑ مٹی سے بنائے گئے اور جب آدمؑ اللہ کے نزدیک معزز تھے تو ان کے بیٹے یہاں بامعاں سب کے سب، اس بات میں مساوی ہیں۔

مساوات کی ضمانت دینے کے لیے اسلام نے جو قوانین بنائے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم اس وقت بیان کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اسلام نے حقوق و فرائض متعین کر دیئے ہیں اور لوگوں کو قانون کی نظر میں مساوی قرار دیا ہے۔ خود رسولِ کریمؐ نے مساوات کے قانون کی برتری کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔"

حالانکہ اشرافِ قریش کسی مخزومی عورت کے بارے میں جس پر حدّ قائم کی جانے والی تھی نرمی

Marfat.com

کی سفارش لے کر آئے تھے۔ رسول کریمؐ نے انہیں مساوات کے بنیادی اصول سے آگاہ کیا۔ اور واضح کر دیا کہ ان سے پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں کوئی امیر چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا اور فقیر چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔

عدل و انصاف

انصاف ان بنیادی مثالوں میں سے ہے جنہیں انسانوں کے درمیان بروئے کار لانے کے لیے اسلام آیا اور اسلام کے لیے جو انسانی شرف کا حامی ہے اور اس حق کی پاسداری کرتا ہے انصاف کا قیام عین فطرت ہے۔ حق و صداقت کے قیام کے لیے انصاف ضروری ہے اور عدل کی ضمانت مل جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی ہے اور افراد انسانی کے ایک دوسرے سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور ان روابط میں توازن، ہم آہنگی اور اخوت پیدا ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی آیات اور احادیث رسولؐ انصاف کی پُر زور تلقین کرتی ہیں تاکہ ایسا حق قائم ہو جس میں ظلم و زیادتی کا ذرا بھی شائبہ نہ پایا جائے اور اس کا بہت سختی سے احترام کیا جائے اور جس کی خلاف ورزی پر سخت عذاب کی وعید دی گئی ہے۔

قرآن کریم نے اعلان کیا:

"بے شک اللہ عدل کا اور حسن سلوک کا اور قرابت داروں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے اور مطلق برائی سے اور ظلم و سرکشی سے ممانعت کرتا ہے ...." (النحل: ۹۰)

اللہ تعالیٰ نے جس عدل کو اپنا ایک وصف قرار دیا، محض عدل و حق کے قیام کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا، کتابیں نازل کیں اور لوگوں کو شریعتوں کا پابند بنایا:

"ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح باتوں کے ساتھ بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں ...." (الحدید: ۲۵)

آسمان و زمین صرف عدل ہی پر قائم ہیں:

Marfat.com

"اور آسمان کو اسی نے بلند کیا اور اسی نے میزان وضع کردی تاکہ تم تولنے میں گڑبڑ نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت۔" (الرحمٰن: ۷-۹)

عدل کا قیام رسولؐ کے فرائض میں سے ہے:

"اور آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو بھی کتابیں نازل کی ہیں میں ان پہ ایمان لاتا ہوں اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان کروں۔" (الشوریٰ: ۱۵)

جہاں تک ظلم کا تعلق ہے تو یہ ایسی بات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر بھی حرام قرار دیا اور اپنے بندوں کے لیے بھی حرام بنا دیا:

"...... اور اللہ بندوں پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرنا چاہتا۔" (المؤمن: ۳۱)

اور حدیث قدسی میں آیا ہے:

"اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم حرام قرار دیا ہے اور تمہارے مابین بھی اسے حرام کر دیا ہے اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔"

رسول کریمؐ نے ظلم سے منع فرمایا اور اسے قیامت کے دن "ظلمات" قرار دیا:

"ظلم سے بچو، کہ ظلم یوم قیامت کی ظلمات ہے۔"

وہ انصاف، اسلام جس کا داعی ہے ایسا عدل مطلق ہے جو لوگوں میں مساوات قائم کرتا ہے:

"اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو......" (النساء: ۵۸)

اور لوگوں میں موجود باہمی عداوت کو ظلم کرنے یا انصاف سے دست برداری کا جواز نہیں بنایا جا سکتا

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔" (المائدہ: ۸)

یہاں تک کہ بات کہنے میں بھی انصاف سے کام لینے کی تاکید کی، اور فرمایا:

"...... اور جب بولو تو عدل (کا خیال) رکھو، اگرچہ وہ (شخص) قرابت دار ہی ہو۔ اور اللہ سے جو عہد کیا ہے اسے پورا کرو۔ اس (سلسلہ) کا (اللہ نے) تمہیں حکم دیا تاکہ تم یاد رکھو۔" (الانعام: ۱۵۲)

Marfat.com

عدل ایسا وصف ہے جو افراد اور معاشرہ دونوں کے لیے ضروری ہے۔ فرد میں انصاف سے مراد یہ ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق مل جائے اور اس کی راہ میں حائل ہونے والی باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ انصاف پسند معاشرہ وہ معاشرہ ہے جس کے نظام ہائے زندگی اور قوانین میں کسی فرد کے لیے اپنا حق پانا اور اپنی استطاعت کے مطابق ترقی کرنا آسان ہو۔ کسی فرد کے اپنے معاشرے سے تعلقات کی واضح تعیین بھی عدل ہی سے ہوتی ہے اور خواہشات سے کنارہ کشی اور حق کے سوا کسی بات کو ترجیح نہ دینا ہی عدل کی بنیاد ہے۔

عدل کئی طرح ہے جس کی تفصیل ہم بیان کریں گے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے یہ واضح کریں کہ چونکہ عدل اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اس لیے اسلامی حکومت کا ڈھانچہ عدل کے ستونوں پر قائم ہوتا ہے۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ہی خطبہ میں جو ارشاد فرمایا وہ آپ کا دستورالحکم کہا جا سکتا ہے:

"تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوا دوں اور قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ میں اس سے حق نہ دلوا دوں، انشاءاللہ"

حضرت عمرؓ اس کے انتہے خواہش مند تھے کہ اپنے عمّال اور والیوں کو عدل کا مسلسل حکم دیتے دیتے رہتے تھے۔ وہ جنہیں عامل مقرر کرتے اُن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہیں مسلسل یہ یاددہانی کراتے رہتے کہ انہیں اس لیے لوگوں پر حاکم نہیں بنایا گیا کہ وہ ان سے ان کے جان و مال اور آبرو چھین لیں بلکہ اس لیے ولایت سونپی ہے کہ لوگوں کو کتاب اللہ اور اس کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دیں اور ان میں حق کے ساتھ فیصلے کریں اور عدل کے ساتھ تقسیم کریں۔ آپ لوگوں سے کہتے:

"اگر کسی شخص پر کسی عامل نے ظلم کیا ہو تو وہ اس کی نشاندہی کریں تاکہ میں اس سے قصاص دلوا دوں۔"

عمرو بن العاصؓ نے سوال کیا:

"اے امیر المومنین! اگر کسی امیر نے کسی شخص کو تادیب کے لیے ایسا کیا تب بھی آپ ایسا ہی کریں گے؟

Marfat.com

توحضرت عمرؓ نے فرمایا :

"ہاں کیوں نہیں؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات سے بھی قصاص دلوایا۔"

اسلام جس عدل کا تقاضا ہے وہ حکومت میں ہے :

"جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کرو۔" (النساء : ۵۸)

اور امام عادل اُن سات افراد میں سے ہے جن پر خدا اس دن اپنا سایہ کرے گا جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سید الشہداء دو شخص ہیں ایک حمزہؓ بن عبد المطلب اور دوسرا وہ شخص جو ظالم حاکم کے سامنے کھڑا ہو کر اُسے معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور وہ اُسے قتل کر دے۔

اسلام جس عدل کی دعوت دیتا ہے وہ کمزوری کی حمایت ہے۔ جھگڑنے والوں میں برابری ہے خواہ ان کے مرتبے اور درجے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ یہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں عدل ہے۔ حدود و قصاص کے قیام میں عدل ہے۔ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل ہے۔ بولنے لکھنے اور گواہی میں عدل ہے اور مسلمانوں کے آپس میں جھگڑتے والے گروہوں کے درمیان عدل ہے :

"اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کرنے لگیں تو اُن کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کرے اللہ کے حکم کی طرف۔ پھر جب وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان صلح کرادو اور عدل کے ساتھ، اور انصاف کا خیال رکھو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (الحجرات : ۹)

اسلام میں عدل اس قدر کامل اور عام کہ دشمن اور مخالف بھی اس سے خارج نہیں اور اسی کے نتیجے میں ذمی اور وہ لوگ بھی جن سے معاہدہ طے پایا ہو، بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہیں۔ رسول کریمؐ نے یہ بھی فرمایا:

"جس نے کسی ذمی کو تنگ کیا تو میں اس کی طرف سے مدعی ہوں اور میں جس کا مدعی ہوں گا اس سے قیامت کے دن بدلہ چکاؤں گا۔"

Marfat.com

آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

"جن لوگوں سے معاہدہ ہو، خبردار اگر کسی نے ان پر ظلم کیا یا ان کے حق میں کمی کی یا ان کی طاقت برداشت سے زیادہ تکلیف دی یا ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر ان سے کوئی چیز لی۔ ورنہ میں قیامت کے دن اس کا مدعی ہوں گا۔"

آپؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ غیر مسلم جب بھی دارالسلام میں اقامت پذیر ہوئے تو وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی "ذمہ داری بن گئے، اور یہ ان کا بنیادی حق ہے کہ ہر حال میں ان کے ساتھ عدل کا برتاؤ کیا جائے۔

معاملاتِ حکومت میں انصاف

قرآن و حدیث میں اس کے کئی شواہد ہیں جن میں سے بعض کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر حاکم کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ عدل و انصاف سے کرے۔ اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرے مبادہ راہِ مستقیم سے بھٹک جائے۔ رسول کریمؐ نے واضح فرمایا کہ انصاف کسی حاکم کی حکومت کو پختہ کرتا ہے اور اگر وہ لوگوں میں انصاف سے کام لینا ترک کر دے تو نظامِ حکومت میں خلل واقع ہوگا اور سلطنت مٹ جائے گی۔

"قریش میں حکومت اس وقت تک رہے گی جب ان سے رحم کی درخواست کی جائے گی تو وہ رحم کریں گے اور جب کریں گے تو عدل سے کام لیں گے اور جب تقسیم کریں گے تو انصاف کو پیشِ نظر رکھیں گے جو شخص ایسا نہ کرے گا تو اس پر اللہ اور ملائکہ اور انسانوں، سب کی لعنت ہو۔"

حکومت میں عدل اس وقت تک قائم نہیں ہوتا جب تک ہر حق دار کو اس کا حق نہ مل جائے اور حکومت اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ احکام کے مطابق ہونی چاہیئے کسی انصاف پسند حاکم کو اعلیٰ مثالوں سے متعارف کرانے کے لیے اس اہم خط کی طرف اشارہ ضروری ہے جو حسن بصریؒ نے امیر المومنین عمرؓ بن عبدالعزیز کے نام لکھا تھا انھوں نے لکھا تھا:

"اے امیر المومنینؓ آپ پر واضح ہو کہ اللہ نے امام عادل کو ہر ٹیڑھے کو سیدھا کرنے والا، ہر گم کردہ راہ کا رہنما، ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا، ہر ضعیف کی

Marfat.com

طاقت، ہر مظلوم کا فریاد رس اور ہر دل گرفتہ کا غمگسار بنایا ہے۔ اے امیرالمومنین امام عادل اولاد کے لیے شفیق باپ کی مانند ہے جو ان کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ بڑے ہونے پر تعلیم دیتا ہے۔ اپنی زندگی میں ان کے کماتا ہے اور مرنے کے بعد ان کے لیے ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ اے امیرالمومنین رضؓ، امام عادل مہربان اور نیک ماں کی طرح ہے جو اپنی اولاد کے لیے دردمند دل رکھتی ہے جس کے لیے اس نے پہلے حمل کی تکلیف برداشت کی اور پھر پیدائش کا دکھ جھیلا اور بچپن میں اسے پالا پوسا۔ بچہ جاگتا ہے تو وہ بھی جاگتی ہے۔ وہ چپ ہوتا ہے تو اُسے اطمینان ہوتا ہے۔ کبھی وہ دودھ پلاتی ہے، کبھی دودھ چھڑواتی ہے۔ وہ عافیت سے ہو تو خوش ہوتی ہے، تکلیف میں ہو تو پریشان رہتی ہے اور اے امیرالمومنین رضؓ امام عادل یتیموں کا سرپرست اور مسکینوں کا کفیل ہے۔ چھوٹوں کی تربیت کرتا ہے اور بڑوں کی پرورش۔ اور اے امیرالمومنین! امام عادل سینے میں دل کی طرح ہے۔ وہ ٹھیک ہو تو جسم تندرست ہے مگر بگڑ جائے تو جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور اے امیرالمومنین! امام عادل اللہ اور اس کے بندوں کا درمیانی واسطہ ہے۔ وہ اللہ کے احکام بھی سنتا ہے اور بندوں کی باتیں بھی۔ اللہ کو بھی دیکھتا ہے اور بندوں کو بھی۔ اللہ کا مطیع ہوتا ہے اور بندوں کا مطاع۔ اور اے امیرالمومنین! اللہ نے آپ کو جس چیز کا مالک بنایا ہے اس میں آپ اس غلام کی طرح نہ بنیں جسے اس کے مالک نے امین بنایا اور اپنے مال و عیال کی حفاظت پر مامور کیا لیکن اس نے مال ضائع کر دیا اور عیال کو بے خانماں کر دیا۔ اس کے اہل و عیال کو اس نے تنگ دست کر دیا اور مال لٹا دیا۔ اور اے امیرالمومنین جان لیجئے خدا نے حدود کا حکم اس لیے فرمایا کہ لوگوں کو خباثت اور فواحش سے باز رکھا جا سکے لیکن اگر والی امر ہی ایسا کرنے لگے تو کیا ہو گا؟ اے امیرالمومنین! موت اور بعد الممات کو یاد رکھیے۔ مت بھولیے کہ اس کے مقابلے میں آپ کا کوئی مددگار نہیں اور نہ اس سے بچانے والے دوست ہیں۔ تو موت اور موت کے بعد کی بڑی گھبراہٹ سے بچنے کی تیاری کر لیجئے۔ امیرالمومنین جان لیجئے

Marfat.com

کہ اس گھر کے علاوہ جس میں آپ رہ رہے ہیں، آپ کا ایک دوسرا گھر ہے جہاں آپ کا قیام طویل ہوگا اور آپ کے احباب ساتھ چھوڑ جائیں گے اور آپ کو ایک گڑھے میں اکیلا اور تنہا سونپ دیں گے، تو اس "دن کے لیے جب انسان اپنے بھائی، اور ماں اور باپ اور بیوی، اور اولاد سے کنی کترائے گا" (عبس: ۳۴-۳۶) ایسا زادِ راہ تیار کیجیے جو آپ کا ساتھ دے۔ یاد رکھیے اے امیر المومنین کہ اجل کی آمد اور انقطاع امید سے پہلے آپ کو فرصت کے چند لمحات حاصل ہیں۔ اے امیر المومنین۔ اللہ کے بندوں پر زمانۂ جاہلیت کے مروجہ طریقے پر حکومت نہ کیجیے اور ان کے ساتھ ظالموں کا راستہ اختیار نہ کیجیے نہ کوتاہ دستوں پہ دراز دستوں کو مسلط کیجیے اس لیے کہ وہ کسی مومن کی قرابت داری یا عہد کی حفاظت یا لحاظ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ اپنے بوجھ تو اٹھائیں گے ہی لیکن اس کے ساتھ ان کا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ مزید بہت سی ذمہ داریاں آپ پر آپڑیں گی۔ وہ لوگ جو آپ کی تباہی کے بل پر عیش کر رہے ہیں آپ کو دھوکا نہ دے جائیں۔ وہ آپ کی آخرت کی پاکیزہ نعمتوں کو ضائع کر کے موج اڑا رہے ہیں۔

اپنے آج کے اختیار و قدرت کو نہ دیکھیے، کل کے اختیار و قدرت پر نظر رکھیے جب آپ موت کے پنجے کے اسیر ہوں گے اور ملائکہ، انبیاء اور مرسلین کے مجمع میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" اور (اس روز) تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے۔" (طٰہٰ: ۱۱۱)

اے امیر المومنین، اگرچہ میری نصیحتیں ویسی پُر تاثیر نہیں ہیں جتنی آپ سے پہلے دانش مند لوگوں کی تھیں، لیکن میرے پاس آپ کے لیے شفقت اور خیر خواہی کی کمی نہیں۔ میرے اس خط کو کسی ایسے دوست کے علاج و تدبیر کا مقام دیجیے جو صرف اس لیے تلخ دوا استعمال کرواتا ہے کہ مریض کو صحت و عافیت نصیب ہو۔

والسلام علیک یا امیر المومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔"

Marfat.com

ہم نے یہ خط اس لیے درج کیا ہے کہ اس سے حاکم عادل کی وہ صورت واضح ہو جاتی ہے جو لوگوں کو مطلوب ہے اور ہمارے خیال میں عدل کے عملی نفاذ کے لحاظ سے اس کی موجودگی میں کسی اور مثال کی ضرورت نہیں رہتی، ورنہ اسلامی تاریخ، خصوصاً خلفاء راشدین رضی کی تاریخ لوگوں میں عدل قائم کرنے کے سلسلے میں ایسے عجیب و غریب واقعات سے پُر ہے جن پر مشکل سے یقین آتا ہے[79]

عدالتی انصاف

عدلیہ کسی ملک کا ایک اہم ادارہ ہے جس پر وہاں کے باشندے اپنے حقوق اور انصاف حاصل کرنے کے لیے انحصار کرتے ہیں اور عدلیہ ہی کے ذریعے سزائیں نافذ کی جاتی ہیں اور انصاف ملتا ہے۔

عدل کے تحفظ اور حق کی ضمانت کو مؤثر بنانے کے لیے اسلام نے اس ادارے کو دوام اور اختیارات عطا کرنے میں خاصی دلچسپی لی ہے۔ مسلمان فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درج ذیل حالات میں قاضی فریقین کو درجہ کا درجہ دینا چاہیے۔

۱۔ اپنے سامنے پیشی میں۔
۲۔ اپنے پاس بٹھانے میں۔
۳۔ ان کی طرف توجہ دینے میں۔
۴۔ ان کی بات سننے میں؛ اور
۵۔ ان کے معاملے میں فیصلہ سنانے میں

عمر بن الخطاب رض نے ابو موسیٰ اشعری کے نام ایک خط میں صاف ستھری اور منصف مزاج کے بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔ اسلامی عدلیہ کے پیش نظر اپنی بات کے ثبوت کے طور پر، اس اہم خط کو ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ عمر رض نے اس میں احکام کا خلاصہ بیان کر دیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ، بہترین پیرائے میں انہیں پیش کر دیا ہے۔ بعد میں آنے والوں نے اسے اپنے لیے رہنما اصول قرار دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی حق پسند کے لیے ان اصولوں سے انحراف ممکن نہیں، نہ ظالم ان سے بچ سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

Marfat.com

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے نزدیک عمر بن الخطاب رضؓ، امیر المومنین رضؓ سے عبداللہ بن قیس (یعنی ابو موسیٰ اشعری) کی طرف: السلام علیکم، اما بعد جھگڑوں کا فیصلہ کرنا بنیادی فرض ہے اور لائق اتباع سنت ہے پس جان لو کہ جب معاملہ تمہارے سامنے پیش ہو تو کسی ایسے حق کے بارے میں گفتگو کرنا، جو ثابت نہ ہو، بے کار ہے۔ لوگوں میں اپنے سامنے، اپنے انصاف میں اور اپنی مجلس میں مساوات قائم کرو کہ معزز تم سے ناجائز خواہشات وابستہ نہ کر لے اور کمزور تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو جائے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور مدعا علیہ پر قسم لازم ہے (بشرطیکہ وہ گواہ پیش نہ کر سکے) اور مسلمانوں میں صلح مستحسن ہے، سوائے ایسی صلح کے جس کی وجہ سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنا پڑے (اسلامی نظام عدل تمہیں اس بات سے مانع نہیں کہ اگر آج کسی جھگڑے کا فیصلہ تم نے اپنی عقل اور بہترین صلاحیتوں کے مطابق کر دیا ہے (لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ حق اس سے مختلف ہے) تو تم حق کی طرف رجوع کرو۔ اس لیے کہ حق قدیم ہے اور باطل میں مبتلا رہنے سے حق کی طرف لوٹنا بہتر ہے۔ ایسے معاملات جو کتاب و سنت میں نہ ملیں اور نہ تمہارے لیے ان میں فیصلہ کرنا مشکل ہو تو ان میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اشباہ و نظائر پر غور کرو اور ایسے موقعے پر معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرو اور ان میں سے اس کا انتخاب کرو جو اللہ کے احکام سے قریب تر اور حق کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو۔ جو شخص کسی حق غائب یا موجود کا دعویٰ کرے تو اس کے لیے تاریخ مقرر کر دو جس پر سارا معاملہ فیصل ہو۔ اب اگر وہ اپنے حق کے گواہ اور ثبوت پیش کر دے تو اس کا حق دلوا دو ورنہ فیصلہ اس کے خلاف کر دو۔ یہ طریق کار شک و شبہ سے بچانے والا اور اندھیرے میں اجالا کرنے والا ہے۔

"(گواہی دینے میں) سب مسلمان ایک دوسرے کے معاملے میں معتبر ہیں سوائے اس شخص کے جس پر کوئی حد نافذ ہو چکی ہو یا جھوٹی گواہی میں ملوث

Marfat.com

اور مجرب ہو یا جس پر کسی نسبی عصبیت اور باہمی تعلقات کی وجہ سے جانبداری کا شبہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پوشیدہ رازوں کے بارے میں درگزر فرمایا ہے اور شہادتوں اور قسموں کی وجہ سے سزاؤں کو ساقط کر دیا ہے۔

"دشمنوں کو پریشان کرنے، ان پر دباؤ ڈالنے یا انہیں ایذا دینے سے گریز کرو اور مقدمات سامنے لائے جانے پر ناک بھوں نہ چڑھاؤ، کیونکہ مستحق کو حق دلانا اللہ کے نزدیک بہت اجر و ثواب کا کام ہے اور تمہارے ہیں نیکیوں کا کا اضافہ ہوتا ہے۔

"جس کی نیت صاف ہو اور جو اپنا محاسبہ کرتا رہے تو اس کے اور لوگوں کے درمیان جو کچھ پیش آتا ہے، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے اور جو لوگوں کے سامنے مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرے اور اللہ جانتا ہو کہ وہ خوبیاں اس میں نہیں اور اللہ اسے ذلیل کرتا ہے۔ اس شخص پر حیرت ہے جو اجر و ثواب اور رزق اور رحمت کے خزانوں کی غیر اللہ سے امید و توقع رکھتا ہے۔ والسّلام"

عدالتی انصاف کا تقاضا ہے کہ فیصلوں کے نفاذ اور حدود کے قائم کرنے میں بھی عدل کیا جائے کیونکہ فیصلے صادر ہونے کے بعد اگر ان کے نفاذ کا اہتمام نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں گے اور راہِ راست کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ حقوق کا مقصد دین، آبرو، مال، جان اور عقل کی حفاظت ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر رسولِ کریمؐ نے فیصلوں کے نفاذ اور حدود قائم کرنے میں لوگوں میں مساوات کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"تم سے پہلے جس بات نے لوگوں کو ہلاک کیا وہ یہ تھی کہ جب کوئی ضعیف چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے اور جب کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہؓ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرے تو محمدؐ اس کا ہاتھ کاٹ دے گا۔"

حقوق و فرائض کی ادائیگی اور اجتماعی عدل قائم کرنے میں انصاف

اسلام تمام انسانوں کو عدل و مساوات کی نظر سے دیکھتا ہے، کیونکہ ان کی اصل ایک ہے

Marfat.com

اور کوئی شخص ماں کے پیٹ سے حق لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نسل و رنگ کے سبب کسی کو کسی پر فوقیت کا لحاظ کیے بغیر، سب کو برابر کے مواقع حاصل ہیں۔ حقوق کے حصول اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں اس عدلِ عام کی جو صورتیں ہیں، ان میں تمام شہریوں کے لیے تعلیم کا حق، زندہ رہنے کا حق (کیونکہ انسانی خون بہرحال حرام ہے اور حق کے سوا اس کا بہانا جائز نہیں) ملکیت کا حق (جب تک وہ قانونی طریقے سے پورا ہوتا ہے) شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ اس پر تصرف کا حق، اور فکر و رائے کا حق (جہاں تک دین کی بنیادوں سے متعارض نہ ہو) شامل ہیں۔

اسلام میں اجتماعی عدل پر بحث کرتے ہوئے ہم اس موضوع کی تفصیل دوبارہ بیان کریں گے۔

اسلامی ثقافت کی خصوصیات

اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا منبع خود قرآن کریم ہے اور یہ سرچشمہ ابتدا ہی سے ملاوٹ سے پاک چلا آرہا ہے۔ رسولِ کریمؐ کی خواہش رہی کہ مسلمانوں کی تربیت اس طرح سے ہو کہ ان پر قرآن کے سوا کوئی اور چیز اثر انداز نہ ہو۔

"کیونکہ آپ چاہتے تھے کہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جس کا دل، دماغ، تصور شعور اور ترکیب ایسی خالص ہو کہ اس پر کسی قسم کی خارجی اثرات نہ ہوں۔"

اس پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر ہم اسلامی ثقافت کا وصف بیان کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ ربانی ہے اس لیے کہ اسلامی ثقافت میں کائنات کا تصور اس کے تمام خصائص اور بنیادی اصولوں سمیت اللہ ہی سے حاصل کردہ ہے اور انسان نے اسے ان خصوصیات سمیت کاملاً وہیں سے حاصل کیا کہ اس سے ہم آہنگ ہو اور اپنی زندگی میں اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا اعتقاد ہے کہ جس اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی سنت پر عمل پیرا ہے اور انسان کی منفعت کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ یوں اس کائنات میں انسان کا مقام متعین ہو جاتا ہے: ایسا انسان جو اللہ کی زمین میں اس کا نائب ہے۔

Marfat.com

ربانیت کی یہ صفت، مادی ثقافت کی تمام اشکال کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے ایمان باللہ کی اساس پر قائم ہونے والی ثقافت، اشیاء کے مقاصد اور دور رس اصولوں سے غرض رکھتی ہے لیکن مادی ثقافت صرف اشیاء کے اسباب و مظاہر کو مد نظر رکھتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ زندگی ہی سب سے اعلیٰ مطمح نظر اور بہترین مثالیہ نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق یہ زندگی ایک ایسا مرحلہ ہے جس سے پوری نیک نیتی اور ثابت قدمی کے ساتھ گزرنا ضروری ہے اس طرح مسلمان اپنی قوت، اقتدار اور سیادت کے اوج پر پہنچ کر بھی اپنے رب پر ایمان رکھتا اور اس کے سامنے سرنگوں رہتا ہے اور تکبر و غرور اس میں سرایت نہیں کرتا جیسا کہ یورپی اقوام کا حال ہے کہ جب اسبابِ حیات ان کے لیے آسان ہو جاتے ہیں اور فطرت کے عناصر ان کے تابع ہوتے ہیں تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہو کر فرعون بن جاتی ہیں۔

اسلامی ثقافت، مقاصد و وسائل اور علم و ایمان کو یکجا کرتی ہے اس لیے اس کا وجود دین کے اصولوں پر قائم ہے جو کسی موقع پر عقل و علم سے خالی نہیں ہو سکتے اس لیے اسلامی ثقافت کا عقل و علم پر دارومدار اور ان کی پذیرائی ایسا مسئلہ ہے جو محتاج بیان نہیں۔ دین ہرگز علم و تہذیب کی جگہ نہیں لے سکتا، نہ ان کا مدمقابل ہے بلکہ یہ تو اپنے چوکھٹے اور محور کے اندر علم و تہذیب کے لیے حدود محور اور اسلوب کار مہیا کرتا ہے اور زندگی کے تمام معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ طرز فکر صحیح نہیں کہ ہم خداوندی دستور العمل کی ہر بات کو ایک پلڑے میں رکھیں۔ اور مادی دنیا میں انسانی اختراعات کو دوسرے پلڑے میں، اور پھر انسانیت سے کہیں کہ وہ دونوں میں سے (یعنی زندگی میں خداوندی دستور العمل جس میں ایمان کے سوا کوئی چیز شامل نہ ہو اور انسانی علم و عمل کے وہ ثمرات جو خداوندی دستور العمل سے عاری ہوں) کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ معاملے کی نوعیت ہرگز ایسی نہیں جیسا کہ استاد سید قطب نے کہا ہے کیونکہ خداوندی دستور العمل، انسانی اختراعات کا مخالف نہیں بلکہ یہ تو انسان کو ان اختراعات پر اکسائے اور صحیح راستے پر ڈالنے والا ہے تاکہ انسان زمین میں خلیفہ بننے کا وہ مقام حاصل کرلے جو اللہ تعالیٰ نے اسے بخشا، اس کے اختیار میں دیا اور اسے ایسی پوشیدہ طاقتیں عطا کیں جو اس مقام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی مددگار ہیں اور کائنات کے ایسے قوانین اس کے لیے مسخر کیے جو ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں اس کے ممد ہوں، اور اس

Marfat.com

کی اپنی ساخت اور کائنات کی ساخت میں ہم آہنگی پیدا کی تاکہ وہ بھرپور زندگی گزار سکے، اس کے کاروبار کو چلا سکے اور اختراعات کر سکے۔ بشرطیکہ خود ایجاد و اختراع اللہ کی عبادت ہو اور خدا کی عطا کردہ گراں بہا نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہو اور بشرطیکہ وہ خلافت کے آداب کو ملحوظ رکھے۔ یعنی اس کا عمل و حرکت اس دائرے میں ہو جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو۔

یہ انسانیت کی بدبختی ہے کہ علم کو ایمان سے الگ سمجھا گیا اور فکری اداروں کو اخلاق اور اعلیٰ مقاصد سے الگ کر دیا گیا۔ یورپی اقوام کی شخصیت اپنی آزاد کردہ قوتوں کے باعث مصیبت میں پڑ گئی اور اپنی ہی ذہانت اور عبقریت کے سحر کی اسیر ہو گئی، لیکن یہ شخصیت خود ساحر کی قائم مقام بن گئی جیسا کہ مالک بن بنی نے کہا ہے:

> "اس نے ایسے آلات ایجاد کیے جن پر اُسے کنٹرول نہ رہا اور پھر وہ اس بات کا عادی ہو گیا کہ یہی آلات، میکانکی انداز میں خود اسے چلائیں۔ اس کے نتیجے میں زندگی محض اعداد و شمار بن گئی اور خوشحالی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جانے لگا کہ کسی کے پاس حراروں اور ہارمون کی کتنی اکائیاں ہیں اور یہ دور کمیت کا دور بن گیا جس میں ضمیر "شماریات" کے رجحان کا غلام بن گیا۔ یہی حال اخلاقیات کا ہوا کہ یہ دور "اضافی اخلاق" کا دور قرار پایا اور "فضیلت مطلقہ" کا تصور مٹ گیا۔ اس حیثیت سے کہ انصاف کا مفہوم مردہ ہو گیا۔ شرافت و کرامت کے معنی بھی مسخ ہو گئے جیسا کہ ایک یورپی نے کہا: "وہ ظالم حکومت جو مساوات کی ضمانت دے، عادلانہ نظام سے بہتر ہے" اور اقتصادی زندگی کا چلن یہ ہو گیا کہ آج ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بڑے دھڑلے سے یہ بات کہتے ہیں کہ تجارت، سرقہ حلال ہے۔"

اس کائنات کے خالق اور چارہ ساز، اور ہر چھوٹی بڑی چیز اور دلوں کے اسرار سے واقف، اللہ سے تعلق رکھنے والے ضمیر انسان کے سرچشموں پر دارومدار کی بدولت "اسلامی ثقافت کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کے نتائج کی اجازت دے یا ان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس میں یہ لازمی ہے کہ اخلاق مطلقہ اور اعلیٰ مثالیے ہی حرکت و عمل اور کامیابی کا پیمانہ ہوں۔ یہ صورت حال جو ہم نے بیان کی اور حضرت عمر بن الخطابؓ کی اپنے کسی سردار جیش کو نصیحت

Marfat.com

بہت مشابہ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"اپنے لشکریوں کو معصیت سے دور رکھو، کیونکہ لشکر کے گناہ، ان کے دشمن سے زیادہ ہولناک ہیں۔ اگر ہم دشمن پر اپنے حسنِ اخلاق سے فتح نہ پا سکے تو اسے اپنی طاقت سے مغلوب نہیں کر سکیں گے۔"

اسلامی ثقافت کا مطلوب و مقصود انسانیت ہے اور اس کا مطمح نظر اور پیغام ساری دنیا کے لیے ہے۔ یہ تمام انسانوں کو ایک ہی پیمانے سے ناپتی ہے جس میں قومیت، نسل پرستی، جنس یا رنگ میں سے کوئی چیز فتور پیدا نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ یہ رجحان قرآن کریم کا پیدا کردہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ سب لوگ۔ مرد و عورت۔ نفسِ واحدہ سے پیدا کیے گئے۔ اسلامی ثقافت میں بنی نوع انسان دین کے رشتے سے باہم مربوط ہیں اسی سے انسان عزت پاتا یا ذلیل ہوتا ہے:

"اس معنی میں وطن ایک ایسا گھر ہے، جسے خدا کا عطا کردہ دین اور دستورِ عمل اور شریعت مستحکم کرتے ہیں، اور نسل پرستی، دین یا زندگی کا دستور نہیں بن سکتی، کیونکہ خاندان، قوم، نسل، رنگ اور سرزمین کی عصبیت، بہت حقیر عصبیت ہے جو پسماندگی کی علامت ہے۔ یہ جاہلیت کی وہ عصبیت ہے جس سے انسانیت اپنے روحانی انحطاط کے دور میں شناسا تھی...."[۳۲]

اپنی ذات، اہل و عیال، قوم، خاندان، شہر، وطن، امت، انسانیت، انسانی اور قومی ہیرو محض اس لیے اعلیٰ قدر و قیمت کے حامل اور بلند پایہ مقصد بننے کے اہل نہیں کہ صدیوں تک اور نسل ہا نسل لوگ ان کے نام پر جمع ہوتے رہیں یا انسان ہمیشہ انہی کی طرف رجوع کرے اور نہ یہ اعلیٰ نصب العین ہیں کہ انسانیت مسلسل ان کا قصد کرتی رہے......

اسلامی ثقافت کے نزدیک صرف اللہ تعالیٰ ہی غایت وصول، دائمی قدر اور اعلیٰ ہدف ہے جس کی پہنائیوں میں انسانیت کو ایسے افراد اور جماعتیں مل سکتی ہیں جن سے خیر، حق، عدل اور قوت حاصل ہوتی رہے۔

نسل پرستانہ اور تعصب پر مبنی ثقافتوں کے بارے میں، ان کے ایک بڑے مفکر کی بات سننے کے لائق ہے۔ (فرانسیسی مفکر) رینان کہتا ہے:

"ایک ہی نسل ایسی ہے جو لیڈر اور ہیرو پیدا کرتی ہے اور وہ یورپی نسل ہے۔ اگر اس نسل کو ایسے ماحول اور مقامات میں کام کرنا پڑے جن میں حبشی یا چینی کام کرتے ہیں تو یہ بغاوت کر دے گی اور ہمارے ملک میں ہر انقلابی ایسا ہیرو ہے جسے وہ سازگار مواقع میسر نہ آسکے جن کے لیے وہ پیدا ہوا وہ ایسا انسان جس کی تقدیر میں ہیرو بننا لکھا تھا، لیکن ایسے ایسے کام کرنا پڑے جو اس کی نسلی خصوصیات کے مطابق نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرز زندگی جس کے خلاف ہمارے کارکن بغاوت کر دیتے ہیں، چینی پاکستان یا ایسا شخص جو ہمارے رنگ ڈھنگ سے مختلف ہے، اسے اپنا لیتا ہے اور خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔"[۳۴]

انسانی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے تمام قوموں کے ذہین اور قابل انسان اسلامی ثقافت کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اب اسلامی ثقافت اس پر ناز کر سکتی ہے کہ اس کے دامن میں ہر قوم کے ذہین افراد ہیں جنہوں نے اس کی سربفلک عمارت تعمیر کی ہے اسلامی ثقافت کا طرۂ امتیاز، اس کی جامعیت اور توازن ہے۔ جامعیت، فطرت، اور انسانیت کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتی ہے اور ان میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ نسل انسانی کے تمام احوال اور ان احوال کے متوازن رہنے کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔ اسلامی ثقافت کی اس جامعیت کی اساس، اسلام پر اعتماد و انحصار ہے اور اسلام اسلوب زندگی ہے۔

"انسان کی حقیقی زندگی کے تمام عناصر سمیت ایک اسلوب جو اس دینی تصور پر محیط ہے جس میں کائنات کی فطرت کی تفسیر موجود ہے اور جس طرح وہ انسانی ہستی کی غرض و غایت متعین کرتا ہے، اسی طرح کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور یہ اسلوب زندگی ان تمام حقیقی نظاموں پر محیط ہے جو اسلام کے دینی تصور سے پھوٹتے ہیں اور اسی سے بقا پاتے ہیں اور انسانی زندگی میں پوری مثالی شکل میں نظر آتے ہیں، مثلاً اس کی شاخیں اخلاقی نظام اور وہ بنیادیں جن پر یہ قائم ہے اور وہ قوت نافذہ جو اس کی

Marfat.com

ممد و معاون ہے اور سیاسی نظام اور اس کی مختلف صورتیں اور خصوصیات
اور اجتماعی نظام اور اس کی اساس اور بنیادی اصول اور اقتصادی نظام
اور اس کا فلسفہ اور اس کی تنظیمیں اور صورتیں بین الاقوامی نظام اور اس
کے تعلقات و روابط"[43]

سب اس میں شامل ہیں۔

اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ثقافت کی ہمہ گیری اس کی اہم خصوصیت ہے جس نے اُسے تمام دیگر افکار کے مقابل جاندار، قوتِ مزاحمت عطا کی ہے اسلامی ثقافت، اپنے ابتدائی دور اور ظہور کے وقت ایک غالب قوت تھی، مگر کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ ٹھوس اور مضبوط طاقت رہی۔ اس مضبوط طاقت اور غالب قوت ہونے کا سبب یقیناً وہی ہے جو العقاد نے بیان کیا ہے کہ:

"اس میں قوتِ مدافعت تھی جس کی وجہ سے اپنے دفاع پر قادر تھی حالانکہ وقتِ مبارزت اس کے پاس غالب آنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اسلامی طاقت کی بوقتِ ضعف بھی، مقابلے میں ویسی ہی توانائی اور ثابت قدمی جیسی طاقت ور ہونے کی حالت میں کامرانی عجیب سی بات ہے۔ بالخصوص یہ بات کہ دس صدیاں گزرنے پر بھی برقرار تھی۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں اس عقیدے کی ہمہ گیری، اسلامی ثقافت کی خاص صفت ہے اور یہی صفت انسان کو باور کراتی ہے کہ وہ ایک جامع کل ہے جس سے وہ عقائد کے اس فساد و نزاع سے محفوظ ہو جاتا ہے جو دل و دماغ کو دو نیم کر دیتا ہے۔"[44]

اسلامی ثقافت کی صفات میں سے ایک ممتاز صفت یہ ہے کہ وہ انسانی دائرۂ کار کی حد تک، انسان کے لیے کائنات اور زندگی کے باہمی ربط میں مثبت روشِ حیات چاہتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اسلام کے بنیادی اصول محض بند و قیود اور ایسے ضابطوں پر مشتمل نہیں جو پابندیاں عائد کرتے ہوں بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک تعمیری قوت اور مسلسل پیش قدمی پر اکسانے والی تحریک ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اس قوتِ محرکہ کو پوری طرح بروئے کار لانے اور اس حرکت کے ذریعے اپنی تحصیلِ ذات کا ذریعہ ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ پاکیزہ طریقے

Marfat.com

سے طے پاتا ہے، کیونکہ اسلامی ثقافت میں عمل اور مثبت رویّہ اخلاقی صورتیں ہیں۔ ان کے بے عملی اور منفی رویّہ غیر اخلاقی صورتیں ہیں کیونکہ وہ انسانی زندگی کے اس مقصد کی نفی کرتی ہیں جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ ہے اور اس کا فرض ہے کہ زمین میں پائی جانے والی تمام قوتوں اور طاقتوں کو، جنہیں خدا نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے تعمیر و ترقی میں استعمال کرے[36]۔

چونکہ اسلامی ثقافت عقل پر قائم ہے اور اس کی مخالفت نہیں کرتی، اس لیے یہ عقل کے لیے نئے اور وسیع افق مہیا کرتی ہے۔ اور رنگارنگ سرگرمیاں تلاش کرتی رہتی ہے۔ سماوات و ارض کا مالک بننے کے لیے قرآن نے عقل کو مخاطب کیا ہے اور کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ یعنی اس کے لیے شمار شمس و قمر اور نجوم و افلاک کی طرف بلایا ہے:

"نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔" (یٰس : ۴۰)

اور اس کے بادلوں اور بارش کی طرف توجہ دلائی ہے:

"کیا تجھے یہ علم نہیں کہ اللہ بادل کو چلاتا رہتا ہے، پھر اس کو باہم ملا دیتا ہے۔ پھر اس کو تہہ در تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ وہ اس سے بیچ سے نکل کر آتی ہے......" (النور : ۴۳)

اور اس کے پانیوں اور چشموں، رنگارنگ کھیتوں اور ان کے نشو و نما کے مراحل کا ذکر کیا ہے:

"کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اسے زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں۔ پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے۔ سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے......" (الزمر : ۲۱)

اس کے سمندروں جو گہرے ہیں، اور اس کے اندر مچھلیوں وغیرہ اور سمندروں کی وسعت اور حرکت کی طرف متوجہ کیا۔

"اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور

Marfat.com

تاکہ تم اس میں سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو، اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اس میں پانی چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور (تاکہ تم اس کا شکر ادا کرتے رہو۔" (النحل: ۱۴)

اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے پہاڑوں پر اور دریاؤں پر اور راہوں پر غور کرنے کو فرمایا:

"اور اس نے زمین پر پہاڑ رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور دریا اور راستے (بنا دیئے) تاکہ تم راہ پاتے رہو۔" (النحل: ۱۵)

Marfat.com

حواشی

۱۔ سیّد قطب: خصائص التصور الاسلامی، ص: ۸۶

۲۔ سیّد قطب: معالم فی الطریق، ص: ۱۲۳

۳۔ ابو الحسن ندوی: "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ص: ۶۸

۴۔ محمد المبارک، نظام الاسلام۔ ص ۴۳

۵۔ محمد المبارک: "نظام الاسلام" (بحث "اللہ") اور عباس محمود عقاد: "الفلسفۃ القرآنیۃ" (بحث "الالہ")

۶۔ "الحقائق"، ص ۳۳۔ ۳۴

۷۔ "اللہ"، ص ۱۸۸ اور سیّد قطب: "خصائص التصور الاسلامی" ص ۱۷۱، ۱۷۲ بھی دیکھئے

۸۔ وہ مسلمان فلسفی جو حقائق تک دلائل سے نہیں، بلکہ تزکیہ نفس کے ذریعے پہنچتے ہیں (مترجم)

۹۔ قاضی عبد الجبار الھمذانی: "تثبیت دلائل النبوۃ"۔ تحقیق ڈاکٹر عبد الکریم عثمان: مقدمہ ص۔ ق

۱۰۔ عباس محمود العقاد: "الفلسفۃ القرآنیۃ"۔ ص ۱۰۱

۱۱۔ سیّد قطب: "خصائص تصور الاسلامی" ص ۴۷ (اردو ترجمہ "اسلامی نظریے کی خصوصیات واصول" از سیّد شبیر احمد ص ۲۸۹۔ ۲۹۰)۔ اس کے علاوہ، دیکھئے آیاتِ قرآنی: الاعراف ۵۴، آلِ عمران: ۲۶۔ ۲۷، الانعام: ۱۸، الرّعد: ۸۔ ۱۳، الانعام: ۱۷، الشوریٰ: ۵۳۔ ۵۴، الزمر: ۴۴، المجادلہ: ۷۔

۱۲۔ احمد امین: "مخبر الاسلام" ص ۲۷

۱۳۔ مقدمہ کتاب العلم بدعو للایمان: ترجمہ الاستاذ الفلکی، اور ریش کش الاستاذ الباقوری

۱۴۔ مقدمہ کتاب العلم بدعو للایمان۔

۱۵۔ مبادئ الاسلام۔ ص ۲۲

Marfat.com

۱۶۔ عباس محمود العقاد: التفکیر فریضۃ اسلامیۃ۔

۱۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے معجزات ہیں سے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، واقعہ معراج ہے، شق قمر ہے جو آسمانی وقوعہ ہے جسے بے شمار لوگوں نے دیکھا۔ لشکر اعداء پر فتح کامل ہے حالانکہ اس وقت آپؐ کے پیروکار کم تھے ہیں کم تھے۔ کفارِ مکہ کے مقابلے میں دستگیری حالانکہ حضورؐ کے مادّی وسائل بے حد محدود تھے۔ فارس و روم کی سلطنتوں کا خاتمہ ہے اور لوگوں سے حضورؐ کی حفاظت اور حمایت کا وعدہ ہے۔

۱۸۔ محمد ابو زہرہ: "المجتمع الاسلامی فی ظلل الاسلام" ص ۲۴

۱۹۔ سیّد سلیمان ندوی: الرسالۃ المحمدیہ، اور سیّد ابو الاعلیٰ مودودی: مبادیٔ الاسلام۔

۲۰۔ حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند توؐ تنہا داری

۲۱۔ قاموس محیط میں ہے: "حق" اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات میں سے ہے اور قرآن، ضدِ باطل، امرِ واقع اور اسلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۲۲۔ باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول (اقبال)

۲۳۔ حریت اور مذہبی رواداری کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے انہیں مسجد میں ٹھہرایا اور وہیں اپنی عبادت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے مسجد کے ایک کونے میں اور رسول اللہؐ اور مسلمانوں نے دوسرے کونے میں نماز ادا کی۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ مصر کی ایک عیسائی عورت نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ عمرو بن العاصؓ نے اس کا گھر مسجد میں شامل کر لیا ہے۔ جب عمرو بن العاصؓ سے جواب طلبی ہوئی تو انہوں نے خلیفہ کو لکھا کہ اس گھر کے بدلے میں اس عورت کو کئی گنا معاوضہ پیش کیا گیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تو یہ رقم بیت المال میں رکھوا دی گئی اور گھر کو گرانے کا حکم دے دیا۔ لیکن خلیفۂ عادل حضرت عمرؓ نے اسے پسند نہ فرمایا اور حکم دیا کہ مسجد میں کیے گئے اضافے کو گرا دیا جائے۔

۲۴۔ دوسرے مذاہب سے اسلام کا مؤقف مختلف ہونے کی تائید میں ہم یہ بات پیش کرتے ہیں

Marfat.com

کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے خلفاء کے عہد میں نصاریٰ اور یہود کے اہل علم کے احترام میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ان میں کئی اعلیٰ مراتب تک پہنچے اور حکومت کے اہم مناصب حاصل کیے یہاں تک کہ ہارون الرشید نے تمام مدارس ایک عیسائی حنا بن ماسویہ کی نگرانی میں دے دیے۔

۲۵۔ انجیل: پولس کا خط اہل افسس کے نام: "اے غلامو! جو جسم کی رو سے تمہارے مالک ہیں۔ اپنی صاف دلی سے ڈرتے اور کانپتے ہوئے ان کے ایسے فرمانبردار رہو جیسے مسیح کے اور آدمیوں کے خوش کرنے والوں کی طرح دکھاوے کے لیے خدمت نہ کرو بلکہ مسیح کے بندے کی طرح دل سے خدا کی مرضی پوری کرو اور اس خدمت کو آدمیوں کی نہیں بلکہ خداوند کی جان کر جی سے کرو۔ کیونکہ تم جانتے ہو جو کوئی جیسا اچھا کام کرے گا خواہ غلام ہو خواہ آزاد خداوند سے ویسا ہی پائے گا۔" (نیا عہد نامہ، اردو، ۱۹۷۵ء)

عہد نامہ قدیم کتاب استثناء، باب ۲۰: "جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے اسے صلح کا پیغام دینا اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باجگزار (غلام) بن کر تیری خدمت کریں، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو کھانا۔ ان سب شہروں کا بھی حال کرنا جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں پر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے۔ کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا بلکہ تو ان کو ...... جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے بالکل نیست و نابود کر دینا....." (اردو ایڈیشن ۱۹۸۱ء)

عہد نامہ قدیم: کتاب استثناء، باب ۱۳۔ "...... تو تو اس شہر کے باشندوں

کو تلوار سے ضرور قتل کر ڈالنا اور وہاں کا سب کچھ اور چوپائے وغیرہ تلوار ہی سے نیست و نابود کر دینا اور یہاں کی ساری لوٹ کو تنکا تنکا خداوند اپنے خدا کے حضور آگ سے جلا دینا اور وہ ہمیشہ کو ایک ڈھیر سا پڑا رہے اور پھر کبھی نہ بنایا جائے ...." (اردو ایڈیشن ۱۹۸۱ء)

۲۶۔ اس موضوع سے کئی معاصر مسلم مفکرین نے بحث کی ہے۔ اس کے مکمل احاطے کے لیے دیکھیے:

الاستاذ عباس محمود العقاد : حقائق الاسلام

الدکتور علی عبد الواحد : حقوق الانسان فی الاسلام

الاستاذ محمد قطب : شبہات حول الاسلام

۲۷۔ سید قطب: "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام"

۲۸۔ بعض کتب سیر میں آیا ہے کہ نبی کریمؐ ولید بن مغیرہ سے مصروف گفتگو تھے کہ ابن ام مکتومؓ خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے انہیں چند منٹ انتظار کرنے کو کہا تاکہ ولید سے بات مکمل کر لیں (اور بہ صورت حال ہر شخص کو پیش آ سکتی ہے) لیکن اللہ تعالےٰ کو رسولؐ کی یہ "بے رخی" بھی پسند نہ آئی۔ اسے حضورؐ کے "ضعفِ بشری" یا "توجہ ہٹا کر دوسری طرف کرنے" یا "امیر و غریب کے مابین امتیاز" کی بنیاد بنانا داستان طرازی ہے۔ (مترجم)

۲۹۔ ایاس بن سلمہؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں: "حضرت عمرؓ بن الخطاب بازار سے گزرے اور ہاتھ میں کوڑا تھا آپؓ نے مجھے اس سے مارا جو میرے لباس کے کنارے سے لگا۔ آپؓ نے مجھ سے کہا۔ "راستے سے ہٹ جاؤ" جب اگلا برس آیا تو آپؓ مجھ سے ملے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے سو درہم عنایت کیے اور کہا۔ "انہیں حج کے لیے کام میں لاؤ اور یہ جان لو کہ یہ اس ضرب کے بدلے میں ہے جو میں نے تمہیں رسید کی تھی۔" میں نے کہا: "اے امیر المومنینؓ! مجھے تو وہ یاد بھی نہیں۔ کہا: اور میں نے اسے بھلایا نہیں!

۳۰۔ سیّد قطب: المستقبل لھذا الدین۔

Marfat.com

۳۱۔ مالک بن بنی : وجہۃ العالم الاسلامی

۳۲۔ سید قطب : معالم فی الطریق

۳۳۔ مالک بن بنی : وجہۃ العالم الاسلامی

۳۴۔ سید قطب : المستقبل لہذا الدین

۳۵۔ عباس محمود العقاد : الاسلام فی القرن العشرین

۳۶۔ سید قطب : المستقبل لہذا الدین۔

Marfat.com

اسلام اور عصرِ حاضر کے چیلنج

ماضی و حال میں اسلامی ثقافت کو بے شمار چیلنج درپیش رہے ہیں۔ ان میں سے بعض چیلنج ایسے ہیں جن پر ایک رواں نظر ڈالنے سے شاید ان کی حقیقت بھی واضح ہو جائے اور اس طریق کار کا اندازہ بھی ہو جائے جو اسلامی ثقافت کے اصل ماخذ اور مستقل کردار کو برقرار رکھتے ہوئے مفکرینِ اسلام نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کیا۔

اموی دور کے اواخر، اور عباسی دَور کے اوائل میں، جب فتوحاتِ اسلامیہ کے نتیجے میں اور حکومت کے مستحکم ہونے اور امن و سکون کی راہ پر گامزن ہونے کے باعث مسلمان دنیا کی دوسری قوموں سے گھلے ملے تو الحاد و زندقہ اور تشکیک نے فکرِ اسلامی کی صفتِ خاص یعنی عقیدۂ توحید پر حملے شروع کر دیئے ان حملوں کی کئی صورتیں تھیں لیکن عموماً ان معاملات پر بحث کی جاتی جن میں عقلِ انسانی محدود ہونے کے باعث اور مناسب فکری ذرائع مہیا نہ ہونے کے سبب کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھی۔ ان کا ہدف یہ تھا کہ پہلے شک و شبہ پیدا کیا جائے اور پھر فکرِ اسلامی کی عمارت کو تباہ کر دیا جائے۔

اس طرح لوگ ان بحثوں میں پڑ گئے جنہیں صحابہ کرامؓ اور قدیم مسلمان قابلِ اعتناء نہ سمجھتے تھے اب لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات و افعال پر غور و خوض کرنے لگے۔ احکامِ شریعت اور ان کی حقیقت اور اسباب و نتائج کی بحث میں پڑ گئے اور قضا و قدر، جنت و دوزخ اور صراطِ مستقیم وغیرہ پر اپنے عقلی دلائل پیش کرنے لگے اور اس کے باوجود مخالفین کی تردید سے قاصر رہے

Marfat.com

اس کے نتیجے میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جو علم الکلام (یا بعض کے نزدیک، علم التوحید) کہلایا، اور اس علم میں کئی ایسے مباحث شامل ہو گئے جو اسلام اور اس کے عقائد کے دفاع کے لیے اہم تھے۔ رسنگین۔ اس کے علاوہ عقائد کے لحاظ سے متعدد فرقے پیدا ہو گئے اور مباحثہ و مناظرہ اس فن کے مالکوں پر حاوی ہو گیا۔ چنانچہ بحث و مباحثہ بجائے خود مقصد و ہدف بن گیا۔ حالانکہ یہ بیانِ حق اور دفاعِ حق کا ایک طریقہ تھا۔ اس کے علاوہ علم کلام کی تاسیس خود اپنی ذات میں کوئی ایسا اہم کام نہ تھا، کیونکہ ظہور اسلام کے ساتھ ہی ایسے کئی علوم وجود میں آ چکے تھے جو اس کے مزاج کے مطابق تھے اور پھر یہ کہ اس علم کے بیشتر حاملین نے اس بنیادی مقصد سے انحراف کیا جس کے لیے یہ علم وجود میں آیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے کئی متفکرین اسلام (جن میں حدیث و فقہ کے بلند پایہ آئمہ، مثلاً امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ، امام ابن حنبلؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہ شامل تھے) اس میں اس حد تک غور و خوض سے منع کرتے تھے جس گہرائی تک متکلمین جا پہنچے تھے، اور اسلامی ثقافت کے صاف ستھرے سرچشمے کی طرف لوٹنے اور قرآن و حدیث میں وارد عقاید پر اکتفا کرنے اور ان معاملات میں صحابہ کرامؓ کے مؤقف پر انحصار کرنے کا مشورہ اور دعوت دیتے رہے۔ اس بارے میں مقریزی کا قول بہت عمدہ ہے:

"جو شخص حدیثِ نبویؐ کے مجموعوں اور سلف کے حالات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرے گا تو اُسے یہ بات بخوبی نظر آ جائے گی کہ کسی صحیح یا غیر صحیح طریق روایت سے بھی یہ مروی نہیں کہ صحابہ کرامؓ باوجودیکہ ان کے طبقات مختلف اور تعداد کثیر تھی نے کبھی رسول کریمؐ سے ان باتوں کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا ہو جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا اپنے نبیؐ کی زبان سے، اپنی ذاتِ پاک کے متعلق بیان کی ہیں، بلکہ وہ اس کا مفہوم سمجھنے اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ یقیناً ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فلاں صفت ذاتی ہے اور فلاں صفت فعلی، بلکہ انہوں نے تسلیم کیا کہ علم، قدرت، حیات، ارادہ، سمع و بصر، کلام، جلال، اکرام، جود و انعام اور عزت و عظمت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ازلی ہیں اور اسی طرح قابل تسلیم ہیں جس طرح وارد ہوئی ہیں۔ ان کے پاس کتاب اللہ کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی جس سے اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کی وحدانیت اور نبوتِ محمدیؐ کے اثبات پر استدلال لاتے اور نہ ان میں سے کوئی علم کلام کے اسالیب یا فلسفیانہ مسائل سے آگاہ تھا۔"

سچ تو یہ ہے کہ اس وقت جب مفکرین نے فکر کی صحیح راہ سے انحراف اختیار کر لیا تھا اور متکلمین مختلف راستوں پر چل کر راہِ حق سے بھٹک گئے تھے اور اصل سرچشمے اور اپنے بے مثال افکار سے دور ہو گئے تھے، ابنِ حنبلؒ، غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ جیسے آئمہ کا معاملات کو اصل حالت کی طرف لوٹانے میں بڑا ہاتھ تھا۔ اگرچہ ان کا طریقہ کار الگ الگ تھا۔ امام ابن حنبلؒ نے حکومت کی سختی، ظلم اور جبر برداشت کیا۔ امام غزالیؒ نے خود اہلِ کلام کے عقلی اور منطقی اسلوبوں کو علم کلام کے موحدوں کے مقاصد پورے کرنے سے قاصر رہنے اور حقائق کی وضاحت سے عاجز رہنے کی تشریح کی خاطر استعمال کیا اور امام ابنِ تیمیہؒ نے قرآنِ کریم اور حدیثِ نبویؐ سے حجت کو خود ہدف تک پہنچنے کی بنیاد بنایا۔ اسلامی ثقافت کے لیے ایک اور چیلنج، یونانی افکار کا حملہ تھا۔ جب مسلمانوں نے یونانی فلسفیوں کے پیش کردہ نظریات کے بیشتر حصے کا ترجمہ کیا بالخصوص ان کے مشہور فلسفیوں، افلاطون، ارسطو، افلوطین وغیرہ کے افکار، جن کی کتابیں مسلمانوں میں مروج ہو گئیں اور بہت سوں نے انہیں پسند کیا اور اس سے گہرا اثر لیا اور اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ عباسی دور میں یونانی فلسفے کی تعلیم ہمعصر تہذیب کا ایک جزو بن گئی اور کئی ایسے لوگ فارغ التحصیل ہو گئے جو اس فلسفے میں ڈوبے ہوئے تھے اور فکرِ صحیح کی جگہ اسے لانے کی دعوت دیتے تھے۔ ان میں الفارابی، ابن سینا، ابن رشد، ابن طفیل وغیرہ شامل ہیں۔ اس نو وارد فلسفے کی وبا کی لہر اتنی شدید تھی کہ فکرِ اسلامی کے ایسے بڑے بڑے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے جو یونانی فلسفے کے نقائص، اسلامی مثالیے، اقدار اور صحیح اسلامی فکر کے اسلوب سے اس کے اختلافات بیان کرنے میں پیش پیش تھے۔ اسلامی ثقافت کی آغوش تو پوری دنیا کے لیے کشادہ تھی، اور کہیں سے بھی ملے حکمت و دانش سے استفادہ کرتی تھی، مگر صحیح ثقافت ہونے کے باعث یہ ہر حاصل کی جانے والی یا قابلِ استفادہ چیز کو اپنے بنیادی اصولوں یا مثالیوں کی کسوٹی پر پرکھتی تھی اور کسی ایسی روش کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی جو اس کی بنیادوں کو منہدم کر دے یا اس کے تشخص کو مسخ کر دے۔ اس میں کوئی شک کہ یونانی ثقافت، زندگی، کائنات اور وجود کے معاملات میں اسلامی ثقافت کے

Marfat.com

نظریات سے مختلف تھی، کیونکہ یہ مجرّد فلسفیانہ ثقافت تھی اور ایمان باللہ اور وحی کو علم کی بنیاد قرار نہیں دیتی تھی۔ ان میں سے جو فلسفی "الہیئن" کہلاتے وہ بھی اللہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے جس طرح مسلمان ایسے ربّ خالق پر ایمان رکھتا ہے جو تمام امور دنیا کا مدبّر بھی ہے۔ ان کی اکثریت یہ اعتقاد رکھتی تھی کہ اللہ مثالیوں میں سے ایک مثالیہ ہے۔ اگرچہ ان سے بلند مرتبہ ہے۔ بعینہ جس طرح وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کائنات اُس سے اُسی طرح ظہور پذیر ہوئی جس طرح سورج سے حرارت یا چاند سے روشنی اور ان کی رائے میں وہ خالق، یا کائنات کے امور کا مدبّر نہیں کیونکہ اس نے بس اتنا کیا کہ کائنات کو چلا کر چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں یہ لوگ حساب کتاب، ثواب و عذاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے بلکہ تناسخ ارواح یا آواگون سے ملتا جلتا عقیدہ رکھتے ہیں جس کی مثال مشرق کے مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یونانی فلسفہ اشیاء کے بارے میں حسّی اور مادّی نظریہ رکھتا ہے اور ان میں سے بیشتر کے نزدیک "سعادت" اس زندگی ہی میں ممکن ہے، اس کے بعد نہیں۔

اسی باعث اس فلسفے کا فکر اسلامی میں نمایاں مقام حاصل کرنا، نہ صرف بہت بڑا واقعہ تھا بلکہ تمام مسائل و احکام کی تعبیر کے لیے وہ مثالی ذریعہ قرار پا گیا۔ کئی لوگ جو اپنے آپ کو "فلاسفۂ اسلام" کہتے تھے، لیکن یونانی فلسفے سے متاثر تھے۔ ان کی غفلت کا یہ عالم تھا وہ یونانی فلسفے کو من وعن نقل کرتے تھے اور اس کی جو صورت یونان میں معروف تھی وہی پھر بنا ڈالی اور فکر جدید کے مطابق کوئی تبدیلی نہ کی یہاں تک کہ ان کی تصنیفات اُسی کا چربہ اور نقل نظر آنے لگیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقی اسلامی ثقافت کے حامی اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تا کہ فکرِ اسلامی کو اس کی پاکیزگی لوٹائی جا سکے۔

امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہ نے صحیح اسلامی ثقافت کے دفاع میں بہت بڑا جہاد کیا۔ امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں یونانی فلسفے کے بیشتر نظریات اور ان کے اصولوں کو نظر انداز کر دیا اور اس کی بے وقعتی اور گمراہی واضح کی اور اسے حقیقی اسلامی ثقافت کے خلاف ثابت کیا۔ اسلامی مشترکہ ممالک میں اس کتاب کو یونانی فلسفہ کے لیے کمر شکن تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی جگہ لینے والی اس سے بہتر کتاب کوئی اور نہیں اور اس میں کوئی تعجب نہیں کیونکہ امام غزالیؒ نے یونانی فلسفے کے اہم مصادر کا مطالعہ کیا اور اس بارے

Marfat.com

ہیں ایک اور کتاب لکھی جس کا نام "مقاصد الفلاسفہ" ہے۔ یونانی فلسفے کے مختلف مکاتبِ فکر کے بیان میں یہ کتاب بے مثال ہے اور اس میں خود یونانی فلسفیوں کا بھی احوال ہے۔ جہاں تک امام ابنِ تیمیہ کا تعلق ہے تو ان کے رسائل، مقالات اور لیکچروں میں یونانی فلسفے اور فلسفیوں سے کامیاب مناظرے ہیں، لیکن ان کی سب تحریریں ایک طرف اور ان کی کتاب "الرد علی المنطقیین" یا "نقض المنطق" دوسری طرف، جس کا جواب نہیں۔ یوں سمجھیے کہ جہاں "تہافت الفلاسفہ" نے فلسفۂ یونان کی کمر توڑ دی، اس کتاب نے یونانی نظریات کے اسلوب اور تعلیم، بحث و تنقید اور مناظرے ہیں اس کی منطق کے اصولوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان کی بدولت فکرِ اسلامی اپنی اصلی حالت اور انفرادیت کی طرف لوٹ آیا۔

لیکن چیلنج تو مسلسل ہیں اور آویزش جاری ہے، سوائے اس کے کہ مقابلے کے حالات بدلتے رہتے ہیں، اور وہ طریقے جو اسلامی ثقافت اپنے مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے وہ بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت اسلامی ثقافت کو مغربی تہذیب اور اس سے جنم لینے والی دوسری ثقافتوں اور فکری و مذہبی میلانات کے چیلنج کا سامنا ہے ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلامی ثقافت اپنے طریقِ کار ہیں، اور ان معاملات ہیں، جن میں وہ الجھی ہوئی ہے تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور ہو جائے گی، تاکہ اپنی الگ حیثیت اور دنیا پر اپنے دائمی اثرات برقرار رکھ سکے۔ اب اس موضوع کا تذکرہ جو لوگوں کے ذہنوں سے نکل چکا ہے اور ان کی زندگیوں پر اثر انداز نہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح اس طریقِ کار کا ذکر بھی مناسب نہیں جو پسندیدہ اور دلچسپ نہیں رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کی تائید میں ہندوستان میں فکرِ اسلامی کے چوٹی کے دو علماء کی رائے پیش کریں جن کے اسمائے گرامی شیخ محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی نعمانی ہیں۔

محمد علی مونگیری اسلامی ثقافت کو درپیش چیلنج کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ اعتراضات جنہوں نے ماضی میں لوگوں کے ذہنوں اور حلقہ ہائے درس کو مصروف رکھا، اب اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کھو چکے ہیں اور وہ فرقے بھی مٹ گئے جو یہ اعتراضات اٹھاتے تھے اور ان پر اصرار کرتے تھے۔ ان موضوعات پر غور و فکر اور ان کی تدریس، ضیاعِ وقت اور سعیٔ لاحاصل ثابت ہوئی۔ اب نئی دنیا

Marfat.com

ہے، جس کی ضرورت بھی نئی ہیں اور اب اسلام کے دشمنوں اور مخالفوں نے اس دور میں ایسے نئے مسائل اٹھائے ہیں جو بالکل اچھوتے ہیں اور جو جدید فلسفے کی روشنی میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ خیالِ خام ہے کہ ان مسائل کی مکمل تردید اور تسلی بخش جواب صرف قدیم فلسفے پر اعتماد کرتے ہوئے ممکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے شکوک رفع کرنا اور مخالفت کو شکست دینا اس وقت ممکن ہے جب وہ اسباب و محرکات معلوم ہوں جن کی بنا پر اعتراض اٹھایا گیا۔"

علامہ شبلی نعمانی نے فکرِ اسلامی اور پرانی تہذیبوں کے اسالیب میں تبدیلی کا مشورہ دیا ہے جن سے اس دور میں صرفِ نظر ممکن ہے کیونکہ ان کی ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ یونانی علوم ہمارے دینی علوم نہیں اور ان پر ہمارے دین کا فہم و شعور موقوف نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنے دور میں اس تدریسی مواد کو تعلیمی نصاب میں اس لیے ضم کر دیا کہ علما، یونانی مناظرے اور مباحثے کے اس طریقِ کار سے واقف ہو جائیں جس کو عام کرنے میں اس عہد کے باطنی فرقوں نے بڑی سرگرمی دکھائی اور اس دور میں بے دینی کی جو رو چل پڑی تھی اس کو ان علوم سے بڑی تقویت ملی۔ لیکن اب ان ملحدوں کا کوئی وجود نہیں رہا اور نہ وہ یونانی علوم باقی ہیں اور نہ روشن خیال لوگ، یا دانشور کہلانے والے، اس کی برتری اور صحت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اثر ختم ہو چکا ہے اور اسلام کو اب ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ ان کی جگہ نئے علوم، نئے مسائل، نئے افکار اور نئی بحثوں نے لے لی ہے، اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے علما نئے مباحث اور عصری اور مفید علوم سے واقف ہوں تاکہ نئے مسائل کا حل پیش کر سکیں اور شکوک و شبہات کا ایسا علمی جواب دے سکیں جو علم اور تحقیق پر مبنی ہو۔"

مغربی تہذیب و تمدن کے چیلنج

اب ہم اس اہم ترین چیلنج کی طرف آتے ہیں جس کا سامنا اسلامی ثقافت کو بالخصوص اور اسلامی اداروں کو بالعموم کرنا پڑا ہے۔ یعنی مغرب کی جانب سے، تمام ذرائع سمیت، مغربی تہذیب

Marfat.com

کا حملہ، جس کا خطرہ انیسویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے لیے بڑھ گیا ہے اور اب تک برقرار ہے۔
اس حملے کی دو صورتیں ہیں:
"پہلی مسلح جنگ، جو مغربی استعمار کے نتیجے میں اسلامی دنیا کے بڑے حصے میں وقوع پذیر ہوئی
اور دوسری اسلامی اداروں کے خلاف نظریاتی اور ثقافتی جنگ جو اعلانیہ جنگ کی ہم رکاب رہی ہے۔
ابتداء میں نظریاتی جنگ سے اسلامی ثقافت کو خفیہ اور در پردہ خطرہ تھا جو اسلامی ثقافت کے
اہم اصولوں سے اختلاف میں پوشیدہ تھا اور مغربی تہذیب کے مزاج میں شامل تھا۔ استعماری طاقتیں
اپنی ثقافت کو مدارس اور پروپیگنڈے کے تمام دیگر ذرائع مثلاً کتب و رسائل اور نشریات سے پھیلانے
میں ہمہ تن مصروف تھیں۔ جو مسلمان اس تہذیب سے "فیض یاب" ہوتے ان کے لیے سب دروازے
کھل جاتے اور جو اپنی روایات اور تشخص کی حفاظت کرتے ان پر تمام راستے مسدود کر دیئے جاتے۔
مغربی ثقافت کی نشر و اشاعت، فکر اسلامی کے خلاف زیر دست جنگ تھی۔ کیونکہ موجودہ مغربی
تہذیب ان کے اہل دین اور اہل علم کے درمیان مسلح آویزش کی پیداوار تھی۔ سب جانتے ہیں کہ
"تحریک احیاء" سے پہلے یورپ میں تھیوکریسی (پاپائیت) تھی جس میں اختیار اس طبقے کے
ہاتھ میں تھا جنہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور لوگوں کو اہانت اور طرح طرح کے عذاب میں
ڈال رکھا تھا۔ یہ طبقہ آزادی، عزت، علم اور تمام انسانی جذبات کی راہ میں رکاوٹ تھا، اور کئی صدیوں
تک، جب مسلمان اس دوران میں فنون و معارف کے وسیع افق تلاش کر رہے تھے۔ اس طبقے
نے مغربی دنیا کو روشنی سے محروم رکھا۔ یورپ کے آزادی پسند لوگوں کو احساس ہوا کہ ان کی نجات
صرف اس طبقے، اور ان کے قائم کردہ خوفناک نظام حکومت کے خاتمے ہی سے ممکن ہے مغربی
تہذیب اس طرح سے ابھری اور یہ سب اہل کلیسا اور اس کے نتیجے میں دین کے خلاف ردِ عمل کا
نتیجہ تھا، کیونکہ اس تہذیب نے اپنی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دین و حکومت کے مابین جدائی
کو اپنا لیا تھا اور اس طرح مفکرین کے انداز فکر، علم و ادب اور فلسفے میں الحاد اور مذہبی قیود سے
آزادی کی روح سرایت کر گئی۔ مغربی ثقافت کا فلسفۂ زندگی خالص مادی فلسفہ ہے اور کوئی محقق
چاہے تو ان کے مشاہیر، مثلاً ہیگل، ڈارون، مارکس، ہکسلے وغیرہ کے مطالعے سے معلوم کر سکتا ہے
اس بنا پر فلسفۂ وجودیت ابھرا جس کے سائے میں اقتدار کی تباہی، دین
میں انتشار، آخرت سے انکار اور منفعت، لذت، تعصب قومی و نسلی کے اصولوں کی برتری خوب

Marfat.com

پھلی پھولی اور اس تہذیب میں ہر چیز عارضی اور اضافی بن گئی اور بنی نوع انسان میں موجود، مطلق معیار مٹ گیا۔

اس ثقافت اور اس کے اداروں کا مسلم مفکر محمد اسد (سابق لیوپولڈ وائس) نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

"قدیم یونانی اور رومی تہذیبوں اور جدید مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ان کے مقاصد اور نصب العین پر مادیت کا غلبہ تھا اور اسی باعث فساد اور جنگیں اور جھگڑے پیدا ہوئے۔ یورپ کا عام آدمی، خواہ وہ جمہوریت پسند ہو یا فسطائی سرمایہ دار ہو یا اشتراکی مزدور ہو یا دانشور، صرف ایک مذہب کا پیروکار ہے یعنی مادی ترقی کی پرستش، اور اس کا عقیدہ ہے کہ اس کی زندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان فطرت کی عائد کردہ تمام بندشوں سے آزاد ہو۔ اس مذہب کی "عبادت گاہیں" بڑی بڑی فیکٹریاں، سینما ہال، کیمیاوی لیبارٹریاں، رقص گاہیں اور بجلی گھر ہیں۔ اس کے "پروہت" بنکوں کے صدر، انجینئر، اداکارائیں، فلمی ستارے، تجارت و صنعت کے مالک، ہوا باز اور کھلاڑی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ طاقت کی ہوس اور لذت کی خواہش ہے اور اس سے وہ مختلف گروہ ظہور میں آتے ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف، اسلحہ اور دوسرے سامان حرب سے پوری طرح لیس اور خواہشات اور مصلحتوں کے تصادم کے وقت ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ ان کی تہذیب نے انسان کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا ہے جو اپنے مشاہدے کے نتائج کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک مکمل مثالیے اور خیر و شر میں درجۂ امتیاز سوائے مادی کامرانی کے اور کوئی چیز نہیں۔ اس تہذیب، اور اس کے فکری نظام میں درحقیقت خدا کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اُسے اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے نہ اس کی ضرورت کا احساس ہے۔"

مغربی تہذیب کا دوسرا خطرہ اس کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں پوشیدہ ہے جسے اس کی ثقافت پھیلا رہی ہے اور اس وقت اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے جو وہ فی الحقیقت نہیں ہے اور اس کی امتیازی اور صحیح خصوصیات کو مٹانے اور اس کے مثالی اصولوں کو مسخ

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس مہم میں وہ لوگ شریک ہیں جنہیں عام طور پر "مستشرقین" کہا جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مناسبت سے ایک اہم معاملے کی طرف اشارہ کریں۔ وہ یہ کہ یورپ کو اسلام سے نفرت، کسی بے نیازی یا ناواقفیت وغیرہ کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ ان کا دوسرے مذاہب اور غیر اسلامی ثقافتوں سے معاملہ ہے بلکہ اس نفرت کی جڑیں خاصی گہری ہیں اور اس کی بڑی وجہ شدید تعصب ہے۔ یہ نفرت صرف ذہن و عقل ہی کی نہیں بلکہ گہرے جذباتی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ نے بدھ مت یا ہندو مت کا فلسفہ اور تعلیمات قبول نہیں کیں لیکن ان دونوں مذہبوں کے بارے میں اس کا مؤقف عقلی، متوازن اور غور و فکر پر مبنی ہے، مگر جب وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو توازن بگڑ جاتا ہے اور اس میں جذباتی میلان بھی چوری چھپے گھس جاتا ہے حتیٰ کہ نامور یورپی مستشرقین بھی اسلام کے بارے میں اپنی تصنیفات میں غیر علمی جانبداری کا شکار ہو گئے، اور یہ تعصب ان کی بیشتر مخففات میں صاف جھلکتا ہے۔ گویا اسلام سے بحث علمی انداز میں ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ یہ ایسا "قصوروار" ہے جو اپنے سزا دینے والوں کے حضور پیش ہے۔ بعض مستشرقین تو وکیل استغاثہ کا مثالی کردار ادا کرتے ہیں جو جرم ثابت کرنے پر تلا ہوا ہو، اور بعض ایسے ہیں جو وکیلِ صفائی بن جاتے ہیں جو اپنے مؤکل کے مجرم ہونے کا ذاتی طور پر یقین رکھتے ہوئے، ناگزیر حالات کے پیشِ نظر اس کی سزا میں صرف کمی کے خواستگار ہوتے ہیں۔

اپنی تحریروں میں مستشرقین کا ہدف ایک طرف تو اسلامی مثالیوں اور اس کی اعلیٰ اقدار کو زک پہنچانا اور دوسری طرف مغربی مثالیوں اور ان کی عظمت کی فوقیت ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اظہار بھی ہوتا ہے کہ اسلام پر قائم رہنے کی دعوت رجعت پسندی اور پسماندگی کا مظہر ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ماقبل اسلام کی تہذیبوں، مثلاً مصر میں فرعون کا عہد اور اس کی زبان عراق میں آشوری تہذیب اور اس کی زبان، شمالی افریقہ میں بربریہ تہذیب اور فلسطین، شام اور لبنان میں فینیقی تہذیب کے احیاء کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔

وہ مسائل جن سے مستشرقین دلچسپی رکھتے ہیں اور جن کا مسلمانوں پر بالعموم اور عربوں پر بالخصوص اثر ہے، اور جس کے پروپیگنڈے اور ترویج میں انہوں نے سرگرمی ظاہر کی، یہ ہیں:

(۱) قرآن کے انسانی کلام ہونے کا نظریہ، اور یہ اعتقاد کہ ...... یہ رسول کریم کی ذات پر

Marfat.com

عرب ماحول کی چھاپ کا نتیجہ ہے۔ اعتدال پسند مستشرقین بھی، مثلاً پروفیسر گب اپنی کتاب "محمڈن ازم" میں اس رَو میں بہہ گئے اور اس کام کے لیے، صد افسوس کہ انہوں نے عالم اسلام میں کئی سعادت مند شاگرد مستشرقین چھوڑے۔ مثلاً اگر آپ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الشعر الجاہلی" کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآن عرب پرستی مسیحیت اور عرب یہودیت کا رد پیش کرتا ہے اور یہ کہ قرآن کے افکار ایک مخصوص عرب ماحول اور معاشرے کو متاثر کرنے کے لیے ہیں۔ اگر ہم پروفیسر گب کی کتاب کا ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصنیف سے مقابلہ کریں تو ہمیں ان کے طرزِ فکر اور اسلوب میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ اسی طرح آپ کو بعض عرب فرقوں کے سرخیل ایسے ملیں گے جن کے نظریات کا حاصل یہ ہے کہ وہ قرآن کی صفتِ وحی کے منکر ہیں اور یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ محض محمد صلعم کی ذہانت و عبقریت کا نتیجہ ہے۔

(۲) پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن اس زندگی کا عکاس ہے جو رسولِ کریم کے عہد میں پائی جاتی تھی اور کسی اور زمانے کے لیے موزوں نہیں۔ اس نظریے کی بھی بڑی ذمہ داری ہمارے ملک میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین پر عائد ہوتی ہے جس کے نزدیک قرآن جاہلی دور کا سب سے سچا آئینہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "اس بانجھ اور بے برگ و بار شاعری کے مقابلے میں، جسے جعلی شاعری کہا جاتا ہے قرآن میں جاہلیت کے دَور کی عرب زندگی کا نقشہ زیادہ عمدہ اور زیادہ نفیس طریقے سے کھینچا گیا ہے۔ اس قسم کا اندازِ بیان جاہلی شعراء کے اس انداز سے یکسر مختلف ہے، جس سے ہم آشنا ہیں۔"

(۳) پھر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصیح زبان اس زمانے کی ضروریات کے ساتھ نہیں چل سکتی اس لیے ضروری ہے کہ عامیانہ زبان کو رائج کیا جائے کہ وہ کتب و رسائل کی زبان بن جائے۔ اس کام میں (عرب ممالک پر) قابض حکومتوں نے مستشرقین کی مدد کی اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اس تحریک کے بعد یہ شوشا چھوڑا گیا کہ عربی زبان کو رومن حروف میں لکھا جائے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۳ء میں اسے مصر کے "مجمع علمی" (اکادمی آف لٹریچر) کے سامنے عبد العزیز فہمی پاشا نے، جو مصر کے مشاہیر میں سے تھے، پیش کیا۔

Marfat.com

(۴) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام سے نسبت رکھنے والا، اسلامی معاشرہ، ایک مختصر دور کے سوا۔ جو صدر اوّل کہا جاتا ہے، کبھی بھی مضبوط اور پائیدار نہ رہا، یعنی اسلامی معاشرے کے ابتدائی دور میں، اس دور کی زندگی اور اسلامی تعلیمات میں کچھ نسبت رہی لیکن جب بھی معاشرے کے احوال میں تبدیلی آئی، یہ خلیج بڑھتی چلی گئی کیونکہ اسلام تغیر احوال و ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا نفاذ سے قاصر رہنا، زندگی کے تجدد پذیر حالات کے دباؤ کے تحت، معاشرتی ضرورتوں کے باعث تھا جنہیں اسلام اپنی تعلیمات میں سمو نہ سکا۔ گویا ان کے نزدیک، اسلام پسماندگی اور رجعت پسندی کا دوسرا نام ہے۔

(۶) پھر یہ کہا جاتا ہے کہ تغیر احوال کو، جو زندگی کا ایسا قانون ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے مفر نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اپنے ذہن میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ مغربی مثالیوں کے ہمراہ چلا جائے اور انہیں قبول کیا جائے تاکہ زندگی تجربے اور سائنسی اسلوب کے ذریعے بسر کی جا سکے اس لیے ضروری ہے کہ دین اسلام کی اصلاح کی جائے یا کم از کم اسلامی قانون میں تبدیلی کی جائے تاکہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکے۔ یہ ایسی دعوت ہے جو ظاہری طور پر صحیح، مگر باطنی طور پر گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

(۷) مستشرقین کے "کارہائے نمایاں" میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان مسئلوں پر بحث کرتے ہیں جنہیں وہ کمزور مقامات خیال کرتے ہیں، اور انہیں دینی یا سیاسی مقاصد کے لیے نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں، لیکن بات صرف یہ نہیں، بلکہ وہ ان "خامیوں" کو محدّب شیشے سے دیکھتے ہیں اور قارئین کو بھی اسی انداز میں دکھاتے ہیں کہ ذرّہ پہاڑ اور قطرہ سمندر نظر آئے! اس کی مثال وہ دائمی آویزش ہے جو اباحت طلاق، تعدّد ازدواج اور نبی کریمؐ کا کئی بیویوں سے نکاح جیسے مخصوص موضوعات سے بحث سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ وہ علم کلام کے مباحث کو بھی بڑا کر کے دکھاتے ہیں۔

(۸) مستشرقین جو کرتے رہے ہیں اور اب تک کرتے چلے آ رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ فکر اسلامی کو اس کے منبع سے جدا کر دیا جائے، کیونکہ ان کے خیال میں فکرِ اسلامی کا ہر موضوع یونانی فارسی یا ہندوستانی وغیرہ ہے۔

Marfat.com

مستشرقین اپنے طے شدہ کئی ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے عالم اسلام میں، اسلام، رسول اسلامؐ اور اسلام کے سرچشموں کے بارے میں کئی شبہات پیدا کر دیئے ہیں اس کے علاوہ مسلمانوں کے دلوں میں مستقبل سے مایوسی، حال سے نفرت اور ماضی کے بارے میں سوئے ظن پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سبھی مستشرقین اس میں ملوث تھے، کیونکہ ہمیں ان میں سے بعض کی فضیلت کا اعتراف ہے جو کسی ذاتی غرض سے پاک تھے، کیونکہ ان لوگوں نے اسلامی ترکے کے خزانوں کو عام کرنے میں مدد دی، لیکن ان کا برملا اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بیشتر مستشرقین کی اسلام سے دلچسپی کا سبب ان دو باتوں میں سے ایک تھا: یا تو وہ مشنری اداروں کے نمائندے ہوتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ سے وابستہ ہو کر کام کرتے، یا پھر وہ سیاسی اداروں کے لیے کام کر رہے ہوتے تاکہ کوئی استعماری غرض حاصل کی جا سکے یا کسی ایک حکومت کے نفوذ کی پشت پناہی میں سرگرم ہوتے۔ یہ لوگ مغربی طاقتوں کا ہراول دستہ تھے جو مشرقی ممالک میں جاکر حالات و مسائل کا مطالعہ کرتے تاکہ بڑی طاقتوں کو وہاں گھسنے اور تسلّط جمانے میں آسانی ہو۔

مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں کے اپنے مقاصد میں کامیابی کے مددگار یہ تھے۔

(۱) ایسے کئی مسلمانوں کی موجودگی جو ان کے نقشِ قدم پر چلے۔ یہ لوگ اسلامی ثقافت کو گدلا کرنے کے زیادہ اہل اور ذمّے دار تھے۔ اور یہ لوگ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کے مصداق تھے۔

(۲) اسلامی علوم کی پسماندگی اور فکر اسلامی کا جمود، تعلیمی نصاب کا لکیر کا فقیر بنے رہنے پر اصرار اور اسلامی فقہ کے دائرے میں توسیع اور پھیلاؤ کا فقدان۔

(۳) مسلمانوں کو لاحق ہونے والا سیاسی ضعف، اور اپنے آپ پر اور اپنی متاعِ علم و دانش پر عدم اعتماد۔

(۴) اسلام کے دشمن، ہر اس غلطی کو جو مسلمانوں سے سرزد ہوتی ہے۔ اسلام کے نام منڈھ دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا سبب ترکِ اسلام اور اس سے کنارہ کشی ہوتا ہے۔

(۵) ایک آخری اور اہم بات یہ ہے کہ اسلامی معاشروں نے مغرب کے تعلیمی نظام کو پورے کا پورا اختیار کر لیا، حالانکہ تعلیم و تربیت کی روح، اس کے وضع کرنے والوں کے علم،

Marfat.com

تصور کائنات اور نظریۂ حیات کے بارے میں عقائد، ذہنیت اور مقاصد کا عکس اور ان کے اخلاق کا مظہر ہوتی ہے، اور یہی چیز کسی نظامِ تعلیم کو پائدار تشخص، روح اور ضمیر عطا کرتی ہے۔ اس لیے اگر کسی قوم کا اپنا مخصوص عقیدہ تو ہو، مگر وہ نظامِ تعلیم کسی اور کا اپنا لے تو عقلی اور جذباتی آویزش لازماً پیدا پیدا ہوتی ہے اور بالآخر وہ قوم رفتہ رفتہ نئی اقدار کو قبول کر لیتی ہے اور سابقہ اقدار ترک کر دیتی ہے اسی سلسلے میں ہم یہ ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ امام غزالیؒ جو عقل و فہم کی تیزی اور علم کی وسعت میں فقید المثال شخصیت تھے، جب فلسفۂ یونان کے مطالعے میں مصروف ہوئے تو اس کی تنقید میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود اس سے متاثر ہوئے، اور ابوبکر بن العربی کو کہنا پڑا:

"ہمارے شیخ ابو حامد (الغزالی) نے فلسفیوں کو نگل لیا پھر انہیں اگلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی ثقافت اور مغربی تمدن دونوں زندگی کے بارے میں بالکل متضاد نظریے پیش کرتے ہیں جن میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں، اور جب صورتِ حال یہ ہو تو ہم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت مغربی اصولوں کے زیرِ سایہ ہو سکتی ہے۔ ایسی تربیت جو پوری کی پوری یورپی ثقافت کے تجربات اور اس کے تقاضوں پر مبنی ہو اور جو اسلام کے دشمنوں کے اثر و نفوذ کے شائبے سے پاک ہو، ہماری اس توقع کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور ہم، جیسا کہ استاذ محمد اسد نے کہا ہے، اگر ان چند شاذ و نادر واقعات کو مستثنیٰ قرار دیں جہاں کوئی روشن دماغ، نصابِ تعلیم پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی تعلیم و تربیت، مسلمان نوجوانوں کے ارادے، عقائد اور دروں بینی کو قطعی طور پر متزلزل کر دیتی ہے حالانکہ وہ اس مخصوص خداوندی تہذیب کے علمبردار ہیں جسے اسلام نے پیش کیا ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہمارے دینی عقیدے کو تیزی سے مائل بہ زوال کرنے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو اپنے آپ کو "روشن خیال" کہتے ہیں اور جو مغربی بنیادوں پر تربیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔

مغربی ثقافت کے چیلنج کے مقابلے میں اسلامی ثقافت کا موقف

اب جب کہ یہ واضح ہو چکا کہ مغربی ثقافت کی جنگ (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اور منتشر) مسلسل جاری ہے اور فکرِ اسلامی کے مخالفوں نے اس پر تازہ ترین حملے کیے ہیں، وہ اسی ضمن میں

Marfat.com

ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک کے مفکروں کا اس جنگ کے بارے میں کیا مؤقف ہے؟ ہم اس بات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے سکتے ہیں کہ

(۱) ایک مؤقف تو منفی ہے کہ مغربی ثقافت، اور اس سے جنم لینے والے تمام تہذیبی اور ثقافتی اداروں اور اس تہذیب کے ساز و سامان کو مسترد کر دیا جائے۔

(۲) دوسرا مؤقف مغرب پرستی کا ہے کہ مغرب کی تہذیب کو، ہر بُرے بھلے سمیت اختیار کر لیا جائے خواہ اس کا تعلق سائنس و صنعت سے ہو یا ثقافت، روحانی زندگی، عقلیت اور زبان کے اسلوب سے۔

(۳) تیسرا مؤقف دونوں تہذیبوں میں موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے اور وہ اسلام کے اصولوں کو مغربی تہذیب کے مثالیوں کے قریب لانے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس کا میلان مغربی ثقافت کو اپنانے کی طرف ہے۔ وہ اسلام کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ہے اور اس موضوع پر، جہاں تک ممکن ہو، مفکرین اسلام کے اقوال سے دلائل پیش کر کے بحث کرتا ہے۔

(۴) آخری مؤقف وہ ہے جو مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق اپنے دین پر ثابت قدمی کی دعوت دیتا ہے، مسلمانوں کو باہمی اتحاد کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی تمدن اور مغربی علوم کی پیش کردہ بہترین باتوں سے استفادہ بھی کرنا چاہتا ہے، لیکن مغربی ثقافت کو اختیار کرنا نہیں چاہتا سوائے اس کے جو امتِ مسلمہ کے تشخص اور ثقافت سے متعارض نہ ہو۔

جہاں تک پہلے نقطۂ نظر یعنی منفی رویّے کا تعلق ہے تو ہم اسے زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھتے، کیونکہ اس دین کی بھونڈی تفسیر ہے جو کائنات پر غور و فکر کرنے پر اکساتا ہے، نیک اور اچھی باتوں سے استفادہ کرنے کو کہتا ہے اور طاقتور بننے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مؤقف عملی طور پر محال ہے کیونکہ موجودات کا مزاج اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنے آپ پر دروازے اور کھڑکیاں بند کر لے۔ جس طرح شتر مرغ ریت میں سر چھپا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے! اس نقطۂ نظر کے حامی، خواہ وہ منفعت بخش باتوں سے استفادہ کریں یا نہ کریں اور تغیر و تجدید کو قبول کریں یا نہ کریں، تاریخ کا دھارا انہیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔

Marfat.com

اور ایک دن وہ اس پاس نظر ڈالیں تو کوئی حامی و مددگار نہیں پائیں گے۔

جہاں تک دوسرے نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو یہ مغربی تہذیب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں اور اس کے مقلدوں کا ہے جو اس کی تمام اقدار اور اصولوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی ہر اس بات کو اس کے بنیادی عقائد، فکری نظریات، مادی فلسفے اور اقتصادی اور سیاسی نظاموں سمیت قبول کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے حامی اور مؤیداسلام کے ہر گوشے میں ملتے ہیں...

اسلامی ملکوں میں ترکی پہلا ملک تھا جس کے اربابِ حل و عقد نے اپنے ملک کے دورِ ابتلا میں اپنے اسلامی ماضی کو اس کی ثقافت، افکار، روایات اور اسالیب زندگی سمیت ترک کر دیا، حالانکہ ترکوں کی اپنی خود مختاری اور وسیع علاقے پر حکومت تھی، مگر ان کے بیشتر تہذیب یافتہ افراد کو اپنے آپ پر اعتماد قطعی اٹھ گیا اور اپنی ان قومی روایات پر ایمان و یقین ختم ہو گیا جو زندگی کی اساس تھیں، اور وہ اس مغربی ثقافت کی پیہم ضربوں کی تاب نہ لا سکے کیونکہ یہ تہذیب نئے جذبے، عظیم قوتوں اور صنعتی، سائنسی اور فکری انقلاب سے کامران تھی، اور قدامت پسند علماء کے طبقے کو، جنہیں جدید تقاضوں اور نئی تبدیلیوں کا کچھ علم و احساس نہ تھا، اس نئی نسل کا سامنا کرنے کی توفیق نہ ہوئی جس نے یورپ کے دارالحکومتوں یا ترکی ہی واقع معاصر تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ یہ نسل مذہب سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور اپنے ہم وطنوں سے نفرت کے سائے میں پل کر جوان ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مغرب اور مافیہا کو قابلِ احترام سمجھتی تھی۔ اس فکری رجحان کی مثالی شکل وہ سرکاری ادارے تھے جو پہلی عالمی جنگ کے بعد وجود میں آئے تھے اُن پر بھی اس فکر کی چھاپ تھی جس کا حامی اور مبلّغ ممتاز ترک دانشور ضیا گوک الپ تھا۔ یہ ادارے مغربی تہذیب پر دل و جان سے ایمان رکھتے تھے اور ان کا نصب العین صاف اور واضح تھا کہ جدید مغربی حکومتوں کے طرز پر حکومت قائم کی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ اسلام کی اساس پر قائم تھی اور یہ کہ اسلام اپنی فطرت میں عربی ہے اور اس کے قانون و قواعد عربی ہیں اور یہ انسانی زندگی کو مہد سے لحد تک اس طرح کنٹرول کرتا، اور اسے ایسے مخصوص انداز میں ڈھالتا ہے جس سے تمام خواہشات اندر ہی اندر گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے جب تک اسلام ثقافت کا منبع اور ملک کا دین رہے گا، ملک خطرے میں رہے گا۔ اسی لیے انہوں نے اسلام اور اس کی ہر شاخ کو نشانہ بنانے میں چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا دیا۔ ان اداروں نے صرف

Marfat.com

دین کو دنیا سے جدا کرنے اور سیکولرازم کی بنیاد پر ترکی معاشرہ قائم کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ہر اس چیز کو جو اسلام کی یاد دلاتی تھی یا اس کی طرف اشارۃً تک کرتی تھی، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے لباس میں مداخلت کی گئی اور انہیں فرنگی لباس وغیرہ پہننے پر مجبور کیا گیا۔ اسی طرح خواتین کو بے پردہ باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد عربی رسم الخط ان کا نشانہ بنا جسے لاطینی حروف سے بدل دیا گیا۔ پھر ترکی کی تاریخ پر توجہ دی گئی اور اس کو اس بُری طرح مسخ کر دیا گیا، کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہ رہے اور صرف تورانی قومیت کی اساس پر مبنی ہو۔ یہ اداے لوگوں کی مرضی اور اختیار سے وجود میں نہیں آئے تھے، بلکہ اس کے لیے جبر و تشدد کے انتہائی وسائل بروئے کار لائے گئے۔ کیونکہ ترک قوم، اسلام میں مخلص اور تاریخ و ثقافت اسلامی اور اسلامی روایات پر ایمان رکھتی تھی۔ ان کا ایک مؤرخ عرفان اورغا (جو اتاترک کے حامیوں میں سے ہے) کہتا ہے:

"...... اتنی شورش اور اتنے شدید فسادات ہوئے کہ ترکی کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی اور حکومت کو ترکی بحریہ کو حکم دینا پڑا کہ وہ بحیرۂ اسود میں مقیم رہے، ہر قریے اور ہر مقام اور ملک کے مختلف حصوں میں، عدالتیں قائم کی گئیں۔ وہ علمائے دین، جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں مزاحمت کی روح پھونکی اور دین کے لیے سینہ سپر ہو گئے، پھانسی پر چڑھا دیئے گئے یا اتنے مجبور کر دیئے گئے کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر غار نشین ہو گئے۔ اس معاملے میں کوئی نرمی یا رورعایت نہ برتی گئی مصطفیٰ کمال نے اپنے احکام کا نفاذ اور تکمیل شروع کر دی اور اس سلسلے میں اس نے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا اور ایسے کئی افراد کو پکڑ پکڑ کر پھانسی پر چڑھا دیا جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ان احکام کا مضحکہ اڑا رہے تھے اور بے گناہ اور قصوروار کو یکساں نشانہ بنایا گیا۔"[۲۲]

ایک مدّت سے ترکی میں یہی طرزِ حکومت چلا آ رہا ہے لیکن کیا ترکی کو اس سے کوئی فائدہ ہوا؟ اس کا ماضی قریب گم ہو گیا، اور وہ اس بھرپور علمی ورثے سے کٹ گیا، جس کی تعمیر میں کئی نسلوں اور بڑے بڑے دماغوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کی قیادت بھی اس سے چھن گئی اور اہلِ اقتدار اور مضبوط مسلم قوم کے درمیان خلیج بڑھ گئی۔ اس سب کے صلے میں ترکی کو

Marfat.com

کیا طلاؔ ترکی نے مغربی تہذیب اور اس کے بعض سطحی مظاہر کا طوق پہن لیا اور بعض ایسی اصلاحات کیں جو قوموں کی زندگی میں بے معنی ہوتی ہیں اور یہ عہد، جس میں ترکی نے مغربی تہذیب سے اقتباس کیا، محض تقلیدی عہد بن گیا جو کسی جدّت اور اُپج سے عاری تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "فوائد" اس نقصان کے مقابل کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو ترکی کو اٹھانا پڑا۔ آخر کار ترکی میں ایسی معقول تحریکیں شروع ہوئیں جو اسلام، اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات پر دوبارہ اعتماد کرنے کی دعوت دیتی تھیں اور دوسرے اسلامی ممالک سے مضبوط روابط استوار کرنے پر زور دیتی تھیں۔ جن کے درمیان کو اہم مقام حاصل ہو چکا ہے کیونکہ ترکی وہ ملک ہے جس نے اسلام کی تبلیغ اور اس کی مدافعت پانچ صدیوں تک کی تھی۔

ہندوستان میں مغرب پسندی کی ترغیب سرسیّد احمد خاں اور ان کے قائم کردہ فکری مدرسے نے کی۔ سرسیّد احمد خاں کی روش بھی وہی تھی، جو اس سے پہلے ترکی میں، ضیا گوک الپ اور اتاترک نے اختیار کی۔ یعنی انہوں نے مغربی تہذیب، اس کی مادی اساس اور معاصر علوم کو پورے کا پورا، اپنے نقائص اور خامیوں کے باوجود قبول کرنے کی دعوت دی اور اسلام اور قرآن کی ایسی تفسیر کی جو انیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر نئی تہذیب سے مطابقت رکھتی تھی۔ سرسید احمد کی رائے میں حکّام کی تقلید اور ان کا سارہن سہن اور زندگی اور عادتوں میں ان سے ہم آہنگی کے نتیجے میں مسلمانوں کے دل سے ان کا خوف زائل ہو جائے گا اور ان کے احساس کمتری کا مداوا ہو گا۔ اس کے علاوہ اس سے حکام اور ارباب حکومت کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گا اور انہیں معاشرے میں اپنے ہم چشموں اور امور زندگی کے شرکاء کے برابر مقام حاصل ہو جائے گا۔ سرسیّد احمد خاں نے "تبیان الکلام" کے نام سے قرآن کی تفسیر بھی لکھی جس میں اپنی پسند اور مغرب کی آراء او خواہشات کے مطابق قرآن کی تفسیر کی "نیچریوں" سے اتفاق کرتے ہوئے، انہوں نے ہر اس بات سے انکار کیا، جسے حواس، تجربہ اور سائنس ثابت نہیں کرتی جس میں غیب کے حقائق اور مابعد الطبیعیاتی معاملات شامل ہیں۔ سرسید احمد خاں نے انگریزوں کی مالی مدد سے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی تاکہ وہ مغربی ثقافت کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کر سکے۔ لیکن اس یونیورسٹی کی قسمت میں ہندوستان کا ایک اسلامی مرکز بننا لکھا تھا۔[۳]

مصر میں مغرب پسندی کا رجحان زیادہ شدید اور پُرجوش تھا۔ درحقیقت مصر میں اس

Marfat.com

تحریک کے لیے، اور مستشرقین کی تمام تحریکوں کے لیے موزوں ماحول تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ آدمی جب کبھی مغربی مستشرق کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ کوئی نظریہ یا کوئی تحقیق ایسی نہیں جو کی حمایت میں مصر میں ایسا ادیب یا مصنف نہ مل جائے جو اس نظریے وغیرہ کو پورے اخلاص سے اپنا لیتا ہے، اس کی عجیب وغریب تشریح و وضاحت کرتا ہے اور بڑی ہوشیاری اور عیاری سے اس کا علمبردار بن جاتا ہے، مثلاً "قرآن کو اسلامی کلام کہنا، دین کو سیاست سے الگ کرنا اور یہ کہ اسلام مذہب ہے حکومت نہیں، سیکولرازم کی حمایت، عربی کے اوّلین مصادر میں شک و شبہ پیدا کرنا حدیث کی علمی قدر و قیمت میں شبہ پیدا کرنا، اسلام میں سنت کے مقام اور حجت سے انکار، عورت کی نام نہاد آزادی، مردوں سے برابری اور بے پردگی کی دعوت، فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا، اسلام کے مقابلے میں گزشتہ تہذیبوں کا احیاء، فرعون کے دور کی بڑائی ظاہر کرنا، عامیانہ زبان کی تحریک اور اس میں اشاعت و تصنیف، رومن رسم الخط کی حمایت، عربی دیوانی قوانین کو مغرب کے سول لا کے مطابق ڈھالنا، اور نسل پرستی، اشتراکیت اور کمیونزم وغیرہ کی طرف دعوت۔" [۴۶]

وقت کی قلت کے سبب ہم اس نقطۂ نظر کے حامی افراد اور ان کے خیالات کے بارے میں تفصیل سے بات نہیں کر سکتے، لیکن ان میں سے ایک اہم فرد ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اقوال کو پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب "مستقبل الثقافۃ فی مصر" میں درج کیے ہیں [۴۷]

اس کتاب کا موضوع مصنف کے اس عقیدے کی تائید کے گرد گھومتا ہے کہ مصریوں کا تعلق مشرق کی نسبت مغرب سے زیادہ ہے، اور یہ کہ مصری ثقافت یورپی ثقافت کا ایک حصہ ہے اور اسلامی حکومت کے دور میں اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی کیونکہ مصر کی ثقافت زمانہ قدیم سے مغربی ہے اور اسی طرز کی رہے گی خواہ کتنے ہی زمانے کیوں نہ بدل جائیں اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے میں مصری ذہن "ابتدا ہی سے ایسا ذہن ہے جو صرف بحیرۂ روم سے متاثر ہوتا ہے اور اختلافات کے باوجود اس کا اور بحیرۂ روم کی اقوام کا نفع و نقصان مشترک ہے۔"

سب سے زیادہ بے معنی بات، جس کی کوئی انتہا نہیں، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ کی کہ:

"مصر مشرق کا حصہ ہے اور مصری ذہن اسی طرح مشرقی ہے جس طرح ہندوستانی یا چینی ذہن۔"

اور دوسری طرف مصریوں کی مادی زندگی، ان کی رائے میں، یورپی زندگی ہے:

Marfat.com

"ہمارے ترقی پسند طبقوں میں ہماری مادی زندگی خالص یورپی طرز کی ہے، جبکہ دوسرے طبقوں میں افراد اور جماعتوں کے اختیار اور ثروت میں ان کے حصے اور کشادہ دستی کے لحاظ سے یورپی طرز زندگی سے کہیں قریب ہے اور کہیں دور، اس کا مطلب یہ ہے کہ مصریوں کی مادی زندگی کے بلند تر نصب العین وہی ہیں جو یورپیوں کی مادی زندگی کے ہیں۔"

ڈاکٹر طہٰ حسین کی نظر میں، مصریوں کی عقلی اور روحانی زندگی بھی اس سے مختلف نہیں۔

"مظاہر اور شکل و رنگت کے اختلاف کے باوجود ہماری عقلی اور روحانی زندگی بھی خالصتاً یورپی ہے اسی طرح ہمارا نظام حکومت بھی خالص یورپی ہے جسے ہم نے کسی تذبذب یا تامل کے بغیر یورپیوں سے اخذ کیا ہے اور ہمارا نظام تعلیم، ہم نے اسے کسی بھی طرح تشکیل دیا ہو اور کوئی سا بھی نصاب تیار کیا ہو، کسی شک اور بحث کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی خالص یورپی طرز کا ہے، اور ہم اپنے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ مدارس میں اپنے بچوں کو بلا شک و شبہ، یورپی بنا رہے ہیں۔"

مصنف کی رائے میں یہ سب "اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس نئے دور میں ہمیں یورپ سے ایسے قریبی رابطے کی ضرورت ہے جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے، یہاں تک کہ ہم لفظی، معنوی حقیقی طور پہ اور شکلاً اس کا ایک حصہ بن جائیں"۔ اس صورت میں بقول ڈاکٹر طہٰ حسین ہمارا فرض ہے کہ

"ہم یورپی اقوام کا رنگ ڈھنگ اپنائیں اور ان کے راستے پر چلیں تاکہ ہم ان کے ہم سر بن جائیں اور ان کی تہذیب کے بُرے بھلے، خوشگوار اور تلخ، پسندیدہ اور ناپسندیدہ اور محمود اور معیوب میں برابر کے شریک ہوں۔"

اسی طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم یورپی اقوام کو یہ یقین دلا دیں کہ ہم بھی چیزوں کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح وہ، اور ہمارے معیار اور پسند و ناپسند بھی وہی ہے جو ان کی ہے اور سب باتوں کے متعلق ہمارا فیصلہ بھی وہی ہے جو ان کا ہے۔"

مصنف کی نظر میں یہ سب اس لیے ضروری ہے کہ "مصر یورپی ذہن کا مالک ہے جو فارسیوں، رومیوں، عربیوں یا اسلام کے باوجود تبدیل نہ ہوا"۔ مصر کی بیداری ان کی نظر میں فرعونی دور کی توسیع کا نام ہے، اور وہ کہتے ہیں:

Marfat.com

"اسی وجہ سے میرا ایمان ہے کہ جدید مصر میں جو جدت و اختراع ہے، اس کی بنیاد، اور باعث مصر کی قدیم اور پائیدار تہذیب ہے اور اسی لیے میں مصر میں ثقافت کے مستقبل پر صرف اس کے زمانۂ ماضی بعید یعنی فرعونی دور، اور زمانۂ حال کی روشنی میں غور و فکر کرنا پسند کرتا ہوں۔"

ان اقوال کو ہم خلاصۂ کلام اور مصنف کی اس غرض و غایت کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں جسے وہ مصریوں کے دماغوں میں ٹھونسنا چاہتے ہیں،

"اب ہم اپنی تاریخ سے واقف ہو چکے ہیں، اپنے آپ کو پہچان گئے ہیں۔ قوت و شرف سے آگاہ ہو چکے ہیں اور یقین کر چکے ہیں کہ ہم میں اور یورپیوں میں سر مو فرق نہیں، نہ ہماری طبائع اور مزاج الگ ہیں اس لیے مجھے مصریوں کے بارے میں کوئی خدشہ نہیں اگر وہ یورپی اقوام میں ضم ہو جائیں۔"

گویا مصری ذہنیت مغربی ہے، مصریوں کے رسم و رواج یورپی ہیں اور مصر کی وابستگی، عالم عرب عالم اسلام کی نسبت یورپ سے زیادہ ہے۔ اسی طرح اس کی ثقافت پر اسلامی ثقافت کی بجائے یونانی اور یورپی رنگ غالب ہے اور مصریوں کے اعلیٰ مثالیے، یورپی مثالیے ہیں۔ ان کی مادی اور روحانی زندگی بھی خالص یورپی ہے، مصنف چاہتا ہے کہ مصری یورپ میں "غرق" ہو جائیں اور لفظی، معنوی، حقیقی اور مجازی طور پر اسی کا جزو بن جائیں۔ اس قول کے بعد مغرب پرستی کی دعوت دینے کے لیے کسی اور داعی کی ضرورت نہیں رہتی۔

تیسرا نقطۂ نظر، یا رجحان، یہ ہے کہ اسلام میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو اسے مغربی ثقافت سے ہم آہنگ کر سکیں، کیونکہ اس کے نزدیک اسلامی ثقافت اور اسلامی معاشروں کی بھلائی اسی تبدیلی میں ہے تاکہ اسلام عہدِ معاصر میں حقیقتِ حال کا سامنا کر سکے۔ اس رجحان کی بنیاد یہ احساس تھا کہ احکامِ شریعت کا استنباط اس انداز سے کیا جائے کہ وہ موجودہ دور کے مسائل و تنازعات کا حل پیش کر سکے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقلید پر شدید حملے ہونے لگے اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ پورے اسلامی قوانین پر کسی حد و قید کے بغیر نظرِ ثانی کی جائے ۔۔۔۔ اس طرح دروازے کے دونوں پٹ اہل و غیر اہل اور اہلِ ورع و اہلِ ہوس کے لیے یکساں کھول دیئے گئے، اور ایسی آراء کا اظہار ہونے لگا جس نے اسلام کو کسی ایک یا دوسرے سیاسی اور معاشرتی مکتبِ فکر سے منسلک کر دیا۔ یہ اندازِ بحث

Marfat.com

جدید مغربی تہذیب کی بدعت ہے۔ اس کے نتیجے میں تبدیلی اور اجتہاد کی دعوت نے آخر کار یہ شکل اختیار کی کہ پوری شریعتِ اسلامی ہی کو تبدیل کرنے کا تقاضا ہونے لگا تاکہ وہ اسلامی ثقافت کی اہم بنیادوں سے ہٹ جائے اور اسلامی قانون و ثقافت، مغربی تہذیب کے اس حد تک مطابق ہو جائے (یا کم از کم اس کے اتنے قریب پہنچ جائے) جو نص و اصول میں تاویل کی آخری حد ہو[۱]۔

ڈاکٹر محمد حسین کی رائے میں اسلام، اسلامی معاشرے اور اسلامی ثقافت کے لیے یہ رجحان دو طرح سے خطرناک ہے:

"ایک رُخ یہ کہ اجنبی نووارد نظریات کو ثابت کرتے ہوئے اور ان پر زور دیتے ہوئے، صحیح میں غلط کو داخل کر دیا گیا، جس سے اسلام میں ایسی خرابی پیدا ہوئی کہ اس کی اقدار درہم برہم ہو گئیں اور اس کا حقیقی مفہوم بگڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ زندگی کے مصائب مل جل کر جھیلتے رہے اور یہ جانتے تھے کہ وہ اس معاملے میں بے بس بنا دیئے گئے ہیں، مگر ان کا یہ حال ہو گیا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی اسلام ہے! اور اسی کے بعد کسی نے انہیں صحیح اسلام کی طرف لوٹانا بھی چاہا تو وہ اس بات کو ناپسند کرتے، اس پر جمود کی تہمت عائد کرتے اور اُسے مطعون کرتے کی وہ نص کی روح کی بجائے اس کے ظاہر سے چمٹا ہوا ہے۔"

تبدیلی کے نقصان کا دوسرا رُخ وہ ہے جو اسلام کے دشمن چاہتے ہیں، اور جو ان کی ثقافت اور تہذیب کا تقاضا ہے، وہ یہ کہ مسلمان ان تبدیلیوں سے ایسے پارہ پارہ ہو جائیں کہ اس کے بعد ان میں کبھی اتحاد پیدا نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کا ہر گروہ اور ہر جماعت ایسا الگ الگ مسلک اختیار کر لے گی جو دوسروں سے مختلف ہو۔ مرورِ ایام سے پھر ہمیں اسلامی، ترکی، ہندی، ایرانی اور عرب ثقافتیں ملیں گی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ محمد عبدہٗ اپنی تمام تر فضیلت اور اسلامی ثقافت کے لیے جلیل القدر خدمات کے باوجود اس مؤقف کی اور اس کے حامیوں کی حمایت پر آمادہ ہو گئے! اس موقع پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شیخ محمد عبدہ کی زندگی دو ادوار میں منقسم ہے: پہلا دور وہ جس میں وہ اپنے استاد جمال الدین افغانی کے پوری طرح ہمنوا تھے اور ان کی بیشتر آراء و افکار کا چرچا کرتے پھرتے تھے دوسرا دَور جمال الدین افغانی کی وفات کے بعد کا ہے جس میں مفتی محمد عبدہ نے اپنا الگ مؤقف اختیار کیا اور

Marfat.com

سیاسی اصلاح کے اس راستے سے ہٹ گئے جس پر ان کے استاد، معاشرتی اور ثقافتی اطلاع کی غرض سے گامزن تھے اور اس نئے راستے پر چل کر وطن پرستی کی طرف لے جانے میں مساہمت کرتے ہوئے اپنا وہ نیا طریقہ ایجاد کیا جس کے ذریعے وہ باصرار، اسلام کی تشریح اور اسلامی ثقافت کی مدافعت یہ کہہ کر کرتے کہ "اسلام تبدیلی اور تجدد کا مذہب ہے اور جدید تہذیب وتمدن سے کسی طرح بھی متعارض نہیں"۔ اسی بناء پر مفتی محمد عبدہ نے تقلید پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور اسلام میں اجتہاد اور تبدیلی لانے کی تلقین کرنے لگے۔ انہوں نے معاشرے میں عورتوں کی حیثیت پر نظرثانی کی اور کئی مسائل مثلاً پردہ، تعدد ازدواج پر بندش، طلاق کی آزادی پر پابندی، وطن اور قوم پرستی کی تبلیغ، ماقبل اسلام کی تاریخ پر اعتناء اور مغرب کا سیاسی نظام اختیار کرنے کی مساعی پر اظہارِ خیال کیا۔

اسلام میں تبدیلی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے مؤقف کے داعیوں میں سے ایک قاسم امین ہیں، جن کے نزدیک عورت کی حیثیت، وضع قطع اور معاشرتی روابط میں بالعموم ایسی تبدیلی ضروری ہے کہ وہ مغرب سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ان کے علاوہ علی عبدالرزاق اور سعد زغلول ہیں جنہوں نے وطن پرستی، قوم پرستی اور فرعونی دور کی تاریخ پر توجہ کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا اور مغرب کے سیاسی نظام کو اپنانے کی اس سبب سے تلقین کی کہ اسلام دین ہے، حکومت نہیں۔

مفتی محمد عبدہ کے اس مؤقف کا، اس نقطۂ نظر کے حامیوں نے سخت ناجائز استعمال کیا۔ ان کی پُشت پر یورپی تھے، مثلاً لارڈ کرومر، جنہوں نے مفتی محمد عبدہ کو سرسید احمد خاں سے تشبیہ دی۔ اور یہ جتایا کہ ان کی سیاسی زندگی اس بناء پر ہے کہ وہ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کے حامی ہیں اور وہ (اور ان کے شاگرد) اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی ہر طرح سے مدد اور حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ یہ لوگ مزاج کے اعتبار سے یورپی مصلحین کے جانشین ہیں!

مفتی محمد عبدہٗ، سعد زغلول، طٰہٰ حسین وغیرہ کی جو مثالیں ہم نے نقل کی ہیں، ہو سکتا ہے قاری انہیں ناقابل یقین سمجھے کیونکہ ہم نے اپنے ذہنوں میں ان کی جو تصویر بنا رکھی ہے، یہ باتیں مکمل ضد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانوں کا قد و قامت متعین کرنے پر ہمیں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بیشتر ایسے افراد جنہیں ہم موجودہ بیداری کی تحریک کے قائد سمجھتے ہیں، لوگوں کے خیال میں ویسے ثابت نہ ہوئے، اور اس کا سبب، بقول ڈاکٹر محمد محمد حسین، وہ غرض پرستانہ پروپیگنڈا ہے جو انہوں (یورپیوں)

Marfat.com

نے ارادتاً اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کہ ان کو یہ مقام و مرتبہ دے کر اپنے مسالکِ فکر اور اپنے خیالات کو راسخ اور متمکن کریں کیونکہ وہ اہم ذرائع ابلاغ جن پر استعماری طاقتوں اور عالمی صیہونیت کا قبضہ ہے، ایک خاص قسم کے مصنفوں اور مفکروں کی تشہیر کرتے رہتے جبکہ وہ ان مصنفوں اور مفکروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کے نظریات ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

مغربی ثقافت کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ آخری مؤقف جو مسلمانوں نے اختیار کیا، وہ ہے جو بڑی خود اعتمادی سے مغربی تہذیب کا مقابلہ کر رہا ہے اور جسے اپنے وسائل اور فنون پر بھروسا ہے کیونکہ یہ اپنی ثقافت کو دوسری ثقافت کے مقابل وہی امتیازی حیثیت دیتا ہے جو مذہب، فکر اور روح کو حاصل ہے کیونکہ اسی سے کوئی قوم، تہذیب، ثقافت اور تمدن کے معاملات میں دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس مؤقف کے حامی ایسا مضبوط جذبہ پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو بڑی جرأت اور قوتِ ایمانی سے مغربی تہذیب کا مقابلہ کر سکے۔ وہ تقلید کو ناپسند کرتے ہیں اور مظاہر کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ وہ اس اچھوتے راستے کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو اس ایمان کو جس کا سرچشمہ انبیاء و رسل پر اعتقاد ہے اور اس علم کو جو کسی ایک قوم یا ملک کی ملکیت نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے ہے، یکجا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک دین سے اچھے محرکات اور مغرب سے آلات اور فنی وسائل حاصل کرنے چاہئیں اور یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ لوگ مغربی تہذیب کو ایسا خام مواد سمجھتے ہیں جسے چاہیں تو مفید کام میں استعمال کریں اور چاہیں تو برے کام میں۔

یہ رجحان مغرب و مشرق کی خوبیوں اور روح و مادے کی طاقت کو یکجا کرنا چاہتا ہے اور ایک ایسا نیا راستہ ایجاد کرنا چاہتا ہے جس پر چلنا خود مغرب کے لیے سود مند ہے، کیونکہ وہ جسم و جاں، روح و مادے اور فرد و معاشرے کی تمام ضروریات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ کوشش بھی ہے کہ مسلمان کا یہ شعور ہمیشہ تازہ رہے کہ وہ زندگی میں ایک خاص عقیدے، پیغام، ثقافت اور اسلوب کا مالک ہے اور اس عقیدے اور پیغام کے ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہوں گے جب اس کے حامل اس کا مفہوم خود بھی اچھی طرح سمجھ لیں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔

یہ رجحان کئی مسلمان ملکوں میں نظر آتا ہے:

Marfat.com

ہندوستان میں ندوۃ العلماء نے واضح طور پر اپنے مقاصد کا اعلان کیا ہے :
"ایسی نئی سوچ کی تخلیق کی جائے جو قدیم و جدید کے محاسن کو یکجا کرے۔ یعنی وہ قدیم جو صالح ہے اور وہ جدید جو مفید ہے۔ اصول و مقاصد پر شدت اختیار کی جائے، لیکن فروغ و ذرائع میں وسعت اور لچک پیدا کی جائے۔"

پاکستان میں جماعتِ اسلامی نے اپنے مقاصد یوں بیان کیے ہیں :

(۱) ہمارا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے بالعموم، اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص ہے کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب مانیں۔

(۲) ہماری دعوت ان سب کے لیے ہے جو اسلام کو بطور دین قبول کرنے پر رضامند ہیں کہ وہ دین میں اللہ کے مخلص بندے بن جائیں اور اپنے آپ کو نفاق کے تمام شائبوں سے پاک، اور اپنے اعمال کو تضاد و تناقض سے بچائیں۔

(۳) ہماری دعوت روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے کہ وہ موجود نظام و اصول حکومت میں عمومی اصلاح کی ابتدا کریں جس نے ایسے طاغوتوں اور فاجروں کو ڈکٹیٹر بنا دیا ہے جنہوں نے زمین میں ہر طرف فساد برپا کر رکھا ہے اور ان لوگوں سے فکر و عمل کی قیادت چھین لیں تاکہ اللہ، رسولؐ اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والے لوگ اس کے مالک بن جائیں جو دین حق پر کاربند ہوں اور زمین میں اپنے ذاتی اقتدار و غلبے کی خواہش نہ رکھتے ہوں اور فساد کا باعث نہ بنیں۔

اس تحریک کے سربراہ سید مودودی (مرحوم) کے نزدیک ان مقاصد کا حصول صرف ان افراد کے ذریعے ممکن ہے جو اسلامی اخلاق پر ایمان رکھتے اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ تمام بنی نوع انسان کے لیے مساوی حقوق پر یقین رکھتے ہوں اور انسانی فطرت کے بنیادی جذباتی گوشوں کو ان مقاصد کے حصول کے لیے ناجائز طریقے سے استعمال نہ کریں۔

سعودی میں اسلام کی اصلاحی تحریک شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت سے شروع ہوئی جو مجتہد کبیر، ابن تیمیہ اور ان کی دعوتِ اصلاح سے سرتاسر متاثر تھے۔ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ صحیح کی طرف لوٹا جائے اور بدعات و خرافات کو، اور ہر اس بات کو جو اسلام اور

Marfat.com

اسلامی میں نو وارد ہے، ترک کر دیا جائے اور اسلام کے پاک وصاف سرچشمے یعنی قرآن، سنت، اور سلفِ صالح کے علم سے سیراب ہوا جائے۔ ان کی یہ تحریک عالمِ اسلام میں بیداری کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی جو اسلام کے صحیح اصولوں کی رہنمائی میں عمل، فساد کی بیخ کنی اور ایسی اسلامی مملکت اور نیک حکومت کے قیام کی طرف دعوت دیتی تھی جو اسلام کے اصولوں کے مطابق چلے۔ اس کے احکام کی پیروی کرے اور اس کے قوانین وحدود کو قائم کرے۔

ان تحریکوں میں، جنہوں نے اسلام، اس کی ثقافت اور امتِ مسلمہ کے مستقل اور ممتاز تشخص کی دعوت کو اپنا شعار قرار دیا، لیبیا کی سنوسی تحریک بھی شامل ہے۔ یہ تحریک محمد بن عبدالوہاب کے خیالات سے متاثر تھی، لیکن اس نے صوفی مسلک اختیار کیا۔ گو اس میں صوفیوں کے گمراہ فرقوں کی کج روی شامل نہ تھی۔ اس طرح موجودہ اسلامی معاشرے میں سنوسیوں نے ایک انوکھی تحریک کی ابتداء کی اور انہوں نے ایمان وعمل اور ذکر وسلوک کو ایسے خانقاہی نظام کے ذریعے یکجا کر دیا جہاں مومن جماعتیں تیار ہوتی تھیں، مگر فرق یہ تھا کہ ان خانقاہوں میں فرد ہاتھ پاؤں پر توڑ کر بے عمل نہیں رہتا۔ بلکہ کسی نہ کسی کارآمد اجتماعی مشغلے، مثلاً زراعت یا تجارت میں مصروف ہوتا ہے۔ خانقاہ خود کفیل ہوتی تھی۔ سنوسیوں نے اپنے مثبت رویئے اور نادر نظام کے ذریعے مسلمانوں کا ان کی ثقافت اور روایات وغیرہ پر، صرف دوبارہ اعتماد ہی بحال نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے اطالویوں کے جبر و استبداد کا اس ثابت قدمی سے مقابلہ کیا کہ اس کی مثال مزاحمت اور آزادی کی تحریکوں میں مشکل سے ملتی ہے

"الجزائر میں 'جمعیت العلماء الجزائری'" نے (جن کے قائد عبدالحمید بن بادیس اور ان کے بعد شیخ الابراہیمی تھے)، اور ان کے قائم کردہ مختلف اداروں نے (جن میں سے اہم قرآن کریم کے مدارس تھے) اس مؤقف کو اختیار کرنے میں سبقت کی۔ اس "جمعیت" نے مدارس کے ذریعے الجزائری قوم کی اصل ثقافت اور ان کے اسلام اور عربیت سے ربط وضبط کی حفاظت و ترویج کی۔

انڈونیشیا میں اس مؤقف کی حامی، سب سے مشہور جماعت "دارالاسلام" ہے۔ اسی طرح ترکی میں ہمیں "تحریک نوریہ" نظر آتی ہے جسے شیخ سعید النورسیؒ نے قائم کیا تھا۔

انہی تحریکوں میں سے ایک "اخوان المسلمین" کی جماعت ہے جو بلا استثناء تمام بلادِ عرب پر محیط ہے اور جو اس دور کی سب سے زیادہ جامع اور وسیع اسلامی تحریک ہے جس سے عصرِ حاضر کے مسلمان واقف ہیں۔ اس تحریک نے بڑی جرأت اور پامردی سے مغربی تہذیب و ثقافت پر تنقید کی اور اس

Marfat.com

کا منہ در منہ سامنا کیا اور بطور "حملہ آور" مبلّغ کے، مغرب کا مقابلہ کیا۔ یہ مؤقف ایسے گہرے مطالعے اور ایسی انتھک جدوجہد کا تقاضا کرتا تھا جو بہت ہی مربوط اور پختہ ہوں۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب کی فطرت اور ساخت سے بھی گہری واقفیت کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ، اسلام، اس کے نظاموں، اسلوبوں اور ثقافتِ اسلامی کے لیے بڑا جرأت مندانہ اقدام درکار تھا۔ اس کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ مؤقف اختیار کیا جائے جو مشہور سیاسی لیڈر جمال الدین افغانی کے مؤقف سے، اور اسلامی ثقافت کے "وکیل دفاع" محمد عبدہ کے مؤقف سے مختلف ہو، جنھوں نے اسلامی اور مغربی ثقافت میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا تجزیہ عرصۂ دراز سے شروع ہے۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ان میں امیر شکیب ارسلان ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب "لِمَاذَا تَأَخَّرَ الْمُسْلِمُوْنَ وَتَقَدَّمَ غَيْرُهُمْ" (مسلمانوں کی پسماندگی اور غیروں کی سبقت کے اسباب) میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ:

"ہر پرانی چیز قابلِ ترک اور ہر نئی چیز قابلِ قبول نہیں، بلکہ ہونا یہ چاہیئے کہ علم میں اور عمل میں بہترین چیز کو اختیار کیا جائے اور اس سے صرفِ نظر کیا جائے کہ فلاں چیز جدید ہے اور فلاں قدیم۔"

ان کی رائے میں مغرب سے استفادہ کرنے کی تحریک اپنی ذات میں کوئی خطرناک بات نہیں لیکن مغربی ثقافت کو اس کی برائیوں سمیت اختیار کرنا نقصان دہ ہے۔ امیر ارسلان کہتے ہیں:

"مغرب نے مشرق پر سرداری کی اور اس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مشرق کے لوگوں نے خود محسوس کیا کہ وہ گھر گئے ہیں اور مغرب سے آنے والوں کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ مغرب سے نجات پانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اعلان کیا: ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس (مغرب) کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کریں جو اس کی کامیابی کا باعث تھے اور چونکہ مغربی ثقافت ہی یورپ کا وہ ہتھیار تھا جس کی بنیاد زیادہ تر سائنسی علوم تھے جن کی بدولت مغرب پانی اور بجلی کی تسخیر پر قادر ہوا، اس لیے انھوں نے (مشرقیوں) کہا کہ ہمارے لیے اس ثقافت کو اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

Marfat.com

اس کے بعد امیر ارسلان کہتے ہیں:

"یہ بھی خطرے کی بات نہ تھی، لیکن خطرہ اس میں ہے کہ ہم اس (مغربی) ثقافت کو پورا سے کا پورا اختیار کر لیں اور اس کی جملہ برائیوں سمیت اُسے لے لیں اور اس کے تمام مادی و روحانی نظریات بلا استثناء اپنا لیں"۔

آخر میں امیر شکیب ارسلان کہتے ہیں کہ علم سے استفادہ الگ چیز ہے اور شخصیت سے محرومی الگ چیز۔ یورپی علوم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی اصل نسل کو بھلا دیں اور اس کی وجہ سے اپنی قومیت سے انکار کر دیں۔ ان علوم کو حاصل کرنا، اور اپنے اسلام اور عربیت پر قائم رہنا بیک وقت ممکن ہے۔ اس سلسلے میں وہ جاپانیوں کی مثال دیتے ہیں جو تمام علوم اپنے وطن لے گئے اور ان میں ان کے "موجدوں" سے بھی بڑھ گئے، مگر جاپانی ہونے سے انکار نہ کیا۔ خود فرنگیوں کا یہی حال ہے انہوں نے مشرق سے تمام علوم اپنے ہاں منتقل کیے مگر مشرقی بننے سے ابا کرتے رہے۔

مغربی تہذیب و ثقافت پر تنقید کرنے والوں میں مشہور مسلم مفکر اقبال بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید میں کہا کہ مغربی تہذیب سے مبہوت ہونے اور چندھیا جانے کے باعث اس کی طرف مائل ہونے کی ترغیب پیدا ہوئی، لیکن بعد میں جب یہ مرعوبیت ختم ہوئی اور بے شمار مسلمان یورپ میں تعلیم حاصل کرنے گئے تو اُن پر مغرب کی زندگی کے اسرار منکشف ہوئے اور ان میں بے شمار لوگ اس تہذیب کے مستقبل سے مایوس ہو کر، اور اس کے نکتہ چیں بن کر لوٹے۔

اقبال نے اپنی کتاب "اسلام میں فکرِ دینی کی تجدید" میں تہذیب مغرب پر نکتہ چینی میں وہ معنی آفرینی کی ہے کہ وہ اسلام کے سب مفکرین اور فلسفیوں سے اس معاملے میں سبقت لے گئے۔

اقبال کی رائے میں جملہ سیاسی، فکری اور اقتصادی نظریات، جنہوں نے تہذیب مغرب سے جنم لیا، خواہ وہ "سرمایہ دارانہ ہوں یا اشتراکی، سب کے سب گمراہی، ہوسناکی، بے اطمینانی اور اضطراب کا نتیجہ اور خدا سے غفلت اور انسانیت سے فریب کے مرتکب ہیں، اشتراکیت، علم، دین اور اقدار کی دشمن ہے اور سرمایہ داری زندوں کے جسموں سے روح کھینچ لیتی ہے اور مزدوروں اور غریبوں کے منہ کا نوالہ چھین لیتی ہے۔ گویا دونوں نظام ہی مادے میں غرق ہیں۔ ان کے جسم تو توانا اور چمکدار ہیں لیکن دل تاریک اور گنہگار ہیں۔ چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر!

اقبال کی رائے میں یورپ جس علم و حکمت کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ محض کھوکھلا ڈھانچہ ہے

Marfat.com

جس کے پیچھے ان کے مشتبہ عزائم پوشیدہ ہیں۔ انہوں نے کہا:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اسی لیے علامہ اقبال اس دور کے مسلمانوں کو ہم عصر مغربی افراد کی طرح نہیں دیکھنا چاہتے، کیونکہ مغرب کا انسان "اپنے تمام تنقیدی فلسفوں اور سائنسی تحقیق کے باوصف، ورطۂ حیرت میں ہے۔ اس کے فطری مذہب نے اُسے فطرت کی طاقتوں پر حکمرانی تو عطا کر دی لیکن اس دور میں اس کا ایمان و یقین جاتا رہا۔

آخر میں اقبال نئے دور کی نوید دیتے ہیں، جس میں پرانی بنیادیں ختم ہو جائیں گی اور یہ مادّی زندگی اور سوداگری دم توڑ دے گی:

"زمانہ نئے دَور کو جنم دے گا۔ وہ پُرانا دَور جسے مغرب کے باسیوں نے قمار خانہ بنا دیا اور جس میں امنِ عالم اور قوموں کا ذخار داؤ پر لگا دیا، اب نزع کے عالم میں ہے۔"

بے شمار مسلم مفکرین جو اس مؤقف کے حامی ہیں، مغربی ثقافت پر تنقید اور اسلامی ثقافت پر دوبارہ اعتماد اور اس کے اصل سرچشموں کی طرف رجوع پر متفق ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیل سے ان کے خیالات پیش نہیں کر سکتے، لیکن اگر کوئی قاری اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہو تو اسے ان تصنیفات کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے:

سید قطب شہید	: خصائص التصور الاسلامی و مقوماته۔ المستقبل لهذا الدين۔ العدالة الاجتماعية فی الاسلام۔ معالم فی الطريق۔
حسن البنا شہید	: مجموعۂ خطوط۔
مولانا سید مودودی	: تجدید احیائے دین۔ مسلمانوں کی سیاسی کشمکش۔ اسلام اور مغربی تہذیب۔
مالک بن نبی	: وجهة العالم الاسلامی۔ مشكلة الثقافة۔ فكرة كومنولث الاسلامی۔ آفاق جزائرية۔ المعركة المفاهيمية فی البلدان المستعمرة۔
علی سامی النشار	: مناهج البحث عند مفكری الاسلام۔ نشأة الفكر الفلسفی فی الاسلام
امیر شکیب ارسلان	: لماذا تأخر المسلمون و تقدم غيرهم

Marfat.com

مولانا ابوالحسن ندوی : ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین۔ الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والغربیۃ۔

ڈاکٹر محمد البہی : الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی۔

ڈاکٹر محمد محمد حسین : الاتجاھات الوطنیۃ فی الادب المعاصر۔

مصطفٰے صادق الرافعی : المعرکۃ بین القدیم والحدیث۔

محمد الخضر حسین : نقض کتاب فی الشعر الجاھلی

ڈاکٹر مصطفٰے السباعی : من روائع حضارتنا۔

ان کوششوں کا اثر ہوا اور ان کی بدولت اپنی ذات پر بھرپور اعتماد کا رجحان پیدا ہوا جبکہ ان سے پہلے مسلمانوں کا احساس کمتری اور اپنی شخصیت کے اظہار کا فقدان، شرمناک حدوں کو چھو رہا تھا یہاں تک کہ ڈاکٹر طٰہ حسین کو زبان وادب پر اپنا خطاب "الحمد للہ" اور نبی کریمؐ پر درود وسلام سے شروع کرنے پر یہ کہہ کر معذرت کرنا پڑی:

"میرے حاضرین میں سے کچھ افراد اس خطاب کو خدا کی حمد اور نبیؐ پر صلوٰۃ سے شروع کرنے پر شاید مضحکہ خیز سمجھیں کیونکہ یہ زمانے کے معمول اور روش کے خلاف ہے"۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد ہم عرب اور اسلامی ممالک میں موجودہ اسلامی تحریک کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ درج ذیل مقاصد حاصل کرنے کے قابل ہو گئی:

(۱) مسلمانوں کا اپنے پیغام، ثقافت، تاریخ اور مستقبل پر دوبارہ اعتماد۔

(۲) اسلامی اقدار پر دوبارہ بھروسہ اور ان کے گرد بُنے ہوئے شکوک وشبہات کے جالوں کی صفائی۔

(۳) اسلامی ثقافت کی اس خوابِ غفلت سے بیداری جو مسلمانوں کی زندگی پر اس دور تک طاری تھی۔ اب مسلمان اپنے گزشتہ کل اور آج کے درمیان تذبذب کا شکار نہیں۔

(۴) ایسے افکار کی تشکیل جو غور وفکر اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں اور صرف ایک قدر، یعنی اسلام کی قدر پر یقین رکھتے ہیں۔

(۵) اسلام کو بذاتِ خود طاقت اور "خود مقصدیت" کی حیثیت سے سامنے لانا، اور اسی طرح اُسے زندگی میں بھی توانائی کا منبع سمجھنا۔

(۶) اسلامی ممالک میں اس مضبوط رجحان کی تعمیر، جس کے ذریعے مسلمانوں کے اسلامی تشخص، امتیازی شان اور آزادی کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: الاستاذ ابوالحسن ندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والغربیۃ۔

۲۔ ایضاً

۳۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کے بارے میں مصنف کے خیالات قطعی نہیں کہے جا سکتے اور شاید کسی غلط فہمی یا سطحی معاملے کا نتیجہ ہیں۔ سرسید کے افکار اور تحریک نیک نیتی پر مبنی تھی اگر نتائج غلط نکلے تو سرسید کا قصور نہیں۔ اس کے علاوہ مالی امداد کمی عامۃ المسلمین نے زیادہ کی لیکن انگریزوں سے معاونت کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ (مترجم)

۴۔ آلدکتور محمد حسین: الاتجاھات الوطنیۃ فی الادب العربی المعاصر۔

۵۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے بعد میں چند کتابیں اور مضامین ایسے تحریر کیے جن سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ آخر میں اس نقطۂ نظر سے "تائب" ہو گئے۔

۶۔ ڈاکٹر محمد محمد حسین؛ الاسلام والحضارۃ العربیۃ۔

Marfat.com

اسلام کی آفاقیت اور انسان دوستی

اسلام اس لیے آیا کہ مختلف معاشروں، حالات اور مراحل زمانی میں آسمان کا رابطہ زمین سے ہو جائے اس لیے یہ تمام انسانوں کے لیے دعوتِ عام ہے اور کسی ایک امت، زمانے یا معاشرے سے مختص نہیں، نہ اللہ کی راہ میں اس کی دعوت کسی خاص قوم کے لیے ہے۔ اسلام کی دعوت عربوں کے علاوہ دوسروں پر بند نہیں، بلکہ یہ تو ساری نوعِ بشر کے لیے ہے۔ اس بات کی وضاحت رسول کریمؐ سے قرآن کے خطاب سے، اور قرآن کے بارے میں آپؐ کے قولِ مبارک سے ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن ہی اسلام کا پیغام ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما ارسلنک ...... بشیرو نذیرا" (سبا: ۲۸)

وارسلنک ...... شہیدا۔ (النساء: ۱۰۵)

یہ آیات اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ رسولؐ کو پوری انسانیت کی طرف مبعوث کیا گیا جس جس قرآن سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے:

ھذا بیان ...... للمتقین (آل عمران: ۱۲۸)

انا انزلنا الیک ...... بما اراک اللہ (النساء ۷۹)

وقرآنا ...... تنزیلا (الاسراء: ۱۰۶)

ان آیات کی روشنی میں کسی قوم کے لیے مناسب نہیں کہ وہ باقی سب اقوام کو چھوڑ کر قرآن کو اپنے لیے مخصوص کر لے، کیونکہ اللہ نے اسے سب انسانوں کے لیے "بیان" اور "میزانِ حکم" قرار دیا ہے کہ اپنے

Marfat.com

امور و معاملات میں اسی سے رجوع کریں۔

یہ آفاقیت سارے انبیا کی دعوت کی صفت رہی ہے اور حضورؐ سے پہلے بھی انبیا کسی ایک امت ہی سے مخاطب نہ تھے، نہ ان کا پیغام کسی ایک امت ہی سے مخصوص تھا، اگرچہ بعض اوقات کسی ایک امت میں کئی رسول بیک وقت مبعوث ہوئے۔ قرآن نے فرمایا:

وانزل التورٰة ...... الناس (آل عمران: ۴-۳)

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک سب ہی نوع انسان ایک ہی وحدت تشکیل دیتے ہیں اور ان کے مختلف گروہوں، فرقوں یا افراد میں ان کی اصلیت، فطرت یا انجام کے لحاظ سے کوئی وجہ امتیاز نہیں کیونکہ سب انسان ایک ہی اصل سے پھوٹے ہیں۔

یاایھاالناس ...... نفس واحدۃ (النساء: ۱)

یہی "نفس واحدہ" تحقیق و تجربے کے بعد مذکر و مؤنث کا منبع ہے۔

یاایھا الناس ...... ذکر و (الحجرات: ۱۳)

اور پھر ان کا منبع ایک "باپ" ہے جو مٹی سے پیدا ہوا

جیسا کہ رسول کریمؐ نے فرمایا:

"لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے ہیں۔ تم سب میں زیادہ پرہیزگار ہی سب سے معزز ہے کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو گورے پر اور گورے کو کالے پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت حاصل نہیں۔" (متفق علیہ)

انسان کی فطرت ایک ہے، جس میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ انسان کو مٹی سے تخلیق کرے اور اس میں اپنی روح پھونکے:

واذقال ...... فقعوالله ساجدین (ص: ۷۲-۷۱)

انسان کی یہ فطرت ایک ہے، خواہ اس کا تعلق زمین کے کسی خطے سے ہو اور اس کی زیب و زینت، مال و متاع اور خواہشات کیسی ہی کیوں نہ ہوں:

زین الناس ...... الحیاۃ الدنیا (آل عمران: ۱۴)

خیر و شر، صلح و فساد وغیرہ کی استعداد کے لحاظ سے بھی یہ فطرت ایک ہے:

Marfat.com

ونفس وماسواها...... من وساها (الشمس: ۱۰-۷)

نعمتوں سے کفران وانکار اور شکر سے نفور کے لحاظ سے بھی ایک ہے:

ولکن ..... لایشکرون (البقرہ: ۲۴۳)

وان کثیرا ...... لنا (المائدہ: ۴۹)

ولکن اکثر ...... لایومنون (الرعد: ۱)

پھر ان کی خلعت اور انجام بھی ایک ہے۔ ہر نفس کو جان دینی ہے اور ساری انسانیت کو فنا ہونا ہے، اس کے بعد حشر نشر اور حساب کتاب ہوگا جس کے نتیجے میں دائمی جنت یا دوزخ کی آگ ملے گی۔

کل نفس ...... یوم القیامۃ (آل عمران: ۱۸۵)

واتقوا یوما ..... نفس شیئاً (البقرہ: ۴۸)

ان آیات کے علاوہ، اس وحدت کی یکساں ابتدا اور انجام پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول کتنا بلیغ ہے:

وخلقکم ...... کنفس واحدۃ (لقمان: ۲۸)

چونکہ انسانیت اپنی اصل، فطرت اور انجام کے لحاظ سے جو اسے پیش کر رہے گا، ایک ہے اس لیے لازماً اس کے لیے ایک ہی "پیغام" ہونا چاہیے تھا۔ اس کے فرائض بھی یکساں ہونے چاہئیں، اور اس سے خدائے واحد کی عبادت ہی کا تقاضا ہونا چاہیے، تاکہ اس کائنات اور دنیاوی زندگی سے لوگ یکساں لطف اٹھائیں، اس کی نشانیوں میں غور کریں اور آخرت اور دائمی زندگی کا راستہ اختیار کرنے پر سوچ بچار کریں۔

اس باعث قرآن نے کائنات اور دنیاوی زندگی کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے تمام انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی:

ان فی خلق ...... لآیات (آل عمران: ۱۹۰)

اور اسی وجہ سے اس نے تمام انسانوں کو اس کائنات کے خالق اور کارساز ہی کی عبادت کا حکم دیا:

یاایھا الناس ...... من قبلکم (البقرہ: ۲۱)

اور اسی سبب سے اس کی دعوت سب کے لیے تھی کہ جو کچھ اللہ نے ان کے لیے پیدا کیا ہے اس سے حظ اٹھائیں۔

یاایھا الناس ...... حلالاً طیبا (البقرہ: ۱۶۸)

Marfat.com

سب لوگ ان تمام معاملات میں ایک امّت ہیں اور اس کی تاکید قرآنِ کریم کر رہا ہے:

کان الناس امۃ واحدۃ (البقرہ: ۲۱۳)

وماکان ...... فاختلفوا (یونس: ۱۹)

وہ واحد میدان جس میں لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جاسکتے ہیں رسالت اور اس کے قبول کرنے، اس سے نسبت اور اس کے عمل کرنے میں ہے۔

کنتم خیر امۃ...... تومنون باللہ (آل عمران: ۱۱۰)

وکذلک جعلنا ...... شہیدا (البقرہ: ۱۴۳)

اس طرح اسلام ان تمام اسباب کی، جو لوگوں کو اسلام کا پیغام قبول کرنے سے مانع ہوں، یا ان میں کسی معقول بنیاد کے بغیر امتیاز و فوقیت کا باعث ہوں، نفی کرتا ہے۔ امتیاز و فوقیت کا وہ اہم سبب، جس کو اسلام پسند نہیں کرتا، رنگ و نسل، جنس و قوم کا تعصب ہے اور ہم تعصبات کی تمام اقسام کے بارے میں رسالتِ محمدیہ کا موقف مختصر طور پر پیش کرتے ہیں۔

رنگ کا تعصب

رنگ کی وجہ سے امتیاز کی، اسلام جیسے عقیدے میں، جو انسانیت کی وحدت پر ایمان رکھتا ہو، کوئی جگہ نہیں۔ اس میں "نیلے"، یا زیادہ "پاک" خون کو فوقیت دینے کی کوئی گنجائش نہیں جس نے لوگوں کو مختلف گروہوں اور طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس میں اس جنس کے لیے بھی "تعلقت طبیعی" ہونے سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں جو سفید فام ہونے کی دعویدار ہے اور جس میں انسان دوسرے کو حقیر سمجھتا ہو۔

"وہ تہذیب جس میں کوئی رنگ یا نسل دوسروں پر فوقیت نہ رکھتی ہو، ہر عقلمند اور زیرک انسان کے نزدیک باعثِ سعادت ہے، اور اسی میں خوش اطوار اور پاکیزہ اخلاق انسانیت کی بھلائی ہے۔ وہ تہذیب جس میں کسی سفید فام کو عزت اور سیاہ فام کو ذلت نصیب ہو، یا سفید رنگت والے کامیاب اور ان سے سواد دوسرے ناکام ہوں جاہلانہ تہذیب ہے جسے انسان ہزاروں برس پیچھے چھوڑ آیا ہے کہ یہ کور نظری، تکبر، جہالت اور حماقت کی علامت ہے۔"[14]

Marfat.com

آنحضرتؐ کا یہ قول کتنا عمدہ ہے جو اس قسم کے عقائد سے متعلق ہے:

"تم ایسے انسان ہو جس میں جاہلیت (کے آثار) ہیں۔"

یہ بات حضورؐ نے ایک جلیل القدر صحابی کو دوسرے مسلمان کو "یا ابن الفر " (اے حبشن کے بیٹے) کہہ کر عار دلانے پر فرمائی۔ آپؐ کا یہی قول علم اور جہالت، تہذیب انسانی اور تہذیب جاہلی میں حد فاصل ہے۔

اسلام کا اس بارے میں نظریہ محض نظریہ یا صرف دعوت ہی نہیں جسے عمل سے کوئی تعلق نہ ہو اس نظریے کو بے شمار موقعوں اور مقاموں پر نافذ کیا گیا اور اس پر اب بھی عمل کیا جا رہا ہے، مثلاً مسجد میں سفید فام اور سیاہ فام دونوں ایک ہی خاک پر اللہ عزوجل کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے آگے گڑگڑاتے ہیں۔ اسی طرح حج کے موقع پر ساری انسانیت سے رنگا رنگ عناصر ایک ہی مقام پر جمع ہوتے ہیں، ایک ہی لباس میں ہوتے ہیں جس میں گورے یا کالے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، نہ گورے کو کالے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نظریہ انسانیت اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن، بلال حبشیؓ کو کعبہ میں اذان دینے کا حکم دیا کہ وہ لوگوں میں کلمۂ حق کا اعلان کریں۔ کعبہ تو عربوں کے نزدیک جاہلیت میں بھی سب سے معزز گھر تھا اور اسلام نے اسے مومنوں کا قبلہ قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بلالؓ کو، جن کی رنگت سیاہ تھی، جملہ مسلمانوں میں سے کعبہ مشرفہ پر چڑھ کر اذان دینے کے لیے منتخب فرمایا، حالانکہ ان میں قریش کے شرفا اور سردار بھی موجود تھے آپؐ کا یہ عمل اس بات کا اعلان تھا کہ انسان کو شرف اس کے علم اور اخلاق کی وجہ سے ہو سکتا ہے، چہرے کی ساخت یا رنگت سے نہیں۔

تاریخ اسلام میں اسلامی تہذیب کی انسان نوازی اور مختلف جنسوں، عناصر اور رنگوں میں مساوات کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ان میں بڑے بڑے سپہ سالار، علماء کبار اور حاکم گزرے ہیں جن کے آگے لوگ سر تسلیم خم کرتے تھے اور بڑے بڑے قاضی وغیرہ تھے جن کی مثال ہمارے زمانے کی کسی تہذیب میں، جیسا کہ مثلاً امریکی تہذیب ہے مشکل سے ملے گی ــــــ اور ہماری تہذیب نے یہ کارنامہ چودہ سو برس قبل سرانجام دیا تھا۔

....

ڈاکٹر مصطفٰے السباعی مرحوم نے اپنی گرانقدر کتاب "من روائع حضارتنا" (ہماری تہذیب کے شاندار کارنامے) میں لکھا ہے: "کہ جب مسلمان مصر میں فاتح بن کر داخل ہوئے اور بابلیون کی فصیل کے باہر آٹھہرے تو مقوقس نے مسلمانوں سے مذاکرات کی خواہش کی۔ اس نے ان کے پاس اپنا وفد یہ جاننے کے

Marfat.com

سمجھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور انہیں بھی اپنا وفد اپنے پاس بھیجنے کو کہا۔ عمرو بن العاص رضؓ نے دس افراد کا ایک وفد روانہ کیا جس میں عبادۃ بن الصامت بھی تھے، عبادہ بے حد سیاہ فام اور اونچے لمبے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان کا قد دس بالشت ہے۔ عمرو بن العاص نے انہی کو گفت و شنید کرنے کا اختیار دیا۔ جب مسلمانوں کا وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا تو عبادہ آگے آگے تھے۔ مقوقس ان کی سیاہ رنگت سے حیرت زدہ ہو گیا اور کہا: اس حبشی کو ہٹاؤ اور کسی اور کو مجھ سے بات چیت کے لیے آگے کرو۔ وفد کے سب ارکان نے یک زبان ہو کر کہا: یہ حبشی اپنی رائے اور علم کے لحاظ سے ہم سب سے افضل ہے وہ ہم سے بہتر ہے اور ہمارا قائد ہے اور ہم سب اس کی رائے اور قول کے پابند ہیں۔ ہمارے امیر نے ہم سے قطع نظر اس کو حکم دیا ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ اس کی رائے اور قول کی مخالفت نہ کریں۔ مقوقس نے کہا: تم لوگ اس سیاہ فام کو اپنا سردار ماننے پر کس طرح راضی ہو گئے؟ یہ تو تم سے کمتر حیثیت کا ہونا چاہیئے۔ وفد نے کہا: ہرگز نہیں، اگرچہ یہ تمہاری نظر میں سیاہ فام ہے مگر اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہم سے افضل ہے اور پیش قدمی، عقل اور رائے کے لحاظ سے بھی ہم سے بہتر ہے، ہم میں رنگت کی سیاہی باعثِ عار نہیں۔ مقوقس نے عبادہ سے کہا: اے سیاہ فام آگے بڑھ اور مجھ سے آرام سے بات کر کیونکہ تمہاری سیاہ رنگت سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر تم نے سخت کلامی کی تو تمہاری دہشت میں اضافہ ہوگا۔ عبادہ نے سیاہ رنگت سے مقوقس کے خوف کو دیکھتے ہوئے کہا: ہمارے لشکر میں ایک ہزار سیاہ فام ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ کالے ہیں!

یہ تو دور کی بات ہے، اس بیسویں صدی کے "مہذّب" افراد بھی، رنگت کی سیاہی کو نقص تصوّر کرتے ہیں اور سیاہ فاموں کو ان مناصب کا اہل نہیں سمجھتے جس پر گورے فائز ہیں۔ ہماری تہذیب ان تمام مفسدات کو پارہ پارہ کرتی اور ان خیالات کو باطل قرار دیتی ہے اور برتری کی ان تمام اقسام کی نفی کرتی ہے جو چہرے کی رنگت یا خون کے اختلاف پر زور دیتی ہیں اور ببانگِ دہل اعلان کرتی ہے کہ سیاہ فام کو زیادہ عالم، زیادہ صائب الرائے اور زیادہ جری ہونے کی وجہ سے سفید فام پر سبقت حاصل ہے۔ گورے اور کالے میں کی ہماری تہذیب تائید کرتی ہے نہ اس کو تسلیم کرتی ہے۔ تاریخ اسلامی میں کہیں کسی ایسے اسلامی معاشرے کا ذکر نہیں ملتا جو صرف فاموں پر محدود ہو اور سیاہ فام اس کے رکن نہ ہوں، نہ کسی ایسے واقعے کا تذکرہ ملتا ہے جس میں انسان پر رنگت کی وجہ سے ظلم ہوا ہو، کیونکہ ہماری تہذیب میں سیاہی اور سفیدی کا تعلق اعمال سے ہے، رنگت سے نہیں۔

Marfat.com

تہذیبِ جدید کو ماضی کی تمام معروف تہذیبوں سے زیادہ شہرت ملی ہے کیونکہ اس نے لوگوں میں اُخوت اور مساوات کے اصول قائم کیے ہیں اور اقوامِ متحدہ نے "یُو ایمثاقِ حقوقِ انسانی" کا اعلان کر کے نظری طور پر جملہ اختلافاتِ رنگت و نسل کو ختم کر دیا ہے اور سب انسانوں کو یکساں حقوق دیئے ہیں، مگر دنیا میں اب بھی رنگت کی وجہ سے بنیادی امتیازات بدترین شکل و صورت میں موجود ہیں۔

امریکہ میں، جو حریت اور علم کی مملکت کہلاتی ہے اور انسان کو چاند پر پہنچانے کی دعویدار ہے، اب بھی تاریخِ انسانی کی بہت بڑی لعنت موجود ہے، یعنی حبشیوں پر ظلم و تشدد، اور سیاہ فاموں پر ان تمام عہدوں اور مراتب کے حاصل کرنے پر پابندی، جو صرف سفید فاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ باوجودیکہ سیاہ فاموں کو اس ملک کا شہری سمجھا جاتا ہے جو تہذیبِ جدید کی علمبردار ہے، مگر عملی طور پر انہیں شہریوں کے وہ حقوق حاصل نہیں جو سفید فاموں کو ہیں۔ کسی سفید فام سیاستدان نے اس کے بارے میں کہا تھا۔

"کسی بھی سیاہ فام کے لیے، خواہ اس کا دل سیاسی مساوات سے لبریز ہو، جنوبی ریاستوں میں کوئی مقام نہیں کیونکہ یہ علاقے سفید فاموں کی ملکیت ہیں اور یونہی رہیں گے۔" [۳۳]

سیاہ فاموں پر ظلم و ستم کے مظاہر سے امریکہ میں ہر میدان میں نظر آئیں گے، مثلاً مدارس میں اور بالخصوص جنوبی ریاستوں کے مدارس میں، گوروں اور کالوں میں مکمل انفصال ہے اور سیاہ فاموں کے بچوں کو سفید فام بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر فرقے کے لیے الگ سکول اور الگ کتب ہیں۔ بعض مدارس میں امریکی حکومت کے احکام کو چیلنج کیا اور سپریم کورٹ کے ان احکام کو کہ گورے اور کالے ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں، ماننے سے انکار کر دیا۔ امریکی حکومت سیاہ فاموں کی بچوں کی حفاظت کے لیے فوج بھیجنے پر مجبور ہو گئی تاکہ سپریم کورٹ کا حکم نافذ کیا جا سکے۔ سفید فاموں کا نعرہ تھا: سیاہ فاموں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا بائیکاٹ!

اس پر ریل گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور ہسپتالوں کو قیاس میں کیا جا سکتا ہے، جہاں سیاہ فاموں سے امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ بعض ریاستوں کے قوانین کی رُو سے سیاہ فام کارکنوں کے لیے سفید فام مزدوروں کے ساتھ کارخانوں میں کام کرنا منع ہے، بلکہ وہ اُن دروازوں کو بھی استعمال نہیں کر سکتے جو سفید فاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ کئی ریاستوں میں گوری عورتوں کو سیاہ فام مردوں سے یا اس کے برعکس شادی کرنے کی اجازت نہیں، اور اگر ہو جائے تو اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ سیاہ فاموں اور سفید فاموں کی عبادت گاہیں بھی الگ الگ ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی سیاہ فام جس کا تعلق

Marfat.com

جمہوریہ پاناما سے تھا، واشنگٹن کے کیتھولک چرچ میں عبادت کے لیے گیا۔ وہاں کے ایک پادری سے یہ برداشت نہ ہوا اور اس نے عبادت میں مشغول سیاہ فام کے بند ہاتھوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیا جس پر سیاہ فاموں کے لیے مخصوص گرجے کا پتہ درج تھا۔ پادری نے کہا کہ جب ان لوگوں کے لیے گرجے مخصوص ہیں تو انہیں دوسروں کی عبادت میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے[4]

افریقہ میں اس کی دردناک مثالیں ملتی ہیں اور وہاں نسلی امتیاز اتنا شدید ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں تو سفید فام اقلیت، سیاہ فام اکثریت کو غلام بنائے ہوئے ہے، اور وہ ملک ہی کو نہیں وہاں کے عوام کو بھی اپنی جاگیر سمجھتی ہے اور پسی ہوئی اکثریت کو انسانی اور ملکی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہی صورت حال روڈیشیا، انگولا اور موزنبیق وغیرہ میں ہے۔

شاید آپ یہ کہیں کہ تو دنیا کے صرف مغربی علاقوں کا حال ہے۔ مشرقی ممالک میں صورتحال کیا ہے؟ مثلاً سوویٹ روس اور یورپ کے دوسرے اشتراکی ممالک کا طرز عمل کیا ہے؟

اشتراکی ممالک غیر اشتراکی پر امتیاز رنگ و نسل کے سبب لعن طعن تو بہت کرتے ہیں اور وہاں عدم مساوات کی مذمت بھی کرتے ہیں جس کی بنا پر افریقہ کے نو آزاد ممالک کے بے شمار طلبہ روس اور اس کے حلیف ممالک کی درس گاہوں میں داخلہ لیتے ہیں تاکہ وہاں کی نام نہاد مساوات اور حریت کا چرچا ہو، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ان ممالک میں بھی بنیادی امتیازات کی دیوار کھڑی ہے جب افریقی طلبہ نے اس پر احتجاج کیا تو اشتراکی طلبہ بگڑ گئے اور کہنے لگے: بندر کے بچو! تم اپنے جنگل میں لوٹ جاؤ۔"[5] ایک مصری صحافی نے اپنے سامنے پیش آنے والا واقعہ بیان کیا ہے (اور اس واقعے سے پیشتر وہ کٹر اشتراکی تھا)۔ وہ کہتا ہے:

"۱۹۵۸ء میں، میں چیکوسلواکیہ میں مقیم تھا اور مہینے میں دو تین دن ہسپتالوں میں خدمت سرانجام دیتا تاکہ کچھ جیب خرچ نکل آئے۔ اس کام میں میرے کپڑے خون آلود ہو جاتے اور میں انہیں سرکاری لانڈری کے حوالے کر آتا، جو ارزاں تھی۔ اس لانڈری کی نگران ایک بوڑھی عورت تھی (ان کاموں میں جوانوں کو نہیں لگایا جاتا) میرے اور اس کے درمیان علیک سلیک ہو گئی، جسے میں اپنے لیے اعزاز سمجھتا، حالانکہ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ خاصی قبیح تھی مگر اس کا حسن سلوک اس کی بدصورتی کی پردہ پوشی کر دیتا۔ میں وہاں کی زبان روانی سے

بول لیتا تھا مگر چار ماہ بعد اس نے انکشاف کیا کہ میرے چہرے مہرے سے وہ مجھے انگریز سمجھتی رہی کیونکہ میں انگریزی بھی بول لیتا تھا اور امریکن سگریٹ بھی پیتا تھا۔ (جن میں سے اکثر وہ اپنے بیٹے کے لیے لے جاتی) ۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کی تصحیح کر دوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں انگریز نہیں مصری ہوں، اس پر اس نے حیرت کا اظہار کیا لیکن میں نے اپنے مصری ہونے پر فخر کیا۔ وہ بڑھیا خاموش ہو گئی مگر اس نے میرے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا کہ یہ خون آلود اور گندے ہیں۔ میں نے کہا: میں ایک صحافی ہوں اور ابھی وزارتِ خارجہ جا کر اطلاع دیتا ہوں کہ چار ماہ بعد، یہ جان کر کہ میں انگریز نہیں، مصری ہو۔ تم نے میرے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ سن کر اُس نے کپڑے مجھ سے لے لیے، مگر اس کے بعد اس کا تمام حسنِ سلوک ختم ہو گیا اور مجھ سے بول چال بند کر دی۔

یہ تو محض چند مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اب بھی دنیا کے مختلف خطوں میں رنگ کا امتیاز باقی ہے حالانکہ ہم بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ اور اس دور میں دنیا نے اتنی مادی ترقی کی ہے جو اور کسی دور میں نہیں کی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان، مساوات اور دوسری اقدار میں کوئی قانون، کوئی نظام اور مادی ترقی کا کوئی مظہر فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ یہ دل سے تعلق رکھتی ہیں اور اسلام کو دلوں اور روحوں کو پاک کرنے میں سب پر فوقیت حاصل ہے، حالانکہ اسے چودہ سو برس گزر چکے ہیں لیکن اب بھی اس میدان میں وہ مقدم ہے۔

طبقاتی تعصب

طبقات اور طبقاتی تعصب کے بارے میں اسلام کا موقف بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر گزران معاشرتی طبقات، انہیں بنانے والے عناصر اور تاریخی حالات پر ڈال لی جائے۔

ہر معاشرے میں ایسی انجمنیں یا گروہ ہوتے ہیں جو خون کے رشتوں پر قائم ہوتے ہیں، مثلاً خاندان، یا پیشوں کے لحاظ سے قائم شدہ ٹریڈ یونینیں ہوتی ہیں، یا سکونت کے لحاظ سے ہمسائیگی کے تعلقات ہوتے ہیں جیسے محلہ یا شہر، لیکن ان کے علاوہ ایسے گروہ بھی ہیں جو ان روابط پر قائم نہیں بلکہ ان میں

Marfat.com

مراتب اور مناصب کے لحاظ سے تعلق ہوتا ہے اور انہیں کو معاشرتی طبقات کہا جاتا ہے معاشرتی طبقات کی ماہیت سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ یہ اُن افراد کا اجتماع ہے جو ایک دوسرے سے تو برابری رکھتے ہیں مگر کسی دوسرے طبقے سے اپنے سے اس کی برتری یا کمتری کی بنا پر الگ رہتے ہیں۔ پرولتاری یا بورژوا ایسے ہی طبقے ہیں اور اسی طرح جاگیرداروں اور مزاروں کے طبقے یا عیسائیوں ہیں یا دریوں کے طبقے ہیں۔

اس حقیقت کے جان لینے کے بعد، اب ہم ان پر دو رُخوں سے نظر ڈالتے ہیں۔ ایک تو موضوعی رُخ ہے، یعنی کوئی غیر اس طبقے کو کیسے دیکھتا ہے اور دوسرا ذاتی رُخ یعنی کسی طبقے سے تعلق رکھنے والا اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

پہلے یا موضوعی رُخ کے لحاظ سے کوئی مخصوص طبقہ اپنے طور طریقوں، گفتگو، لباس، تعلیم اور معاشرتی طرزِ عمل سے پہچانا جاتا ہے اور ایک ہی طبقے کے لوگ بالعموم یکساں اطوار وغیرہ رکھتے ہیں ان اطوار، عادات کو اقدار کہا جاتا ہے جو معاشروں میں زندگی کے مختلف اسالیب کا نام ہے۔ ان اقدار میں طبقاتی اختلاف آج کی نسبت ماضی میں بہت زیادہ تھا لیکن آج بھی کسی خاص طبقے کے فرد کو اس کے طرزِ گفتگو یا طرزِ عمل سے پہچانا جاسکتا ہے کیونکہ یہ طور طریقے مخصوص ثقافت سے پھوٹتے ہیں اور ہر طبقے کے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو یہی طور طریقے ورثے میں دیں اور اسی ثقافت کی تعلیم دیں۔ یوں انواع و اقسام کے اختلافات، اجتماعی درجہ بندیوں کو محفوظ کرنے کے بیک وقت وسیلہ بھی بن جاتے ہیں اور اس کا حاصل بھی۔ یونہی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور اولاد در اولاد طبقاتی امتیازات منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

ذاتی یا رُخ سے طبقہ عبارت ہے۔ احساسات یا وجدانی صلاحیتوں کے مجموعے سے۔ یہ احساسات تین قسم کے ہیں:

اوّل فرد میں اپنے طبقے کے دوسرے افراد کے ساتھ برابری کا احساس۔ یہ احساس اُسے اپنے طبقے کے افراد سے ہم آہنگ کرتا، اور ان کی آپس کی مغائرت کو دور کرتا ہے۔ اپنے ہی طبقے کے افراد کے درمیان کسی فرد کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

دوم، کسی فرد کو، معاشرتی درجہ بندی میں اپنے سے برتر افراد کے مقابل احساسِ کمتری۔ اس سے فرد طبقہء اعلیٰ کے افراد سے میل جول میں جھجک محسوس کرتا ہے اور ان میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔

Marfat.com

سوم، کسی فرد کو، معاشرتی درجہ بندی میں اپنے سے کمتر افراد کے مقابلے میں احساس برتری۔ یہ وہ احساسات ہیں جو کسی فرد کو اپنے مخصوص طبقے سے روابط کو پختہ کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اپنے طبقے کی حمایت اور حفاظت حاصل کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے سے اونچے طبقے میں پہنچنے کا شوق ہوتا ہے۔

کسی طبقے کی تشکیل میں ممد کون سے عوامل ہیں، اس کے بارے میں بےشمار رائیں ہیں، اور محققین کا کسی ایک پر اتفاق نہیں۔ اس لیے یہاں سب عوامل کا یکجا مختصر ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس حد تک طبقات کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں اور اس کا سبب ہیں۔

سب سے پہلا عامل اقتصادی، یا معیارِ زندگی کا ہے، یا وہ ثروت ہے جس کے افراد مالک ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ اسی سے کوئی فرد اپنی پسندیدہ تعلیم حاصل کرنے، یا پیشہ اختیار کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ مگر صرف ثروت ہی تشکیلِ طبقات کے لیے کافی نہیں کیونکہ امیری اور غریبی اپنی ذات میں معاشرے کے رویے نہیں، لیکن ثروت کی بنیاد پر معاشرے کی تقسیم کئی طبقات میں ہو جاتی ہے۔ مثلاً مزدوروں اور محنت کشوں کا طبقہ، جو دوسروں کے لیے کام کر کے معمولی اجرت پاتے ہیں، سرمایہ داروں کا طبقہ، اپنے کاروبار میں پیسہ لگا کر فائدہ حاصل کرتے ہیں، خواہ ذاتی طور پر خواہ دوسروں کے ذریعے پھر زمینداروں اور جاگیرداروں کا طبقہ ہے، جو اپنی غیر منقولہ جائیداد سے آمدنی حاصل کرتا ہے۔

دوسرا عامل، پیشہ ہے، یا وہ کام جسے کوئی فرد اختیار کرتا ہے۔ اس کی رو سے کاریگروں کا طبقہ ہے، جو اپنے ہاتھوں سے چیزیں تیار کرتے ہیں، مزارعوں کا طبقہ، جو زراعت سے آمدنی حاصل کرتے ہیں، پھر ڈاکٹروں، انجینئروں، معلموں وغیرہ کے طبقات ہیں جو آزادانہ اور مستقل طور پر اپنے اپنے پیشے سے کماتے ہیں۔ فی الواقع، طبقاتی فرق پیدا کرنے میں پیشے کا بہت بڑا اثر ہے۔ کاتب اور مزدور، امیر لوگ تو نہیں اور ان کی آمدنی بھی محدود ہے مگر دونوں میں بے حد فرق ہے۔ مگر یہاں یہ مدنظر رہے کہ طبقہ پیشے پر سبقت رکھتا ہے کیونکہ کوئی انسان پہلے کسی طبقے سے منسلک ہوتا ہے اور پھر مزدور یا کاتب وغیرہ بنتا ہے۔ ایک ہی طبقے کے اندر، پیشے کے علاوہ کئی اور مفادات بھی مشترک ہو سکتے ہیں۔

تیسرا عامل، زندگی کا عام اسلوب ہے۔ جس طرح کی زندگی کوئی فرد یا کوئی گروہ گزارتا ہے، وہ طبقاتی امتیاز پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ایک طرف پُر تعیش زندگی ہے اور دوسری طرف سادہ

Marfat.com

زندگی، تاجر پیشہ افراد میں اسی فرق سے دو الگ طبقے پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ تاجر جو دور بیٹھ کر تجارتی معاملات نمٹاتا ہے اور خرید و فروخت وغیرہ کے کاموں میں براہ راست دخل انداز نہیں ہوتا، بورژوا طبقے کا فرد کہلاتا ہے۔ اس کے مقابل وہ تاجر ہے جو اپنے امور خود سنبھالتا ہے اور اپنے کارندوں کی خود نگرانی کرتا ہے، کاروباری طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔

چوتھا عامل، ثقافت ہے۔ بعض لوگ ثقافت اور تعلیم کو "طبقہ ساز" عامل شمار کرتے ہیں، مگر صائب بات یہ ہے کہ ثقافت، طبقات میں امتیاز کا عنصر تو ہے، طبقات پیدا کرنے میں ممد نہیں۔ یعنی اس کی وجہ سے ہم مختلف طبقات کے افراد میں ان کے اسلوب فکر، درجہ تعلیم اور معیار ثقافت کے لحاظ سے فرق دیکھ سکتے ہیں۔

ان عوامل میں ایک اور عامل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، یعنی مذہب، جو طویل مدت سے طبقاتی اختلاف کا ایک سبب چلا آ رہا ہے۔

ان عوامل کے بیان کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ طبقات سازی میں کسی ایک عامل ہی پر انحصار ممکن نہیں کیونکہ یہ سب عوامل ایک دوسرے سے مربوط اور متعلق ہیں اور ایک عرصے سے طبقاتی امتیازات کے پیدا کرنے اور پختہ کرنے میں اثر انداز چلے آتے ہیں۔

اگر ہم تاریخ میں طبقاتی نظام کے انداز پر نظر ڈالیں تو ہمیں اسلام کے ظہور سے پہلے کئی معاشروں کے طبقات میں مکمل اختلاف نظر آئے گا اور ظہور اسلام کے بعد بھی کئی غیر اسلامی معاشروں میں طبقاتی فصل دیکھی جا سکتی ہے، اور یہی نظام کئی انسانی معاشروں میں اب تک رائج چلا آتا ہے۔

اسلام سے پہلے قریش کو خاص مقام، حقوق اور سرداری حاصل تھی جو عربوں میں سے اور کسی کو نصیب نہ تھی۔ وہ حج میں بھی مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے جبکہ دوسرے لوگ عرفات میں وقوف کرتے۔ ان امتیازات سے قریش کو مالی منفعت بھی حاصل ہوتی، جو وہ تمام عربوں سے وصول کرتے۔ ان کا حکم تھا کہ لوگ صرف اُسی لباس میں طواف کریں جو قریش سے خریدا جائے۔ اگر یہ استطاعت نہ ہو تو بے لباس طواف کریں۔[۱]

"ایرانی معاشرہ نسب اور ہنر پر قائم تھا۔ اس کے مختلف طبقات میں بعد المشرقین تھا اور ربط وضبط کی کوئی صورت نہ تھی۔ حکومت کی طرف سے عوام الناس پر کسی امیر کبیر شخص سے جائیداد خریدنے پر پابندی تھی۔ ساسانی حکومت کا قانون تھا کہ ہر شخص اپنے ہی دائرے میں رہے جو اُسے اپنے

نسب سے حاصل ہے اور اپنے سے بالاتر طبقے سے منسوب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ہر شخص صرف وہی پیشہ اختیار کر سکتا تھا جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا کیا تھا۔ ایران کے شہنشاہ کسی نیچ ذات کو کوئی وظیفہ نہیں دیتے تھے۔ عوام میں بھی واضح امتیازات کے ساتھ کئی طبقے موجود تھے، اور ہر ایک کا اس معاشرے میں، محدود دائرۂ عمل تھا۔[۹]

اس طبقاتی تفاوت نے انسان کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا اور اس کا واضح مظاہرہ اس وقت ہوتا جب وہ اشراف و امراء کی مجالس میں حاضر ہوتے اور یوں گم صم کھڑے رہتے گویا انسان نہ ہوں، مٹی کے بُت ہوں۔

ہندوستان میں طبقاتی نظام اس سے بھی بدتر شکل میں موجود تھا اور طبقے طبقے میں شدید تفاوت تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہ تھی۔ اس نظام تلے انسانیت رسوا ہوئی اور اس کا شرف پامال ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اہل ہند نے اس نظام کو اپنے مذہب اور معاشرے کا جزو بنا لیا اور ہزاروں برس سے اس پر عمل پیرا ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تین صدیاں پہلے ہندوستان میں برہمنی تہذیب ظاہر ہوئی۔ جس نے قانونِ مدنی و سیاسی کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کو چار واضح فرقوں یا "ورنوں" میں تقسیم کر دیا۔ براہمن، جو مذہبی فرقہ تھا اور مذہب کا محافظ تھا، کھشتری، جو جنگجو افراد پر مشتمل تھا، ویش، جو اہل زراعت و تجارت تھے اور شودر، جو باقی سب کی خدمت پر مامور تھے۔ طبقہ برہمن نے اپنے آپ کو وہ حقوق عطا کر رکھے تھے جو انہیں خدا بنا دیتے تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو خدا کے چیدہ، لوگوں کے حاکم، تمام مخلوقات سے افضل اور لوگوں کے سردار کہلاتے تھے، ان کو سب گناہ معاف تھے اور اگر ان سے کوئی قتل بھی ہو جائے تو اس کی سزا صرف سر منڈانا تھی۔ حکومت شدید ضرورت کے تحت بھی، ان سے کوئی مالی امداد طلب نہیں کر سکتی تھی۔ کھشتری فرقے کے افراد براہمنوں سے کمتر تھے مگر باقی دو طبقوں سے بالاتر تھے اور انہیں کئی مراعات حاصل تھیں۔ سب سے ذلیل طبقہ شودروں کا تھا۔ اس طبقے کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ قانون بھی انہیں جانوروں بلکہ کتوں سے بھی زیادہ ذلیل قرار دیتا تھا۔ انہیں امیر بننے یا دولت جمع کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ انہیں براہمنوں کے قریب تک پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر ان کا ہاتھ بلکہ انگلی تک بھی کسی براہمن کو چھو جاتی تو ان کی زبانیں کاٹ دی جاتیں۔ ہندوستان تمام تر "روشن خیالی" اور سیکولرازم کے آج بھی اس

Marfat.com

بتاہ کن طبقاتی نظام میں گرفتار ہے اور اب بھی شودروں کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں جبکہ دنیا میں اسلام کی انسان نوازی سے آگاہ ہو چکی تھی، یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں بھی لوگوں میں تین طبقے موجود تھے، جن میں واضح فرق تھا۔ پہلا طبقہ اشراف، دوسرا رجالِ دین اور تیسرے عوام۔ ان تینوں طبقوں کے درمیان صریح اور نمایاں امتیاز موجود تھا اور کسی بھی شخص کے لیے ان کی الگ الگ شناخت دشوار نہ تھی۔ اس نظامِ مراتب کو قانون کی حمایت حاصل تھی۔ طبقۂ اشراف کا شرف موروثی تھا اور جاگیرداری نظام کے تحت مطلق العنان بادشاہ کی اجازت سے، انہیں اپنی جاگیروں پر کام کرنے والے عوام پر ٹیکس لگانے اور سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ درحقیقت یہ اشراف خود ہی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ تھے اور ان پر کوئی روک ٹوک نہ تھی رجالِ دین یا پادری اپنے مخصوص لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ اسی عہد میں ان کو بھی وسیع اختیارات حاصل تھے اور پوپ کا اثر و نفوذ کسی طرح بھی بادشاہ، امراء اور اشراف سے کم نہ تھا۔ انہیں کی اجازت سے طبقۂ اشراف کو عوام کے ساتھ من مانی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ پادری ممتاز طبقے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ گرجاؤں کی تحویل میں وسیع اوقاف، مذہبی ٹیکس لگانے کا اختیار اور اکثر اوقات میں لشکر بھی ہوتے تھے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے، انہیں سب سے حقیر سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے صرف فرائض ہی فرائض تھے اور وہ حقوق سے یکسر محروم تھے۔ ان کو نسل در نسل صرف ذلت، غریبی اور غلامی ہی نصیب تھی۔ یورپ میں امتدادِ زمانہ سے طبقات کے نام بدل گئے، مثلاً طبقۂ اشراف کی جگہ سرمایہ دار آ گئے لیکن ان کے مزاج میں کوئی فرق نہ پڑا۔ اس طبقے کو دولت، اختیار اور طاقت اُسی طرح حاصل رہی، جن کی بدولت حکم چلتا ہے، اور یورپ ابھی آزادی کے ان مظاہر سے روشناس نہ ہوا تھا جو انتخابات وغیرہ کے ذریعے جمہوری حکومت کے قیام میں معاون بنتے تھے۔ اشتراکی ممالک میں ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو کہتے کو تو عوام کی حالت سدھارنا چاہتا تھا مگر اختیار، قیادت اور جملہ امور پر تصرف اسی کو حاصل تھا، جسے اس نے اس بے دردی سے استعمال کیا کہ اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

یہ بات واضح ہے کہ اسلام نے لوگوں میں جس مساوات کو عام کیا وہ محض نام کی نہ تھی۔ اسلام نے افراد اور جماعتوں کے درمیان جملہ امتیازات باطل قرار دیئے اور دنیا میں جتنے طبقات موجود

Marfat.com

تھے ان سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام، عام زندگی میں موجود تھا، خلقی اختلافات سے صرفِ نظر کرتا ہے، مگر وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا جائے یا اُسے اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق کام کرنے سے روک دیا جائے خواہ وہ اس معاشرے میں پیدا نہ ہوا ہو اور نسب و وراثت کے ذریعے بھی حق دار نہ ہو۔ اسلام لوگوں کے درمیان اقدار کے تفاوت کو نظر انداز نہیں کرتا خواہ وہ انبیاء اور مرسلین ہی کیوں نہ ہوں۔ [9]
ولقد...... علی بعض"[9] "فتلک الرسل..... بعضھم درجات"[10] اسلام علماء اور جہلاء کو برابر قرار نہیں دیتا۔ "قل ھل یستوی ...... لا یعلمون"[11] یہ بات اسلامی عدل کے منافی ہے کہ انسانوں کی جد و جہد میں تو فرق ہو مگر رزق ایک جیسا ملے: "نحن قسمنا ...... بعض درجات"[12] واللہ فضل ...... فی الرزق"[13] یاد رہے کہ علم اور رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت کا تعلق نسب یا وراثت پر نہیں، نہ غضب و سطوت پر ہے بلکہ یہ فضیلت صرف عمل سے ہے۔ اسلام ایسے طبقات پیدا نہیں کرتا، جن میں کوئی ایک دوسرے پر حاوی ہو۔ مراتب اور رزق میں تفاوت قدرتی امر ہے جسے دور کرنا ممکن نہیں، نہ کسی ترکیب سے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ساری دنیا میں یہ تفاوت نظر آئے گا، حتیٰ کہ اشتراکی ممالک میں دوسرے ملکوں سے مختلف صورتِ حال نہیں۔ اگرچہ وہاں اصطلاحات اور نام بدل گئے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہاں سب لوگوں کو ایک جیسی اُجرت ملتی ہے یا رزق کی تقسیم میں بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے؟ کیا سب لوگ وہاں افسر ہیں اور ماتحت کوئی نہیں؟ کیا وہاں سب کے سب جرنیل ہیں، عام سپاہی کوئی نہیں؟ حاصل امر یہ کہ اس تفاوت سے مفر نہیں اور ہر انسانی معاشرے میں یہ حقیقت واقعہ ہے[14] قرآنِ کریم نے آیات سابقہ میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

طبقاتی نظام میں قرآنِ مجید میں صرف ایک صورت مذکور ہے اور وہ غلاموں کا وجود ہے۔ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ غلامی کا نظام اسلام نے پیدا نہیں کیا بلکہ یہ حالات کا مرہونِ منت تھا۔ فوری طور پر اسلام کے لیے اُسے ختم کرنا ممکن نہ تھا مگر اسلام نے رفتہ رفتہ ایسے احکامات صادر کیے جن سے اس نظام کا خاتمہ ممکن ہو گیا۔ غلامی اسلامی معاشرے کا اصل الاصول نہیں بلکہ محض عارضی ضرورت تھی جو احوال و اسباب کے ختم ہوتے ہی مٹ گئی۔ اس کی جگہ اسلام نے اخوت کو فروغ دیا جس سے معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

Marfat.com

"انما المؤمنون اخوة"[18]

اس اخوت نے ہر مسلمان فرد کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ ہے اور اس کی بھلائی خود اپنی بھلائی ہے۔ اسی طرح جماعت کے دل میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ اُسے فرد کے مفاد اور بھلائی عزیز ہونا چاہیئے۔ اس باہمی احساس سے روحانی اور مادی فوائد حاصل ہوئے اور اخوت مضبوط اور پائیدار بنی۔ اسی اخوت سے معاشرہ یکجان اور ہم آہنگ ہو گیا اسی وحدت کو نبی کریم ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

"مومنوں کی آپس میں محبت، رحمدلی اور ہمدردی اس جسم کی مانند ہے کہ اس کا ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بخار میں مبتلا ہوتا ہے اور جاگتا رہتا ہے۔"[18]

تعصب قومی

قوم اور قومیت کے الفاظ، اصطلاحی مفہوم میں نئے ہیں اور انیسویں[19] صدی عیسوی کی پیداوار ہیں۔ ان کی اصل قدیم ہے۔ یعنی کسی گروہ یا جماعت میں، دوسروں کے مقابلے میں، زیادہ پائیدار اور قریبی رشتہ ہونا۔" وہ ہیئت جسے آج امت یا قومیت کہا جاتا ہے، آج ہی کی طرح بابل، مصر، فارس، روم اور یونان میں موجود تھی جس طرح آج فرانس، برطانیہ، امریکہ یا جاپان میں ہے۔"[19] قومیت، کسی جماعت انسانی میں اس مضبوط اور جاندار شعور سے جنم لیتی ہے جو کسی گروہ یا نسل میں گہرے روابط کا نتیجہ ہوتا ہے یا ان میں زبان، تاریخ اور اقتصادی مفادات کا اشتراک ہوتا ہے۔

قومیت کی تشکیل کرنے والے عوامل کے مطالعے کے بعد، یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں سب سے اہم جنس اور نسل کی وحدت ہے اس کے علاوہ مولد و منشا کی وحدت، جسے وطنیت کہا جاتا ہے اور وحدتِ زبان، وحدتِ خیالات اور ایک ہی تاریخ کا اشتراک بھی قومیت کو جنم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی مفادات کی وحدت بھی یک رنگی پیدا کرتی ہے۔ یہ تمام یا ان میں سے کچھ عوامل مل کر لوگوں کی کسی جماعت میں مضبوط رشتے پیدا کرتے ہیں اور ان کے دماغوں اور خیالات پر اس قدر غلبہ پا لیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں یک جان ہو جاتے ہیں اور اسی قومیت کے باعث ایک دوسرے کے مددگار بن جاتے ہیں۔ اسی کی بنا پر اپنے دوستوں سے صلح اور دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے لوگ، افکار اور آراء زندہ و توانا ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اگر تمام عوامل کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مثلاً وحدتِ نسل و جنس، فرضی احساس ہے کیونکہ کوئی جماعت یا قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ صدیوں سے نسلی آمیزش سے پاک چلی آتی ہے کیونکہ تمام گروہ اور جماعتیں آپس میں خلط ملط ہو چکی ہیں۔ ان کا یہ اتصال کئی طرح کا ہے، مثلاً عمومی اتصال جو حالتِ امن میں واقع ہوتا ہے اس کے علاوہ اپنی مرضی یا جبر سے نقل مکانی، جنگ اور جنسی روابط بھی شعوب و قبائل میں اتصال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اگر آریائی یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا خون "پاک" ہے یا سامی سمجھتا ہے کہ اس کی نسل میں کوئی ملاوٹ نہیں تو دونوں ہی اوہام خود فریبی کا شکار ہیں جرمنی میں ہٹلر نے اس نظریے کو شدت سے منوانے کی کوشش کی تھی مگر بُری طرح ناکام رہا کوئی بھی دعویٰ جو نسل پرستی پر قائم ہو، اسی طرح تباہ ہوتا ہے۔

وطنیت یا وحدتِ مولد بھی فرضی بنیادوں پر قائم ہیں۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ انسان کسی وطن سے نسبت کو روحانی تعلق سمجھتا ہے اور اسے اہمیت دیتا ہے۔ لیکن اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہ اپنے وطن کی جغرافیائی سرحدوں کو اپنے ذہن میں اتنا پھیلا دے کہ ساری دنیا پر محیط ہو جائیں۔ کسی انسان کا وطن تو اس کرۂ ارض کا ہی حصہ ہے پھر وہ یہ بات کیوں نہیں کرتا کہ وہ اس زمین کا "شہری" ہے اور زمین پر بسنے والے تمام افراد اس کے ہم وطن ہیں؟ دراصل وہ پیوند جو لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے، عقیدہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات عجیب نہیں کہ کوئی شخص عقیدے کی یک رنگی کی بدولت دوسرے ملکوں کے رہنے والوں کو اپنا "ہم وطن" قرار دے اور یہ رشتہ زیادہ مضبوط اور زیادہ اہم بن جائے۔ شاید ہمارے ہمعصر معاشروں میں یہ مظہر اہمیت حاصل کرے!

تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ "زبان" بھی مذکورہ بالا عوامل میں کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ زبان اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں میں بات سمجھنے سمجھانے کا آلہ یا ذریعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی گروہوں میں احساسِ مشترک ہو بیان کرنے میں زبان ہی کام آتی ہے۔ لیکن یہ قطعی طور پر وحدتِ فکر و رجحان کے لیے ضروری نہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسی کئی قومیں اور جماعتیں ہیں جن میں وحدتِ زبان مفقود ہے، مثلاً بھارت، چین، سوئٹزرلینڈ وغیرہ۔ اس صورت میں زبان کو انسانوں میں تفرقے یا امتیازات پیدا کرنے یا انہیں قومیتوں کے لحاظ سے تقسیم کرنے کی بنیاد بنانا مناسب نہیں ہے۔

جہاں تک اقتصادی مفادات کی وحدت کا تعلق ہے تو یہ افراد یا کسی انسانی گروہ میں وحدت کے

Marfat.com

قیام کا سبب تو ہو سکتے ہیں، لیکن قومی شعور پیدا کرنے کے لیے ہیچ ہیں۔ پھر ایسا موقع آتا ہے کہ ہر قوم اقتصادی مفادات حاصل کرنے میں تیزی دکھاتی ہے، جس سے سب اقوام کی زندگی پریشان کن ہو جاتی ہے کیونکہ ہر قوم خودغرض ہوتی ہے اور اپنے فائدے کے لیے بے شمار اقسام وانواع کی اقتصادی بندشیں عائد کرتی ہے جس سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک جذبات اور تاریخ کی وحدت کا تعلق ہے، تو اس سے قومیتیں اور اُمتیں بنتی ہیں، مگر یہ بھی حقیقت کا صرف ایک پہلو ہیں اور ان سے بات صاف اور واضح نہیں ہوتی۔ احساسات اور جذبات کی وحدت، وحدتِ عقیدہ پر منتج ہوتی ہے، اور مخصوص افکار، آراء، مل جل کر رہنے کے سبب کبھی پسندیدہ ہوتی ہیں، اور کبھی ناخوشگوار، کبھی خوش بختی لاتی ہیں اور کبھی رنج فزا ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے اس عامل کو انسانی جماعتوں کے مابین پختہ رشتے قائم کرنے میں ممد کہا جا سکتا ہے۔

نسلی اور وطنی رجحان میں افراط، اور اس سے پیدا ہونے والی خودغرضی ہر قوم کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ تمام عزّو افتخار، طاقت و اختیار اپنے لیے سمیٹ لے اور دوسروں کے حقوق چھین لے۔ اس سے فساد، اسلحے کی فراوانی اور جنگ بندی پیدا ہوتی ہے[۲۱] اس کے مقابلے میں اسلام سب بنی نوع انسان کے لیے اخوت و محبت قائم کرنے کے لیے آیا اور اس نے تمام مادّی خواہشوں، خود پسندی کی مصلحتوں اور انانیت سے صرفِ نظر کیا۔

جناب سید قطب اپنی کتاب "ھٰذا الدین" میں لکھتے ہیں![۲۲]

"اسلام آیا تو لوگ اس وقت حسب نسب کے رشتوں یا نسلی پیوندوں میں منسلک تھے یا ایک ہی قطعۂ زمین پر رہنے سہنے سے ان میں تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یا وہ قریبی مفادات اور منافع پر اکٹھے ہوتے تھے۔ ان تمام تعصبات کا انسانی جوہر سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ تو محض وقتی اور عارضی ضرورتیں تھیں۔ اسلام نے اس اہم موضوع پر حتمی بات کر دی، جس سے انسان کا انسان سے رشتہ ہمیشہ کے لیے طے پا گیا۔ اسلام نے کہا: رنگ نسل، حسب نسب، سکونت، مفادات و مصالح لوگوں کو باہم ذکر کرتے ہیں نہ افتراق پیدا کرتے ہیں۔ یہ صرف عقیدہ ہے"۔..... کسی بھی معاشرے کا مستقل رشتہ عقیدہ پر مبنی ہے کیونکہ عقیدہ روح انسانی کے پاکیزہ ترین خصائص میں سے ہے۔ جب یہ رشتہ قائم ہو جائے تو کوئی اور تعلق یا نسبت اہم نہیں رہتا۔ بنی نوع انسان کے لیے

Marfat.com

ضروری ہے کہ وہ عمدہ ترین خاصیت پہ اتفاق کرے، اور جانوروں کی طرح چارے یا چراگاہ پر متفق نہ ہو، نہ کوئی جنگ یا باڑ ہی انہیں ایک جگہ جمع کر سکے ...... امت، انسانوں کے اُس مجموعے کا نام ہے، جنہیں عقیدے کے تعلق نے باندھ رکھا ہو، اور یہی اس کی نسل اور حسب نسب ہے، کیونکہ عقیدے کے سوا کوئی پیوند انہیں ہمیشہ مربوط نہیں رکھ سکتا۔ زمین، نسل، زبان، حسب نسب، دنیاوی و مادی فوائد الگ الگ یا باہم کسی اُمت یا قوم کی تشکیل نہیں کرتے۔ ان کا مستقل تعلق صرف عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے۔"

انسانی تاریخ میں پہلی بار اسلام نے یہ اعلان کیا کہ قوم، سلطنت اور تمام انسانی انجمنیں صرف ایک اساس پر قائم ہو سکتی ہیں جو شرفِ انسانی کے لائق ہو اور جو خدا کی طرف سے انسان کو عطا کردہ غور و فکر کی قدرت کے ذریعے قابلِ فہم ہو۔ یہ اساس فقط عقیدہ ہے جو انسانوں کو الگ الگ بھی کرتا ہے اور متحد بھی۔ اس کے علاوہ جتنے عوامل ہیں اسلام ان کی تائید نہیں کرتا اور وہ اس قابل نہیں کہ لوگوں میں تفریق پیدا کر سکیں یا انہیں مجتمع کر سکیں۔

بنی نوع انسان فی الجملہ ایک ہی اصل سے پھوٹے ہیں:

"وخلقکم من نفس ...... کثیراً و نساء"[23]

تمام اقوام و قبائل کی اصل یہی ہے:

"یاایھا الناس..... ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"[24]

اس لیے تمام اقوام و قبائل اور گروہوں میں جو اختلافات ہیں وہ ایک دوسرے سے بغض اور نفرت کا باعث نہیں ہونے چاہئیں بلکہ انہیں تو ایک دوسرے سے تعارف اور تعاون کا وسیلہ بننا چاہیے۔

جہاں تک زمین کا تعلق ہے تو یہ خدا کی ہے، جسے انسان نیکی حاصل کرنے کے لیے آباد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس پر اپنا نائب مقرر کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بطور وراثت عطا کرتا ہے۔ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ زمین کے کسی چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں محدود و مقید ہو کر رہ جائے اور اُسے اپنا معبود بنا لے[25] اس بارے میں قرآن مجید کہتا ہے:

"الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض"[26] اور

"الم نمکن...... فنتھا فیھا"[27]

Marfat.com

اللہ کی زمین تو سب انسانوں کے لیے ہے اور مسلمانوں کی سرزمین سب مسلمانوں کے لیے جہاں کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں نہ ان کے درمیان حد بندیاں قائم ہوتی ہیں۔

اس مبداء کریم کے فیض سے اسلام نے زمین حسب نسب یا جاہلیت کی قبیلہ پرستی پر تفاخر و تعصب کی تمام اقسام کو نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"قل ان کان ...... القوم الفاسقین"۔[۲۵]

اور نبی کریمؐ نے فرمایا:

"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ تو چاہیئے کہ وہ قوم جو اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتی ہے اس سے باز آجائے، ورنہ اللہ کے نزدیک وہ گبریلے سے بھی کم وقعت رکھتی ہیں"۔[۲۶]

عربوں کے بعض قبائل اور گروہ نسلی برتری اور عالی نسبی پر فخر کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ رسول کریمؐ نے معاملات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"اے قریش! اپنی جانوں کو بچا لو۔ میں تمہیں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے بنو عبد مناف! میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تمہیں اللہ سے بچا نہیں سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد! مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہے لے لو، مگر میں تمہیں اللہ سے بے نیاز نہیں کر سکتا"۔[۲۷]

رسول خداؐ نے اعلان فرمایا کہ جو عصبیت کی طرف دعوت دے، اسے اسلام سے کوئی غرض نہیں۔ "جو عصبیت کی طرف جلائے وہ ہم میں سے نہیں"۔ آپؐ نے جاہلی عصبیت کو بدترین الفاظ سے یاد فرمایا اور اس سے باز رہنے اور اُسے ترک کرنے کا حکم دیا۔[۲۸] "اسے ترک کر دو، کیونکہ یہ بدبودار شے ہے"۔ اس کی تاکید مزید کے لیے اور اسلام کی روح کی وضاحت فرماتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "میں ہر پرہیزگار کا بھائی ہوں، خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، اور ہر بدبخت سے قطع تعلق کرتا ہوں، خواہ وہ اشرافِ قریش ہی میں سے کیوں نہ ہو"۔

اُس وقت اسلام دشمن عناصر نے پوری کوشش کی کہ اوس و خزرج میں قبائلی تعصبات اور نعروں کو ابھاریں، بلکہ قریش اور باقی تمام قبائل کے درمیان، اور عربوں اور غیر عربوں کے درمیان جو اسلام لائے تھے، اختلافات کو ہوا دیں۔ یہ وقت کڑے امتحان کا تھا، مگر یہ تمام سازشیں ناکام ہو گئیں اور

Marfat.com

اسلام نے ان تمام شعوب و قبائل کو عقیدے کی کٹھالی میں پگھلا دیا اور ایک رائے، ایک راستے اور ایک ہی طرزِ فکر کے رشتے میں پرو دیا۔ ان سازشوں میں، اسلام کے اولین دور میں، یہودیوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

جب بھی اسلامی عقیدے کی اثر پذیری مسلمانوں میں زوال آمادہ ہوئی، مسلمانوں میں اس سے انحراف سے حفاظت کرنے والی فصیل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ سلطنتِ عثمانیہ کا دور اس لحاظ سے بدترین تھا کیونکہ اس وقت یورپ میں انیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہونے والے قومیت پرستی کے خیالات عالمِ اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے کہ بھائی بھائی کے خلاف ہو رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں، عرب دشمنوں اور اسلام کے مخالفین کے لیے عالمِ اسلام کے بہت بڑے حصے کو ہتھیا لینا ممکن ہو گیا۔

قومیت پرستی کے خیالات، سلطنتِ عثمانیہ میں "جماعتِ اتحاد و ترقی" اور "جمعیت شعبان ترکیہ" نے رائج کیے۔ سالونیکا کے یہودی جماعت اتحاد و ترقی کے لیڈروں کو شہ دے رہے تھے اور ان میں تورانی عصبیت پھیلانے اور ما قبل اسلام کی تہذیب، ادب اور ثقافت زندہ کرنے میں انہیں کا ہاتھ تھا۔ انہیں نے ترکوں کو اکسایا کہ وہ اس دینِ اسلام کا، اور اس کی شریعت و ثقافت کا اور زبان کا جائزہ لیں جو عربوں نے پھیلایا کیونکہ (ان کے خیال میں) یہ ترکی قومیت پرستوں کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ ان میں پروپیگنڈا کیا کہ ان کے لیے اسلام قبول کرنے سے پہلے کی "بت پرستی" کی طرف لوٹ جانا بہتر ہے[۱۳۲] حتیٰ کہ زیادہ جوشیلے ترک، ہلاکو اور چنگیز خان جیسے تورانی بت پرستوں کی ذات پر فخر کرنے لگے اور ان کے ناموں کو مقدس اور سزاوارِ پرستش جان کر اپنانے لگے۔ یہ بھی ہوا کہ شاہ حسین کے لشکریوں نے اس کے بھائی کی لاش پر (جو مدینہ میں ترکوں کا ہاتھ تھا) یہ لکھا ہوا دیکھا (جسے یقیناً تورانی ترکوں کی جماعت نے لکھا تھا)، کہ "یہ خوفناک بدعتِ فرض، جسے امتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے، جو طویل مدت تک ہماری ترقی میں بالعموم اور تورانی وحدت کے قیام میں بالخصوص حائل رہی ہے، اب شکست و ریخت اور زوال سے دوچار ہے۔"[۱۳۳]

مسلمان عرب، جمعیت اتحاد و ترقی کے بارے میں اپنے شکوک ظاہر کر رہے تھے جن کے دو بنیادی سبب تھے: "اول یہ کہ جمعیت اتحاد و ترقی کے سب لیڈر اور زعماء، بغیر استثناء، فری میسن تنظیم سے تعلق رکھتے تھے اور دوم یہ کہ سالونیکا کے یہودی، جمعیت اتحاد و ترقی کا جزوِ لازم تھے۔"[۱۳۴]

Marfat.com

یہودی عناصر نے اپنی سازشوں سے جماعت اتحاد و ترقی کو یہ جرأت بخشی کہ وہ ہر چیز کو تومیا نے (یا ترکھیاتے) کا مطالبہ کرنے لگی یعنی ان تمام عناصر کو، جو سلطنت عثمانیہ کو تشکیل دیتے تھے ترک قومیت اختیار کرنے پر مجبور کیا اور ان کے ترکی زبان لازم قرار دی۔ جیسا کہ معلوم ہے، سلطنت عثمانیہ متعدد قومیتوں پر مشتمل تھی اور عقیدے کی بنا پر وجیہہ میں آئی تھی اور صرف عقیدہ ہی انہیں یکجان اور متحد بنائے ہوئے تھا، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وسیع مملکت میں ترکوں کی تعداد عربوں سے زیادہ نہ تھی اور یہ دونوں عناصر اس کے مشرقی و مغربی بازوؤں میں آباد تھے اور ان میں اسلام کے سوا کوئی قدر مشترک نہ تھی عرب، سلطنت عثمانیہ کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے اور اس کی شان و شوکت کو اپنی شان و شوکت اور اس کی فتوحات کو اپنی فتوحات سمجھتے اور اس پر فخر کرتے۔ "ترکیانے" کے عمل کے بعد بھی عربوں کا رویہ اس سلطنت سے مشفقانہ اور دوستانہ رہا اور ان کے نزدیک اس کے احترام کا تقاضا تھا کہ اس سلطنت کو تباہ و برباد اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا جائے۔ اس بات پر ان کے وہ بیانات، کانفرنسیں اور اجتماعات دلالت کرتے ہیں جو وہ سلطنت عثمانیہ کے اعیان حکومت کے ساتھ کرتے رہے۔

لیکن آگ کو پھر کلانے والے دونوں طرف تھے۔ جن لوگوں نے اس سلطنت کی، جو اپنے ضعف کے باوجود مسلمانوں کے اتحاد کی علامت اور ان کی امیدوں کا مرکز تھی، تباہی کی منصوبہ بندی کی، انہوں نے واپسی کے سب راستے بند کر دیئے۔ مسلمان تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ سلطنت ان کی قوت اور شان و شوکت کو واپس لے آئے گی، لیکن بات جہاں سے چلی تھی وہیں واپس آ گئی۔ یوں پھر قومیت عربیہ کا آغاز ہوا اور اس نے بھی وہی شکل اختیار کر لی جو ترکوں کے نزدیک تورانی قومیت کی تھی (یہ بات بالیقین کہی جا سکتی ہے کہ عرب قومیت کو پیدا کرنے والے عیسائی تھے، پھر فری میسن کے ارکان نے اسے ہوا دی اور یہ حقیقت سب پر عیاں تھی کہ فری میسن تنظیم اور یہودی ایک ہیں) ایک مرتبہ مسلمانوں پر قومیت پرستی کا دروازہ کھل گیا تو پھر دوسری قومیتوں کے لیے کیا رکاوٹ تھی؟ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اس سے دوسروں کو کس طرح منع کر سکتے ہو، وہ واحد دروازہ یعنی اسلام، جو تمہیں ایک دوسرے سے ملاتا تھا بند ہو گیا تو رابطہ ٹوٹ گیا۔

لارنس (آف عربیا) جو اس علاقے میں برطانوی سیاست کا مہرہ تھا، اپنی کتاب "حکمت کے ستون" میں اس مقصد کے حصول کے بارے میں تصویر کشی کرتا ہے:

"میں مدت تک شام اور صبح کے بارے میں غور کرتا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا تھا۔

کیا قومیت پرستی کسی دن دینی رجحان پر غالب آجائے گی اور کیا وطن پرستی کبھی دین پر چھا جائے گی۔ اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے: کیا اعلیٰ سیاسی نصب العین وحی اور الہام کی جگہ لے لے گا اور شام اپنے دینی نظریے کو وطنی نظریے سے بدل دے گا؟ یہ خیال میرے ذہن میں تمام راستہ کلبلاتا رہا۔"

سب واقف ہیں کہ ترکوں کے خلاف انقلاب کو برطانوی تائید حاصل تھی اور اس کے مادی اور صحافتی ذرائع اس کی مدد کر رہے تھے۔ فرانس کے فائدین بھی اس کے حلیف تھے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ترکوں کے کئی لیڈر ان فائدین سے ملاقات کے لیے غیر ملکی سفارت خانوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔[۵۳]

قومیت پرستی اور نسل پرستی کے اصولوں سے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ ہم وحدتِ عرب یا اُن کے آپس میں تعاون یا قریبی باہمی تعلقات کو تسلیم نہیں کرتے۔ عرب تو دنیا میں اُس وقت بھی فضیلت کے حامل تھے جب اسلام کا پیغام اُن پر نازل ہوا۔ ان کا اتحاد اسی فضیلت کی اساس پر قائم تھا اور قائم رہا۔ وہ دوسروں سے بڑھ کر عربی زبان اور دنیا میں مرکزی حیثیت کی بنا پر اس فضیلت کے سزاوار تھے۔ انہوں نے اس فضیلت کو دوبارہ پالیا اور انہیں اس کی بشارت دی گئی۔ "عربیت" اسلام سے جدا نہیں ہو سکتی اور دنیا بھر کے مسلمان عربوں کی فضیلت کے قائل ہیں۔ عربی زبان سیکھنے کا شوق بھی رکھتے ہیں کیونکہ وہ قرآن کی زبان ہے اور عربوں کی تکریم و تعظیم بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المتوفی ۱۷۶۵ء، کہتے ہیں:

"ہم لوگ اس خطۂ زمین، یعنی ہند، میں اجنبی ہیں، کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد نے بہت مدت پہلے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے عربی حسب نسب اور عربی زبان ہمارے لیے باعث عزّ و افتخار ہے۔ انہی کے ذریعے ہم نے معرفتِ الٰہی پائی اور اشرف الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔ ہم پر واجب ہے کہ خدا کی اس رحمت کاملہ کا مقدور بھر شکر ادا کریں جس طرح ہمارے عرب اجداد کی عادت تھی۔ انہی میں سے ہمارے نبی کریمؐ مبعوث ہوئے اور آپؐ نے سب سے پہلے دعوتِ اسلام انہی کو پیش کی۔"[۵۴]

قومیت تو ایک ظرف ہے، جو چیز اس میں ڈالی جائے وہ اسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے بذاتِ خود یہ کوئی معنی نہیں رکھتی، سوائے اس کے یہ چند لوگوں کا ایک مجموعہ ہے جو کسی خاص تعلق کی بنا پر

Marfat.com

ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس طرح "خالص" قومیت پرستی کا نعرہ ایک رجعت پسندانہ نعرہ بن گیا "جدید فکر رکھنے والے دانشور اور آزاد خیال مفکر بڑے شدومد سے اور صاف صاف الفاظ میں اس کی مذمت کرتے ہیں اور وہ وحدتِ انسانیت اور عالمی رابطے کی طرف دعوت دیتے ہیں" یہ اشتراکی علمبرداروں نے اپنے خیالات عالمگیر قرار دیئے اور قومیت پرستی کی مذمت کی اور اسی اصول، عقیدے اور شعار پر قائم رہے۔ اس کے مقابلے میں جمہوریت پسند دنیا تھی۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے وہاں سے ابتدا کی جہاں یورپ نے اختتام کیا اور اس طرح کمزور ملتِ اسلامیہ داخلی طور پر غیر معتبر ہو گئی۔ قومیت پرستی کا دور وہاں تو ختم ہو گیا مگر مشرق میں اسلامی ممالک نے اسے اپنا لیا حالانکہ اسلام وہ پہلا دین تھا جس نے اصول اور عقیدے کی بنیاد پر انسانی رشتوں کو استوار کیا۔

یہ تھی اسلام کی عالمگیری۔ البتہ انسان کے تمام امور اور انسانی جماعتوں کی تنظیموں اور اصولوں کے مشمولات کے بارے میں ہم تفصیل سے اُس وقت بات کریں گے جب ہم اسلامی نظاموں کو بیان کریں گے۔

عبادت، عمل اور ذمہ داری

عبادت

اسلام میں بھی دوسرے مذاہب کی طرح، فرائض اور واجبات کی اولین حیثیت ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان اپنے دل اور دیگر اعضا سے اقرار کامل اور مطلق عاجزی اور خضوع و خشوع کرتا ہے۔ یہ عاجزی اور الحاح فقط خدائے لم یزل کے لیے ہوتا ہے اور دوسری تمام موجودات باطل قرار پاتی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں عبادت ہی کو غایتِ تخلیق قرار دیا گیا ہے، خواہ انس و جن ہوں یا جمادات و نباتات، تمام موجودات اسی ذاتِ واحد کی حمد و تقدیس بجا لاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہا ہے:

"وما خلقت...... الا لیعبدون" [۳۸]

عبادت کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام نے دی، یہاں تک رسالت و نبوت حضور ﷺ پر ختم ہو گئی

"ولقد بعثنا...... ان اعبدوا اللہ" [۳۹]

Marfat.com

لاتعداد لوگ اس کی غرض وغایت کو نہ پاسکے کیونکہ (ان کے نزدیک) عبادت دقت طلب اور ان کی پہنچ سے باہر تھی اور اس کے لیے بڑی توجہ اور بیدار مغزی کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ اللہ کے سوا دوسری اشیاء کی عبادت کرنے لگے جن میں پتھر، درخت، ستارے اور لوگ شامل تھے۔ وہ ان کے سامنے اسی عاجزی سے سر جھکاتے اور اپنی خواہشات اور حاجات کو اللہ کے سوا دوسرے خداؤں سے طلب کرتے۔[۳۵] اسی لیے اللہ کے رسول آتے رہے کہ لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کریں، اللہ کے سوا دوسری اشیاء وغیرہ کی عبادت کا لغو پن بیان کریں اور اُن سے یہ عہد و میثاق لیں کہ وہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔[۳۶]

چونکہ عبادت، دوسری تمام موجودات کی طرح وجودِ انسانی کی غایت بھی ہے، اس لیے اس کے مفہوم صرف اس خاص معنی تک محدود نہیں جن کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے اور اس کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ ان مخصوص شعائر میں محصور ہو جاتی ہے جنہیں کوئی مومن ادا کرتا ہے۔ در اصل عبادت کے دو معنی ہیں: ایک عام اور دوسرا خاص۔

عبادت اپنے عام معنی میں یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا کی رضا طلبی کے لیے اور شریعت الٰہی کے مطابق بسر کرے۔ اس لیے ہر وہ عمل جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے اور حقوق العباد کی پاسداری کی خاطر ہو جن میں فقط اللہ ہی کی خوشنودی مقصود ہو اور اس کے ذریعے زمین میں اصلاح کا حکم اور فساد سے مناہی مطلوب ہو، عبادت تصور ہوگا۔ اس لحاظ سے انسان کے وہ تمام اعمال جن میں وہ دنیاوی منفعت تو حاصل کرتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ہی کی رضا بھی مقصود ہوتی ہے، عبادت ہی بن جاتے ہیں جس نے کوئی کھیت اگایا یا پودا لگایا اور اس سے انسان یا جانور کو نفع پہنچا تو اس کا صدقہ شمار ہوگا۔ جس نے اپنے بال بچوں کی پرورش کے لیے بھاگ دوڑ کی، نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا یا کوئی نیک کلمہ ہی کہا تو وہ صدقہ ہی سمجھا جائے گا بشرطیکہ اس کی نیت اللہ کے لیے پُرخلوص ہو۔

کعب بن عجرہ رضؓ کہتے ہیں: نبی کریمؐ کے سامنے سے ایک شخص گزرا تو صحابہؓ کرام نے اس کی ہمت اور جانفشانی کی تعریف کی اور کہا: "کاش یہ اللہ کے لیے ہوتا"، حضورؐ نے فرمایا:

"اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے محنت کرتا ہے تو یہ اللہ ہی کے لیے شمار ہوگی اور اگر محض نام و نمود کی خاطر اور ریاکاری ہے تو شیطان کے لیے سمجھی جائے گی۔"[۳۷]

حضرت ابوذر غفاری رضؓ کہتے ہیں: لوگوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! اہلِ ثروت کے لیے تو کئی اجر

Marfat.com

ہیں وہ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور ہماری طرح روزہ بھی رکھتے ہیں مگر (مال کی کثرت کے سبب) خوب صدقہ بھی کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"کیا اللہ نے تمہارے لیے صدقے کے کئی مواقع پیدا نہیں کیے؟ تمہاری ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، ہر تمہید صدقہ ہے اور ہر (لا الٰہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، بُرائی سے روکنا صدقہ ہے، تمہاری نسل کشی میں صدقہ ہے۔"

حاضرین نے کہا: یا رسول اللہؐ! اگر ہم اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کریں (حلال طریقے سے) تو کیا اس میں بھی اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"اگر یہ حرام ہوتا تو کیا گناہ نہ ہوتا؟ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے، اس لیے اس میں بھی اجر ہے۔"[۴۳]

معنیٰ خاص میں محض عبادت کو کافی سمجھنا اور نظام اجتماعی کے قیام سے بے نیازی برتنا، مفہوم اسلام سے انحراف ہے[۴۴] روایت بیان کی جاتی ہے کہ نبی کریمؐ نے کسی شخص کو دیکھا کہ لوگوں پر بوجھ بنا ہوا تھا آپؐ نے اس کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے کہا: یہ ہمارا عابد (یا پیر) ہے۔ آپؐ نے پوچھا اسے کھلاتا پلاتا کون ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہم سب۔ آپؐ نے فرمایا: "تم سب اس سے بہتر ہو۔" اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ آپؓ نے وہی پوچھا جو نبی کریمؐ نے پوچھا تو لوگوں نے کہا اس کا بھائی (اسے کھلاتا پلاتا ہے)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس کا بھائی اس سے زیادہ عبادت گزار ہے[۴۵] رسول کریمؐ کی حدیث ہے:

"میں تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں مگر میں نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔ روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔"[۴۶]

معناً اور حقیقتاً، عبادت ہی عبودیت ہے، اور ہر وہ بات، جس میں عبد، معبود کی اطاعت کرتا ہے، عبادت ہے۔ خاص معنی میں عبادت سے مراد نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزے رکھنا، اور اگر مقدور ہو تو حج کرنا ہے۔ یہ سب واجبات دراصل سچی اور کامل عبادت کی تربیت میں سے ہیں[۴۷]

عبادات کی وہ قسم، جس کے خاص معنی دینی فرائض کا ادا کرنا ہے، دراصل فرد کی بھلائی یا جماعت کی بھلائی یا بیک وقت دونوں کی بھلائی ہے۔ ان کا مقصد جماعت کو چھوٹے چھوٹے کاموں اور دنیا کے

Marfat.com

تنگیوں سے بلند کرنا اور ان محدود مشاغل کی پریشانیوں سے آزاد کرنا ہے۔ جب بھی انسان مادی منفعت اور رہوا اور ہوس میں گرفتار ہو جائے تو پُر خلوص اور مسلسل عبادات اُسے قریبی مقاصد سے بلند تر مقاصد تک پہنچاتی ہے۔ اس معنی میں عبادت انسان کو ہمیشہ اس کا روحانی وجود یاد دلاتی رہتی ہے اور جسمانی مقاصد سے اس کی توجہ ہٹا دیتی ہے۔ اسے باور کراتی ہے کہ اس کے زائل ہونے والے وجود سے پرے ابدی زندگی بھی ہے، اور یہ بھی کہ اس زندگی سے ماورا، جو مشاغل دنیا تک محدود ہے، ایک ایسی زندگی بھی جو لافانی ہے[48]

استاذ محمد ابو زہرہ نے کیا خوب کہا ہے کہ عبادات سے دو نتائج حاصل ہوتے ہیں[49]

اولاً: وجدانِ دینی کی تربیت کی خواہش جو مومن کو اسلام سے پیوست کر دیتی ہے، اور اس یک رنگی سے ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جس میں آپس میں محبت اور یگانگی ہوتی ہے۔

ثانیاً: اسلام میں عبادات کی غرض و غایت محض منفی قسم کا تقویٰ پیدا کرنا نہیں بلکہ دنیا بھر میں تمام انسانیت کی بہبود مطلوب ہے، اور ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو بغض اور نفرت کی بجائے محبت اور حسنِ سلوک پر مبنی ہو۔ عبادت میں اخلاص اللہ کی علامت یہ ہے کہ وہ دل کو پاک کرے شرفِ انسانی میں اضافہ کرے اور فرد و معاشرے میں محبت اور الفت پیدا کرے جس میں نہ ریاکاری ہو نہ مبالغہ آرائی۔

اسلامی عبادات کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ صرف خدائے واحد کے لیے ہیں۔ کوئی عبادت گزار عبادت کے دوران میں خدا کے سوا کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتا اور صرف خدائے مطلق کے آگے جھکتا ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ انسان اور اس کے رب کے درمیان یہ ایک ذاتی تعلق ہوتا ہے جس میں کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی نمازی نماز ادا کرنا چاہے تو اُسے اس کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ کوئی دربان اُسے ٹوک سکتا ہے۔ وہ کسی ترجمان کی مدد کے بغیر اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کا دل اور اس کے اعضا سب کے سب اللہ کے حضور میں پیش ہوتے ہیں کیونکہ فطرت انسانی مادیت اور روحانیت دونوں کا مرکب ہے۔ عبادت اللہ کے آگے عاجزی سے عبارت ہے اور اسی کا مظہر ہے، اور اسی طرح کمی بیشی کے بغیر ادا کی جاتی ہے جس نے شریعت نے مقرر فرما دی[50] گویا یہ توفیقی امر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی تعبیر و تفسیر، چھان پھٹک یا بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں اور عقل کی رو سے اسے

Marfat.com

جرح و تعدیل کی کسوٹی پر بھی نہیں کسا جا سکتا۔ اسے ترک کرنے یا اس کے سوا کسی اور کام کی طرف مائل ہونے کے بارے میں بھی عقل کی بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔[52]

نماز، اسلامی عبادات کا رکن اول ہے اور در اصل یہ اللہ کے دربار میں حاضری اور اس سے مناجات کا نام ہے۔ نماز سے ہی انسان دن کا آغاز کرتا ہے۔ پھر دو بار دن میں نمازیں ادا کرتا ہے، پھر شام کو دن کا اختتام نماز سے کرتا ہے اور رات کا استقبال بھی اللہ کے حضور قیام سے کرتا ہے، گویا اپنے اعمال میں اللہ سے ہدایت طلب کرتا ہے اور بیداری سے لے کر رات کو آرام کرنے تک اپنے سب اعمال کا حساب اُسے پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ دن کی ابتدا نماز فجر سے کرتا ہے، جس میں اللہ کی عظمت و جبروت کو یاد کرتا ہے، اس سے ایک نور سا اُس کے دل میں پھوٹتا ہے اور وہ اپنے کام قلب سلیم سے شروع کرتا ہے اور اسی پاکیزہ نفس کے ساتھ لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ جب دل پر زنگ لگنا شروع ہوتا ہے اور اللہ کی یاد سے غفلت ہونے لگتی ہے تو نماز ظہر کا وقت آجاتا ہے، پھر عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرتا ہے اور اپنے دن کا اختتام اسی طرح اللہ کی یاد میں مصروف ہو کر کرتا ہے، جس طرح اُس نے آغاز کیا تھا۔[52]

نماز کی تیاری ہاتھوں اور دوسرے اعضا کی طہارت سے ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ یاد دلانا ہے کہ چونکہ نماز تطہیر قلب کا نام ہے، اس لیے طہارت اس کا جوہر ہے اور یہ صرف ذکر، دعا اور تلاوت تک محدود نہیں، اور یہی جذبہ رکوع، سجود اور قیام کی تمام حرکات میں پیش نظر ہوتا ہے تاکہ اللہ کے آگے خضوع و خشوع، اس کی عظمت اور تقدیس کے معنی راسخ ہو جائیں جس طرح اس کے اعضاء وجوارح عاجزی اختیار کرتے ہیں، اسی طرح اس کا دل بھی خدا کے آگے جھکتا ہے اور جس طرح اس کا وجدان اللہ کی عظمت بیان کرتا ہے، اسی طرح اس کی زبان خدا کی تعظیم کرتی ہے۔ ان سب باتوں سے یہ تاکید ہوتی ہے کہ نماز ادا کرتے وقت حضورِ قلب بنیادی شرط ہے۔ نماز وہی ہے جو سوچ سمجھ کر ادا کی جائے اور اگر اس میں اللہ کا ذکر اور غور و فکر نہ ہو تو وہ قبول نہ ہو گی بلکہ ایسی نماز ادا کرنے والا قابلِ مذمت۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"فویل للمصلین ...... یمنعون الماعون"[53]

اس بنیادی عبادت کو، جو عمودِ اسلام اور اس کا رکن اصلی ہے آسان بنانے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو سجدہ گاہ بنا دیا ہے کہ جب وقت آئے تو کسی بھی جگہ پر بھی انسان نماز ادا کر لے اور

Marfat.com

اپنے خالق کو یاد کرے۔ اس طرح اللہ نے باقی سب عبادات میں بھی لوگوں کے واسطے کی ضرورت نہیں رکھی کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان حائل ہوں۔ اگر کئی افراد مل کر نماز پڑھیں تو ان میں سے سب سے زیادہ قرآن جاننے والا، عالم اور دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والا مسلمانوں کی امامت کرے گا۔ اگر سب لوگ ہر لحاظ سے برابر کا مرتبہ رکھتے ہوں تو کوئی بھی امامت کا حق ادا کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ نماز اچھی طرح ادا کرے۔ اور اس کی کیفیت سے واقف ہو۔

اسلام نے نماز باجماعت ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے اور اسی لیے صلوٰۃ الجمعہ کو خاص طور پر باجماعت ادا کرنے کو کہا کیونکہ نماز باجماعت سے آپس میں اتحاد، محبت اور اخوت پیدا ہوتی ہے اور انہیں یک دل اور یک جان کر دیتی ہے۔ جب بھی مسلمان مل کر اپنے رب کے آگے عاجزی کریں گے اور اسی کے سامنے رکوع و سجود کریں گے تو ان کے دل ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں گے اور ان میں اخوت کا شعور پیدا ہوگا۔ نماز باجماعت، اطاعتِ امیر بھی سکھاتی ہے، جیسے مسلمان اپنے میں سے منتخب کر لیتے ہیں اور انہیں تنظم وضبط اور وقت کی پابندی کا عادی بناتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی غمگساری اور ایک دوسرے سے ہمدردی، مساوات اور باہمی الفت کا درس بھی دیتی ہے۔ امیر ہوں، یا فقیر، بڑے ہوں یا چھوٹے، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ سب کندھے سے کندھا ملا کر خدائے واحد کو یاد کرتے ہیں۔ اور اسی خدائے کامل کی بندگی ان کا شعار ہوتا ہے۔

روزوں کی عبادت سے انسان کے وجدان کی تربیت اور نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ روحانی ریاضت کا مہینہ ہے اور اس میں دن بھر لذات و شہوات سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے۔ روزوں کا مطلب صرف یہ نہیں کہ انسان صرف جسمانی لذائذ کو ترک کر دے بلکہ اسے اپنے کانوں، آنکھوں، زبان ہاتھوں، پاؤں اور تمام دیگر اعضاء کو گناہ سے باز رکھنا ہوتا ہے اور دل کو ناپاک ارادوں اور دنیاوی فکروں سے آزاد کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ صرف اللہ عزوجل کا ہو جائے۔

ماہ صیام میں انسان اپنے کھانے پینے میں، جسم کو فراموش کر کے، صرف روح کا حق یاد رکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک ہے اور اپنے جسم کو بے لگام نہیں رہنے دیتا، بلکہ جسم کو اجازت نہیں دیتا کہ اس کی لگام تھام لے اور اس کی خواہشات پر جسم کا تصرف ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ارادے کے پس منظر میں خشیت الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ خدا خبیر و بصیر ہے۔ اسی طرح آخرت پر ایمان، اللہ کے دربار میں حاضری اور قرآن اور رسول کی اطاعت وہ

Marfat.com

اپنے دل سے کرتا ہے۔

جہاں تک عبادت زکوٰۃ کا تعلق ہے، تو یہ انسان کو یاد دلاتی کہ اس کے اُس مال میں جسے اس نے محنت سے اور اپنے عمل سے کمایا ہے، جماعت کا بھی حصہ ہے۔ زکوٰۃ اُسے یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ وہ دوسرے سے وہی سلوک کرے جو اپنے ساتھ کرتا ہے۔ دراصل یہ نفس کا امتحان ہے کہ وہ مال و متاع سے کس قدر محبت رکھتا ہے۔ زکوٰۃ روحانی عبادت ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے وہ اسے اپنی مرضی سے، اپنا محاسبہ کرتے ہوئے ادا کرتا ہے اور اُسے اپنے اوپر اللہ کا احسان سمجھتا ہے، ٹیکس یا بوجھ نہیں۔ یہ ایک دینی فریضہ ہے، جو دوسرے دنیاوی ٹیکسوں ہی کی طرح جمع کی جاتی ہے لیکن اس کا حساب اللہ کو دینا ہوگا۔ قرآن مجید میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا ذکر کئی آیات اکٹھا آیا ہے۔ گویا مسلمانوں کی زندگی میں زکوٰۃ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی صلوٰۃ، اور اس کے ادا کرنے سے انسان ایثار و قربانی کے اوصاف اختیار کرتا ہے، خود غرضی، حب لذات، تنگ دلی اور زر پرستی سے بچتا ہے اسلام کو ایسے لالچی اور حریص انسان کی ضرورت نہیں، جو دولت کے پجاری ہوں اور سانپ بن کر خزانے پر بیٹھے ہوں۔ اسلام تو ایسے انسانوں کو پسند کرتا ہے جو صاف ستھرے ہوں۔ اللہ کی راہ میں اپنی محنت سے کمایا ہوا مال قربان کر سکیں اور اسے ادا کرنے میں کوئی ذاتی غرض شامل ہو نہ ریاکاری۔ زکوٰۃ حقیقت میں مسلمانوں کو ایسی ہی قربانی کی تعلیم دیتی ہے کہ جب ملک و ملت کو ضرورت ہو تو ہنسی خوشی اور کھلے دل سے اپنا مال خرچ کرنے سے گریز نہ کریں۔

اسلام ایسا دین ہے جو تمام انسانوں کو رب العالمین کی عبادت کی طرف بُلاتا ہے۔ حج بھی ایسا ہی فریضہ ہے جو مسلمانوں کو مختلف ملکوں سے نسبت رکھتے اور قوموں اور نسلوں کے اختلاف کے باوجود انسانیت' سے محبت اور اخوت کا درس دیتا ہے۔ حج بدنی اور مالی عبادت ہے، جس کی خاطر دُور دُور سے مسلمان اللہ کے گھر میں جمع ہوتے ہیں اور اس کے مہمان بنتے ہیں۔ اس عبادت کے دوران میں وہ اپنے اہل و عیال مال و دولت اور اپنی خوشحالی و تونگری کے تمام مظاہر بھلا دیتے ہیں اور اُس روحانی "دسترخوان" پر جمع ہوتے ہیں جہاں انہیں تقویٰ اور اللہ کی خوشنودی پیش کی جاتی ہے۔ موسم حج میں انسانی وحدت کے جو نشان مسلمان مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان میں ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے آثار بھی ہیں جن سے انہیں تمام ادیان سماوی کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی اصل ایک ہے اور اقالیم و اجناس کے تفرقے کے بغیر مطلق مساوات ہی مطلوب و مقصود ہے۔ اس کے علاوہ، حج اللہ کو ہمیشہ یاد رکھنے کی

Marfat.com

تلقین کرنا ہے۔ اور اللہ کی یاد دلوں کی دوا اور سہمے ہوئے نفوس کے لیے قرار ہے، جو اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔

ان مخصوص عبادات پر آیاتِ الٰہیہ اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر، اللہ کے ذکر، قرآن کی تلاوت دعا، استغفار اور اللہ کے ایک ہونے اور محمدؐ کے نبیؐ برحق ہونے کی شہادت کا اعتبار کیا جا سکتا ہے ان میں ہر ایک انسان کو اپنا روحانی وجود یاد دلاتی ہے جو اس کے وجودِ خاکی سے زیادہ بلند اور زیادہ پائیدار ہے۔

عمل

عمل بھی عبادت کے عام معنوں میں، عبادت ہی کی قسم ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے تخلیق کیا کہ وہ اس کرۂ ارض کو نیک اعمال سے اور نیکی کے لیے آباد کرے۔ اس کائنات میں خوشی سے ہمکنار اور اس میں جتنے خزائن ہیں ان سے استفادہ کرے۔

اسلام میں عمل اپنے نتیجے سے منسلک ہے جو اس کے لیے مرتب ہونا ضروری ہے، یعنی اللہ کا شکر اور استغفار اور اس دنیا میں کیے گئے ہر عمل کی آخرت میں مکمل جواب دہی۔ اللہ نے فرمایا:

"ھوانشأکم ...... قریب مجیب" [۵]

انسان اسی زمین سے پھوٹا ہے، جس کی تعمیر اللہ نے اس کے سپرد کر دی ہے اور اُسے نیکی کے راستے کا جویا بنایا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت خدا کو یاد رکھے اور توبہ و استغفار کرتا رہے اور یہ پختہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر پُرخلوص توبہ اور ہر عملِ خالص کو قبول فرماتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت چلی آتی ہے کہ انسان زمین پر، یا زمین کے اندر کی نعمتوں یا رزق اور خزانوں کو اپنی محنت اور عمل کے بغیر نہیں پا سکتا:

"ھوالذی جعل .... و امن رزقہ" [۶] جو چلتا پھرتا ہے وہی رزق حاصل کرتا ہے اور جو چلنے پھرنے پر قادر ہونے کے باوجود حرکت نہ کرے تو وہ اس لائق ہے کہ رزق سے محروم رہے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اپنے گھر یا مسجد وغیرہ میں بیٹھا رہے اور کہے کہ جب تک مجھے میرا رزق نہیں ملے گا میں کوئی عمل نہیں کروں گا۔ امام نے کہا: "اس شخص کا علم جہالت ہے، کیا اس نے نبی کریمؐ کا قول نہیں سنا کہ میرا رزق میرے

Marfat.com

نیزے کے پیچھے بنایا گیا ہے "[56] جب آپؐ سے پرندوں کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ لوٹتے ہیں"۔ وہ طلبِ رزق میں دن گزارتے ہیں۔ اصحابِ رسولؓ بحر و بَر میں تجارت کرنے اور کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی مثال پیشِ نظر رکھو۔[57]

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے کچھ لوگوں کو نماز کے بعد مسجد میں جم کر بیٹھے ہوئے دیکھا، جو اللہ پر توکل کے دعوے دار تھے تو آپ اپنا درّہ لے کر ان پر پل پڑے اور فرمایا:

"طلبِ رزق کی خواہش لے کر کوئی بیٹھا نہ رہے اور یہ نہ کہے: اے اللہ مجھے رزق دے آسمان سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"فاذا قضیت الصلوٰۃ .... من فضل اللہ"[58]

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا اور کائنات کو اندازے، نظام اور ترتیب سے بنایا ہے اور وہ عقل انسانی کی محتاج ہے کہ اس کے اصول و قواعد پر غور کر کے عمل کرے کیونکہ یہی اس کی مشکلات کا حل اور اس سے استفادہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اُسے جدوجہد کی ضرورت ہے اگر انسان ان قوتوں کو، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک مدت کے لیے پیدا کیا، کام میں لانے سے قاصر رہے یا اس کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مقاصدِ تخلیق کی مخالفت کر رہا ہے اور احکامِ خداوندی سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص محنت کرتا ہے اور اپنی طاقت استعمال میں لاتا ہے وہ اللہ کی خوشنودی اور بخشش پانے کا سزاوار ہے:

"فمن کان .... عملاً صالحاً"[59]

اسی باعث مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُن تمام راستوں کو طے کریں جن سے اس کائنات کے اسرار کھُل سکیں اور ان اسرار سے انسان کا فائدہ حاصل ہو بلکہ صرف یہی کافی نہیں، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس میدان کے شاہسوار بنیں جس طرح وہ ایمان باللہ، عبودیت اور اخلاقِ کریمہ کے معاملے میں لوگوں کے سردار بنے تھے۔ دراصل مسلمان خطاکار ہیں اگر کوئی علم نافع یا مفید ہنر دوسروں کے پاس ہو اور وہ اس سے ناواقف ہوں۔ اسی وجہ سے عمل بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ ہے جسے ہر مسلمان اسی طرح پورے خلوص سے ادا کرتا ہے جس طرح وہ نماز کو خضوع و خشوع سے ادا کرتا ہے۔

کوئی شخص محض اسی وجہ سے تارکِ عمل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے کیونکہ کوشش بھی جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔

Marfat.com

"وآخرون یضربون...... فی سبیل اللہ"[41]

نہ کوئی شخص اسے حقیر یا توہین آمیز خیال کرتے ہوئے ترک کر سکتا ہے کیونکہ اسلام میں عمل کی خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، بڑی قدر و منزلت ہے اور جو کوئی گھمنڈ کرتا اور دوسروں پر "توکل" کرتا ہے، اسلام اُسے حقارت سے دیکھتا ہے اسی لیے تمام انبیاءؑ بھی محنت اور کام کرتے تھے۔ اللہ نے جس نبی کو مبعوث کیا اس نے شبانی کی۔ لوگوں نے کہا: آپ، یا رسول اللہ؟ فرمایا: "میں اہل مکہ کے جانور چرا تا رہا ہوں"[42] رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا:

"ہاتھ کی کمائی سے کھانا، سب سے بہتر کھانا ہے بے شک اللہ کے نبی، داؤدؑ بھی محنت کر کے کماتے تھے"[43]

اسلام کے بڑے بڑے سرداروں اور سرخیلوں کا بھی یہی عمل تھا۔ ان میں بزاز بھی تھے اور ساز بھی، شیشہ گر بھی تھے اور دوزی بھی، سبزی فروش بھی تھے اور تاجر بھی، صابون فروش بھی اور روٹی بیچنے والے بھی، بے شمار فقہا، مصنفین اور متبحر علما، اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔[44]

محض "توکل" اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کو اسلام نے مسلمانوں کے لیے ناپسند کیا ہے۔ یہ نہ صرف اس کی تخلیق کے مقاصد کے خلاف ہے بلکہ عبادت کے معنوں میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھی متعارض ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو اس دنیا میں مسندِ صدارت سے محروم کر دینا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ مقدر رہا کہ وہ امتیازی مرتبے کی حامل ہو، خود زمانے کو سازگار بنائے اور جملہ اقوام کے درمیان اعلیٰ حیثیت اور درجہ پائے۔

"وکذلک جعلناکم...... علیھم شھیدا"[45]

یہ "گواہی" عام اور جامع ہے، زندگی کے ایک ہی پہلو یا طرزِ عمل ایک ہی نوع تک محدود نہیں۔ یہاں ہم قرآن سے چند آیات درج کرتے ہیں جو عمل کی فضیلت اور اہمیت ظاہر کرتی ہیں:

"عمل صالحاً...... ما کانوا یعملون" (النحل: ۹۷)

"ومن احسن قولاً...... انتی من المسلمین" (فصلت: ۳۳)

"ان الذین آمنوا...... من احسن عملاً" (الکہف: ۳۰)

"ولقد آتینا...... بما تعملون بصیر" (سبا: ۱۰-۱۱)

"فمن کان یرجو...... عملاً صالحاً" (الکہف: ۱۱۰)

Marfat.com

"فاستجاب لھم ...... ذکر او انثی" (آل عمران: ۱۹۵)

"الیه یصعد ...... یرفعه" (فاطر: ۱۰)

ذمہ داری اور جواب دہی

منطقیوں کے نزدیک انسان (اپنی عقلی برتری کے لحاظ سے) حیوان ناطق ہے۔ معاشرتی علوم کے ماہرین (انسان کے اجتماعی تعلقات کے پیش نظر) اُسے مدنی الطبع حیوان سمجھتے ہیں۔ شریعت کے لحاظ سے بھی انسان کی تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو مکلّف بنادی گئی ہے۔ کیونکہ اس کرۂ ارض میں بسنے والے تمام مخلوقات کے مقابلے میں اُسے پابند اور جواب دہ بنایا گیا ہے۔ قرآن اسی پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

انا عرضنا ...... وحملھا الانسان [66]

ایک اہم سبب کی وجہ سے انسان کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس کائنات میں وہ واحد ایسی مخلوق ہے جسے ارادے کی آزادی عطا کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ چاہے تو قانون و قواعد اور اقدار کی پابندی گوارا کرے اور چاہے تو انہیں ترک کر دے۔ جمادات میں نہ ارادہ ہے نہ اختیار، اور وہ اللہ کے احکام کے پابند ہیں۔ حیوانات میں اللہ نے جبلی طور پر ایسی خصلتیں رکھ دی ہیں کہ وہ ان سے کسی طرح انحراف نہیں کر سکتے۔ شیر کبھی گھاس نہیں کھائے گا اور بکری گوشت نہیں کھاتی۔

مگر انسان کو کسی اور طبیعت پر پیدا کیا گیا ہے۔ ایک طرف زندگی کے بعض پہلوؤں میں اللہ تعالیٰ نے اُسے کائناتی قوانین کا پابند بنایا ہے جس سے انحراف انسان کے لیے ممکن نہیں۔" ایک طرف اس پر اس فضا کے قوانین عائد ہوتے ہیں جس میں وہ سانس لیتا ہے، پھر جسم کے اصول ہیں مثلاً نظامِ ہضم، دورانِ خون، پھر حرارت اور روشنی کے قوانین ہیں، جن سب کا وہ پابند ہے۔ دوسری طرف اسے قدرت ارادہ و اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے افعال و اعمال میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے خود مختار ہے۔" [67] اسی ارادے کی موجودگی، انسان کو ان تمام اعمال کے لیے جوابدہ بناتی ہے جو وہ عمر بھر کرتا ہے۔ انسان کا عروج و زوال دونوں اس بات سے مشروط ہیں کہ اُسے مکلف بنایا گیا ہے اور اُسے ارادے کی آزادی دے کر جواب دہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مکلف ہونے کی صورت میں وہ اتنا بلند ہو سکتا ہے کہ اس زمین پر خلیفہ کا منصب حاصل کر سکتا ہے اور گرنے پر آئے تو اسفل سافلین ہو جائے۔ ہر عمل کے لیے

Marfat.com

ہر انسان انفرادی طور پر جواب دہ ہے۔ یہ انصاف سے بعید ہے کہ اسے ایسی خطاؤں کے نتائج بھگتنے کے لیے کہا جائے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوئیں اور یہ بھی انصاف نہیں کہ دوسروں کی نیکیوں کا اجر سمیٹ لے۔ اس بارے میں قرآن کی چند آیات اشارہ کرتی ہیں:

"ام لم ینبّا .... وزد اُخری" (النجم: ۳۶-۳۸)

"بلیٰ منا کسب .... اصحاب النار" (البقرہ: ۸۱)

"والسارق والسارقۃ .... بما کسبا" (المائدہ: ۳۸)

"ثم توفی .... لایظلمون" (البقرہ: ۲۸۱)

"لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت" (البقرہ ۲۸۶)

"ووفیت کل .... لایُظلمون" (آل عمران: ۲۵)

"الیوم تجزیٰ .... لاظلم الیوم" (غافر: ۱۷)

"تلک امۃ قد خلت .... یعملون" (البقرہ: ۱۳۴)

ذمہ داری اور جواب دہی کی بات کرتے ہوئے، مسئلہ قدر پر ضرور بحث چل نکلتی ہے کیونکہ یہ کائنات سے انسان کے ابدی تعلق کی بنا پر ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، جیسے کہ ارادہ و اختیار انسانی اہم ہے۔ اس مسئلے پر اسی روز سے بحث جاری ہے جب سے انسان نے اپنے آپ کو جانا اور شاید روزِ حشر تک جاری رہے گی۔ اسلام سے زیادہ کسی اور مذہب نے اس مسئلے کا بہتر حل پیش نہیں کیا۔[۹۸]

ہندوؤں میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ تمام مخلوقات میں (انسان ہوں یا حیوانات، یا نباتات یا جمادات) صرف تقدیر ہی اوّل و آخر ہے۔[۹۹] آتش پرستوں کے نزدیک موجودات دو خداؤں میں بٹی ہوئی ہیں: ایک خدائے نور اور دوسرا خدائے ظلمات۔ جس چیز پر خدائے نور کا غلبہ ہو وہ نیکی ہے اور جس پر خدائے ظلمات کا غلبہ ہو وہ بدی ہے۔ خیر و شر کی اس دائمی آویزش سے خود خدائے نور بھی محفوظ نہیں۔ یونانیوں کا عقیدہ ہے کہ تقدیر عبد اور معبود دونوں پر غالب ہے۔ یہودیوں کے ایک فرقے کا خیال ہے کہ تقدیر کا حکم غالب رہتا ہے، مگر ایک فرقے کو سب فرقوں پر فضیلت حاصل ہے اور ان کی اولاد کو باقی سب کی اولاد پر سبقت ہے اور ان کے اعمال و افعال سے چشم پوشی کی جاتی ہے عیسائیوں کا خیال ہے کہ حقیقی دین صرف اُن کا ہے کیونکہ "گناہِ اوّل" کا عقیدہ تقدیر کی بالادستی ظاہر کرتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے آدمؑ کے "گناہ" اور اس کی اور جملہ بنی آدم کی موت

Marfat.com

میں ایک ربط ہے ۔؎

فلاسفہ میں سے واقعیین کہتے ہیں کہ انسان ارادے اور اختیار کا مالک ہے لیکن یہ ارادہ انسان کی میراث، جسم اور معاشرے کی حدود میں مقید ہے۔ مثلاً اس کی پیدائش اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے لیکن وہ نہیں چاہتا جو چاہتا ہے۔ فلاسفہ کا ایک اور فرقہ روحیون ہے جن کا خیال ہے کہ انسانی جسم مادّے کے حکم کا پابند ہے۔ اس کی روح آزاد اور خودمختار ہے جو کبھی تو (اپنی مرضی سے) جسم کے زیرِ نگین ہوتی ہے اور کبھی جسم کو زیرِ نگیں کر لیتی ہے۔

یہ تمام عقائد اور مذاہب تقدیر کے مسئلے کا ایسا حل پیش نہیں کرتے جو قلب و عقل کو مطمئن کر سکے، جیسا کہ اسلام نے کیا ہے کہ اللہ کے وجود پر ایمان کے ساتھ عقل کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ کی قدرت اور حکمت سے، اور قدرت اور حکمت کے درمیان عدل سے انکار کر سکے۔ عقل کے لیے یہ تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں کہ انسان مکلف اور حجر جامد اختیار میں برابر ہیں۔ دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا کسی فعل پر ندامت کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے اور اسے اللہ کی قدرت اور اس کے انصاف کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا احتیاج ہوتی ہے۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ خدائی عدل کا ایک نظر سے احاطہ کرنا ممکن ہے، نہ وہ ایک حالت میں محدود ہے کسی اچھی تصویر میں سیاہ دھبا بدنما داغ ہے۔ اگر ہم تصویر کو چھپا دیں اور صرف دھبے کو دور سے دیکھیں۔ لیکن یہی سیاہ دھبا اس تصویر میں استعمال کیے گئے رنگوں میں سے ایک رنگ بھی ہے جس سے مفر نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ تصویر کا حسن بڑھا دیتا ہے اور اس کے بغیر اس کی دلکشی اور جمال ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم اپنی زندگی میں کسی حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو آنسو بہاتے ہیں پھر کچھ دیر بعد ہم ہنسنے بھی لگتے ہیں، یا کوئی گمشدہ چیز مل جائے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔

کائنات کے گزشتہ ایک ہزار برس پر نظر ڈالیے، ہمیں اس میں قدرتِ خداوندی اور عدلِ خداوندی میں ہم آہنگی کے کئی نشان ملیں گے، مگر پورے ایک برس تک بھی اس پر غور کرتے رہیں تو عین ممکن ہے ہمیں کچھ نہ ملے۔ کسی ایک واقعے کو جو دنیا کے کسی گوشے میں کسی خاص فرد پر گزرا ہو، یاد کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح ہم قدرتِ خداوندی کا اور عدلِ خداوندی میں موافقت کے قریب تو آ جاتے ہیں لیکن اس موافقت کے تمام دلائل کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ خود عقل کے لیے حکمتِ خداوندی کے دلائل کا احاطہ کرنا غیر معقول بات ہے کیونکہ عقل محدود ہے اور قدرت غیر محدود۔

Marfat.com

اس اساس پر ہم قرآن مجید کی اُن آیات کو سمجھ سکتے ہیں جو اللہ کی قدرت، انسان کی خود مختاری اور اپنی قدرت کو نافذ کرنے کے لیے عدلِ خداوندی اور انسان کی خود مختاری پر اس کے محاسبے سے متعلق ہیں :

"وما تشاءون...... کان علیماً حکیماً" [71]

"ولو شئنا لاٰتینا کل نفس " [72]

" ذالک بأن اللہ ...... ما بانفسہم" [73]

"کل امریٍٔ بما کسب " [74]

" والذین جاھدوا فینا لنہدینہم سبلنا" [75]

" ومن یرد...... " [76]

Marfat.com

حواشی

۱۔ مصطفیٰ السباعی : "من روائع حضارتنا" : ۱۴
۲۔ ایضاً ص ۶۴
۳۔ ایضاً ص ۶۸
۴۔ ایضاً ص ۷۰
۵۔ محمد جلال کشک : "الماركسية والغزو الفكرى" ص ۲۸
۶۔ ایضاً ص ۲۸ (نقل از استاذ وسیم خالد)
۷۔ سید قطب : ہذا الدین ۔ ص ۵۳
۸۔ ابوالحسن ندوی : ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین
۹۔ عباس العقاد : حقائق الاسلام ۔ ص ۱۹۱
۱۰۔ بنی اسرائیل : ۵۵
۱۱۔ البقرہ : ۲۵۳
۱۲۔ الزمر : ۹
۱۳۔ الزخرف : ۳۲
۱۴۔ النحل : ۷۱
۱۵۔ محمد قطب : شبہات حول الاسلام ۔ ص ۱۰۲
۱۶۔ الحجرات : ۱۰
۱۷۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد : المجتمع الاسلامی فی ظل العدالۃ ۔ ص ۳۸
۱۸۔ بخاری و مسلم
۱۹۔ ابوالاعلیٰ مودودی : بین الدعوۃ القومیۃ والرابطۃ الاسلامیۃ ۔
۲۰۔ ابوالاعلیٰ مودودی : مرجع سابق ، ص ۱۲

Marfat.com

۲۱۔ عبدالرحمٰن عزام: "الرسالۃ الخالدہ"۔ ص ۲۰

۲۲۔ "ہذا الدین"۔ ص ۸۳۔۸۴

۲۳۔ النساء: ۱

۲۴۔

۲۵۔ ابوالاعلیٰ مودودی: "بین الدعوۃ القومیۃ والرابطۃ الاسلامیۃ

۲۶ الحج: ۶۵

۲۷۔ النساء: ۹۷

۲۸۔ التوبہ: ۲۴

۲۹۔ ابوبکر البزار: مسند (حدیثِ حذیفہؓ)

۳۰۔ متفق علیہ

۳۱۔ مسلم، صحیح (حدیثِ جابرؓ)

۳۲۔ ابوالحسن الندوی: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین۔ ص ۱۹۹

۳۳۔ زین نور الدین زین: نشوء القومیۃ العربیۃ۔ ص ۹۰

۳۴۔ ایضاً۔ ص ۸۶

۳۵۔ "جمال پاشا کے دمشق پہنچنے سے پہلے، چند ترکوں نے دمشق اور بیروت میں فرانسیسی سفارتخانوں پر حملہ بولا اور وہاں اچھی طرح تلاشی لی۔ وہاں انہیں کچھ ایسے کاغذات ملے جن میں عربوں کی مشہور شخصیات پر الزام تراشی کی گئی تھی۔ ان دستاویزوں میں جس ذوق و شوق کا اظہار کیا گیا تھا، وہ خیانت پر دلالت کرتا تھا، لیکن جمال پاشا نے ارادہ کیا کہ عوام میں اچھا تاثر قائم کرے اس لیے اس نے صرف شریف حسین کے حالات ظاہر کرنے پر اکتفا کیا اور باقی اوراق کو الماری میں رکھ کر مقفل کر دیا۔" جارج انطونیوس: "یقظۃ العرب"

۳۶۔ برنارڈ لوئیس: مغرب اور مشرق اوسط

۳۷۔ ابوالحسن ندوی: العرب والاسلام، ص ۴۹

۳۸۔ الذاریات: ۵۶

۳۹۔ النحل: ۳۶

۴۰۔ قرآنِ کریم نے اس کی طرف کئی آیات میں اشارہ کیا ہے، مثلاً الانعام: ۵۶، مریم ۲۴-۴۴، ۴۴
المائدہ: ۷۶، العنکبوت: ۱۷، الشعراء: ۸۱، الزمر: ۳، سبا: ۴۱
۴۱۔ اس کے بارے میں بھی متعدد آیات ہیں، مثلاً البقرہ: ۸۳، التوبہ: ۳۱، النسا: ۱۷۲،
مریم: ۴۴
۴۲۔ معجم طبرانی
۴۳۔ صحیح مسلم
۴۴۔ محمد المبارک: "نظام الاسلام" "عبادت" کا باب
۴۵۔ محمد ابو زہرہ: المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام، ص ۹۸
۴۶۔ متفق علیہ
۴۷۔ المودودی: مبادیٔ الاسلام۔ ص ۹۴
۴۸۔ عباس محمود العقاد: حقائق الاسلام ص ۱۰۸
۴۹۔ المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام۔ ص ۹۶-۹۷
۵۰۔ محمد المبارک: نظام الاسلام
۵۱۔ عباس محمود العقاد: حقائق الاسلام۔ ص ۱۰۴
۵۲۔ محمد ابو زہرہ (مرجع سابق) ص ۹۱
۵۳۔
۵۴۔ ہود: ۶۱
۵۵۔ یٰس:
۵۶۔ روایت احمد از حدیث ابن عمر
۵۷۔ حدیث: "لو توکلتم علی اللہ ......"
۵۸۔ یوسف القرضاوی: مشکلۃ الفقر وحلھا فی الاسلام۔ ص ۴۶-۴۷
۵۹۔ الجمعہ: ۱۰
۶۰۔ الکہف: ۱۱۰
۶۱۔ المزمّل: ۲۰

Marfat.com

۶۲۔ صحیح بخاری

۶۳۔ صحیح بخاری

۶۴۔

۶۵۔

۶۶۔ الاحزاب : ۲۷

۶۷۔ نظام الاسلام : العقیدہ والعبادۃ ، ص ۸۲

۶۸۔ عباس محمود العقاد ؛ حقائق الاسلام ، ص ۸۱

۶۹۔ قرآن مجید کی بعض آیات کی یہ تفسیر ہو سکتی ہے کہ تقدیر کا مطلب کائنات کا کسی معین نظام پر چلنا ہے۔

۷۰۔ العقاد ؛ مرجعِ سابق ۔ ص ۸۲۔۸۳

۷۱۔ الانسان ؛ ۳۰

۷۲۔ السجدہ : ۱۳

۷۳۔ الانفال : ۵۳

۷۴۔ الطور : ۲۱

۷۵۔ العنکبوت : ۶۹

۷۶۔ آلِ عمران : ۱۴۵

Marfat.com

اسلام کے مختلف نظام

سیاسی نظام

بہت سے لوگ جو غیر ملکی تعلیمات سے متاثر ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ دین فقط انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ چند رسوم و عبادات کا نام ہے جنہیں انسان اللہ کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہوئے ادا کرتا ہے اور اس کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین صرف اس تعلق تک محدود ہے اور اس سے آگے امور زندگی کے سنوارنے روزی کمانے اور معاشرے کی تنظیم اور وہ اصول بنانے میں جو انسان کی فکری اور معاشرتی سرگرمیوں کو ضبط میں لاتے ہیں، اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام سیاسی، اقتصادی، مالی، عسکری، قانونی اور عدالتی اداروں سے بھی جو معاشرتی تنظیم کی صورت گری کرتے ہیں، دین کا کوئی علاقہ نہیں۔ اس عقیدے کے مالک امورِ دین اور امورِ دنیا کو الگ الگ کر دیتے ہیں اور امورِ دنیا صرف انسان کے سپرد کر دیتے ہیں، جنہیں دین سے کوئی مطلب نہیں۔

دراصل، اسلام ان کے تصور سے مختلف ہے کیونکہ اسلام انسان کے تمام امور کو منظم کرنے کے لیے آیا تھا۔ ان لوگوں کے تصور کے لحاظ سے یہاں تک تو درست ہے کہ یہ انسان اور مقررہ عبادات ادا کرنے کے طریقے میں ربط کا نام ہے، لیکن اس سے بھی آگے افراد اور معاشرے کے درمیان تعلقات مربوط کرنے کا نام بھی ہے، کیونکہ اسلام دین بھی ہے اور دولت بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، اخلاق بھی ہے اور شریعت بھی، سیاست بھی ہے اور حکومت بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں

Marfat.com

کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم اتنا وسیع اور جامع ہے کہ اس میں انسان کے وہ تمام اعمال شامل ہیں جن سے وہ خدا کی رضا کا طلبگار رہتا ہے۔ اس لیے وہ صرف اُن رسوم و افعال تک محدود نہیں جنہیں انسان مقررہ اوقات میں اور معین طریقے سے ادا کرتا ہے۔

اسی بنا پر ہم نظامِ اسلامی میں سیاسی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی تنظیموں کو شامل کرتے ہیں اور ان تمام تنظیمات کو اور ان کی غرض و غایت کو بیان کرتے ہیں کہ وہ دوسرے نظاموں سے کس طرح مختلف ہیں اور ان میں نئی بات کیا ہے، تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ نظام اسلام دوسرے نظاموں پر کس طرح اور کیا فوقیت رکھتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ اسے خداوند دانا و بینا نے نازل کیا ہے اور جس چیز کو اللہ نے بنایا ہو، انسانی عقلیں اور شعور اس سے بہتر چیز پیدا نہیں کر سکتیں۔

اسی لیے ہم اسلام کے سیاسی نظام سے ابتدا کرتے ہیں کیونکہ یہ نظام دیگر نظاموں کی اساس ہے اور سب انسانی ادارے لازماً قانون اور حکومت کے محتاج ہوتے ہیں۔ حکومت کا نقشہ اور اس کی غرض و غایت واضح ہو جائے تو دوسری تمام تنظیموں کا سمجھنا آسان ہو گا۔

کیا اسلام کے اصولوں پر کوئی ریاست قائم ہو سکتی ہے؟

اسلام کا سیاست اور حکومت کا مشتمل ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مسلمانوں میں خلافتِ عثمانیہ کی انتہا تک کوئی بحث نہیں ہوئی۔ اسلام کی فطرت بھی اس کی تائید کرتی ہے اور رسول کریمؐ کی مدینہ کی طرف ہجرت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کی تاریخ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے علمائے اسلام میں بھی اس بارے میں کوئی شک نہ تھا اور اسلامی افکار کے بڑے مصادر بھی اس پر متفق ہیں۔ اس حقیقت کو درج ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے:

Marfat.com

(۱) قرآن کریم میں ریاست کے قیام کے بارے میں احکام۔

(۲) سنت نبوی ؐ اور تاریخ اسلام میں اس کے بارے میں اشارات۔

(۳) اسلام کے اہم مصادر میں اس موضوع پر افکار۔

۱۔ قرآن اور ریاست

قرآن کریم میں ریاست اور حکومت کے قیام کے بارے میں کئی آیات وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً وہ آیات جو اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں:

"یا ایھا الذین آمنو...... واولی الامر منکم"[۱] اور

"ولو ردوہ ...... یستنبطونہ منھم"۔[۲]

کچھ ایسی آیات ہیں جو نبی کریم ؐ کو مختلف قانونی، حربی اور انتظامی امور کا درس دیتی ہیں اور جو ریاست کے اہم اصولوں کے دائرے میں آتی ہیں۔ مثلاً:

"فبما رحمۃ من اللہ..... ان اللہ یحب المتوکلین"[۳] اور قول باری تعالیٰ:

"وأن احکم...... ما انزل اللہ الیک"۔[۴]

۲۔ سیرت وسنت نبوی ؐ اور ریاست کا تصوّر

نبی کریم ؐ کو ریاست اور حکومت کے مختلف اہم امور در پیش رہے اور آپ ؐ مختلف مالی، خاندانی اور تعزیری معاملات میں، اور حدود نافذ کرنے، والیوں کی تقرری، غزوات و سرایا میں لشکر کے سرداروں کی تعیناتی اور اسلام کے مبلغین کی تقرری، صدقات کی تقسیم، دشمنوں سے جنگ، غنیمت[۱] اور زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم جیسے معاملات میں فیصلے فرماتے رہے، جو حکومت ہی کے کام ہیں۔ آپ ؐ نے اپنی ریاست میں حکومت کو مستحکم فرمایا اور قرآن کریم کے احکام اور ارشادات کو نافذ کیا۔

اس دور میں بعض آوازیں بلند ہوئی ہیں کہ رسول کریم ؐ کے طے کردہ تمام معاملات کا تعلق حکومت کے شعبے سے نہیں تھا، نہ ریاست کے انتظام سے تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آپ ؐ کے تمام عمل صرف دین اور اس کی دعوت سے مخصوص تھے۔ ان مصنفین کی کوشش تھی کہ دین کو ریاست سے الگ کر دیں، اور وہ اس بات سے منکر تھے کہ نظام خلافت، جو مسلمانوں میں عرصۂ دراز تک رائج رہا، "نظام اسلامی تھا"۔[۲]

Marfat.com

اس نظریے کے خلاف ہم اصول سیاست سے ریاست کی مختلف تعریفیں پیش کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ رسول کریمؐ کی حکومت، ریاست سے کہاں تک مماثل تھی اور آپؐ کس حد تک اعمالِ سیاست سرانجام دیتے تھے۔ سیاست کے ماہرین نے ریاست کی کئی تعریفیں کی ہیں، ان میں سے جامع ترین یہ ہے کہ "ریاست، افراد کی جماعت ہے جو کسی مقررہ خطّے میں ہمیشہ سکونت پذیر ہو، اس کی اپنی معنوی شخصیت ہوتی ہے اور نظامِ حکومت ہوتا ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے، جو احکام صادر کرتی ہے اور اُسے سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے۔" اس سے ریاست کے قیام اور وجود کے لیے درج ذیل اجزا ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ آبادی جو مستقل طور پر کسی مخصوص خطّۂ ارض میں سکونت رکھتی ہو۔
۲۔ معنوی شخصیت، جس سے یہ آبادی متصف ہوتی ہے اور صاحبِ اختیار شخص اسے مانتا ہے
۳۔ نظامِ حکومت جس کی اطاعت کی جائے اور حکومت کی صورت یا نوع کو واضح کرتا ہے۔
۴۔ اقتدارِ اعلیٰ جس کی وجہ سے یہ آبادی خود مختار ہوتی ہے اور کسی اور ریاست کے تابع نہیں ہوتی۔

یہ تمام اجزائے ریاست، مدینہ میں آنحضرتؐ کی حکومت میں پائے جاتے تھے کیونکہ مدینہ میں رہنے والی مستقل آبادی بھی تھی (اور پھر سارے جزیرہ نمائے عرب کی آبادی) اس آبادی کی معنوی شخصیت بھی تھی جس کا اظہار رسولؐ کے اختیار و حکم سے ہوتا تھا، اس کا ایک واضح نظام بھی تھا جس کی اطاعت کی جاتی تھی اور جس کی بدولت حدود قائم کی جاتی تھیں اور لوگوں میں فیصلے صادر ہوتے تھے۔ اسی طرح اس آبادی کو مستقل اقتدارِ اعلیٰ بھی حاصل تھا اور وہ اس وقت کی کسی سلطنت (مثلاً ایران، روم، یا حبشہ) کے زیرِ نگیں نہ تھی۔ ہر انصاف پسند شخص جو قرآنِ کریم سے واقف، تاریخ اسلام سے آشنا اور سیرتِ نبویؐ جانتا ہے، یہی فیصلہ کرے گا کہ مدینہ میں رسول کریمؐ نے ریاست کی بنیاد رکھی تھی جس کا دوسری ریاستوں سے یہ فرق تھا کہ وہ خدا اور اُس کے نبیؐ کی طرف بھی دعوت دیتی تھی۔

رسولؐ کی دعوت اور حقیقتِ اسلام کے مزاج سے آگاہی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ دولت و دین ایک دوسرے کے ہم معنی تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف مغربی اور مشرقی مصنفین کی بڑی تعداد نے کیا ہے۔[۲]

ہم نہیں جانتے حکومت اور ریاست اور کیا چیز ہوتی ہے اگر رسولؐ کے مدینہ میں تمام اعمال کو حکومت اور ریاست کی قسم کے اعمال نہ سمجھا جائے، یا نظامِ سیاسی کا قیام، حدود پر عمل، لوگوں

Marfat.com

میں عدل و انصاف اور معاہدات کی توثیق، حکومت میں شامل نہیں؟ اگر یہ سب حکومت ہی کے فرائض نہیں تو پھر کیا ہیں؟

دیکھئے رسولِ کریم ؐ کس طرح ایک معاہدے میں آپ ؐ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان فرماتے ہیں، جو مہاجرین و انصار اور یہود کے درمیان تھا جس میں آپ ؐ نے یہودیوں کو فریق بنایا، اور ان کے دین و مال پر معاہدہ کیا اور اقرار لیا، کچھ شرطیں ان پر عائد کیں اور کچھ اپنے اوپر عائد کیں۔ اس معاہدے کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
یہ تحریر ہے محمد ؐ کی طرف سے، قریش اور یثرب کے مومنین اور مسلمین کے درمیان اور جو ان کے پیرو ہیں اور ان سے ملحق ہیں اور ان سے معاہدے میں شریک ہیں، یہ سب لوگوں سے سوا ایک امت ہیں......"

اس تحریر میں اسلامی ریاست اور اُن یہود میں جو موجود تھے، ایک دوسرے پر چڑھائی نہ کرنے کا معاہدہ بھی شامل ہے۔

ریاست کے قیام کے بارے میں سنت نبوی ؐ میں رسول کریم ؐ کا یہ قول بھی آتا ہے: "جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس نے بیعت نہیں کی تو وہ جاہلیت کی موت مرا" اور اس معنی میں آپ ؐ نے تاکیداً کہا: "جب تم میں سے تین افراد سفر پر نکلیں، تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لیں"۔ آپ ؐ نے یہ بھی فرمایا: "تم میں سے تین افراد جب بھی کسی خالی قطعۂ زمین میں ہوں تو ضروری ہے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں"۔

جب رسولِ کریم ؐ تین مسلمانوں کو بھی امیر یا ذمہ دار شخص کے بغیر پسند نہیں فرماتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ لاکھوں کروڑوں مسلمان کسی ریاست یا کسی نظامِ حکومت کے بغیر رہیں، جو ان کے امور کی نگران ہو، ان کا دفاع کرے اور ان کے مفادات کی امین ہو۔

اسی ضمن میں ایک حدیث ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:
"تم میں سے ہر ایک چرواہا (یعنی نگران) ہے اور ہر نگران سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ امام اپنی رعیت کا مسئول ہے، ہر آدمی اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں مسئول ہے"۔

Marfat.com

یہ تو رسولِ کریمؐ اور آپؐ کی سیرت کا احوال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم وفاتِ رسولؐ کے بعد مسلمانوں کے معاملات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حاکم یا امیر کا انتخاب دفنِ رسولؐ سے بھی اہم سمجھا۔ بعض مسلمان تو رسولِ کریمؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے اور باقی سب سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور طویل بحث و تمحیص کے بعد، جس سے جمہوریت اور مکمل شورائی روح جھلکتی ہے، مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ رسول اللہؐ مقرر کیا، کیونکہ آپ اسلام میں الاولون میں سے تھے اور رسولِ کریمؐ سے رشتہ داری بھی تھی۔ اس کے بعد سے کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا کہ مسلمان خلیفہ یا اپنے امور کے ذمہ دار شخص کے بغیر رہے ہوں، جو اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرے، ریاست کو دشمنوں سے محفوظ رکھے اور لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ، ان کے بعد عثمانؓ، اور پھر علیؓ ہوئے، یہاں تک کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت ختم ہو گئی، مگر مسلمان ملک اور قومیں برقرار رہیں۔

۳۔ اس موضوع پر قابلِ اعتماد آراء

مسلمان ریاست کے قیام کی تاکید کے لیے ہم بعض صحابہؓ اور سلف صالح کے اقوال نقل کرتے ہیں اس کے علاوہ بعض قابلِ اعتماد سیاسی مصادر بھی اس موضوع پر بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "محمدؐ تو اپنی راہ چل دیئے، مگر اس دین کے لیے کوئی قیّم ہونا ضروری ہے۔" عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: "جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔" الماوردی نے "الاحکام السلطانیہ" میں لکھا ہے: "امامت اس کی ہے جو امت میں اس کا مستحق ہو اور یہ بالاجماع واجب ہے۔" الغزالی "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں لکھتے ہیں: "دنیا اور جان و مال کی سلامتی ایسے سلطان کے بغیر ممکن نہیں، جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اس کا مشاہدہ اس وقت (بالخصوص) ہوتا ہے جب کسی سلطان یا امام کے مرنے کے بعد فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ اگر صورتِ حال یہی رہے اور اس کا سدِّباب کسی سلطانِ مطاع کی تقرری سے نہ کیا جائے تو فساد برپا ہوگا، تلواریں چلیں گی اور اقتصادی بدحالی جنم لے گی۔"

ابن تیمیہ "السیاسۃ الشرعیۃ" میں کہتے ہیں: "یہ جان لینا چاہیئے کہ لوگوں کے معاملات کی نگہداری دین کے اہم فرائض میں سے ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دین اس کے بغیر سلامت نہیں رہتا۔

Marfat.com

کیونکہ بنی آدم کے مفادات باہمی تعاون سے پورے ہوتے ہیں، کیونکہ افراد ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان کے لیے باہمی رضامندی سے ایک رئیس مقرر کرنا ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ رسول کریم ﷺ نے تین آدمیوں کے لیے بھی اپنے میں سے امیر مقرر کرنا واجب قرار دیا ہے۔۔۔۔۔۔ اس سے قیاس کریں کہ جب چھوٹی جماعتوں کے لیے یہ بات ضروری ہے تو بڑی جماعت کے لیے کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، اور یہ فریضہ طاقت اور امارت کے بغیر سر انجام نہیں پا سکتا۔ اسی طرح جہاد، عدل و انصاف اور حدود کا قیام بھی طاقت اور امارت کا متقاضی ہے اسی لیے کہا گیا کہ: سلطان یا حاکم زمین پر خدا کا سایہ ہے اور یہ بھی کہا گیا: ظالم امام کے زیر حکومت ساٹھ سال، سلطان کے بغیر ایک رات سے بہتر ہیں۔"

ابن خلدون اپنے "مقدمہ" میں کہتے ہیں: "امام کی تقرری واجب ہے، اور اس کا وجوب شریعت میں اجماع صحابہ و تابعین کے سبب معروف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے میں جلدی کی اور اپنے معاملات ان کے سپرد کیے، اور اسی طرح ان کے بعد ہر دور میں ہوتا چلا آیا اور کسی دور میں بھی لوگوں نے تراج نہ پیدا ہونے دیا۔ انہوں نے واضح اجماع سے امام کی تقرری کے وجوب کو استقرار بخشا۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے وجوب کا جواز عقل ہے کیونکہ اس پر اجماع عقل ہی کی رو سے ہوا۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دلائل و اقوال اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی اور سیاسی نظام، ان تمام نظاموں میں سے ایک ہے جنہیں اسلام نے اس لیے پیش کیا کہ اس کے اصولوں کی پابندی کی جائے اور ہر اس بات کو تسلیم کیا جائے جو نیکی، بھلائی اور دنیا و آخرت میں لوگوں کی فلاح کی طرف دعوت دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس فصل کو، نبی کریم ﷺ کے بعد ریاست اور حکومت کے برقرار رہنے اور اس کے وجوب پر نص قرآنی سے چند آیات پیش کر کے ختم کریں۔ یہ آیات عام مسلمانوں سے مخاطب ہیں اور ان میں کسی مقررہ دور یا خاص عہد کی تخصیص نہیں۔ ان آیات میں ریاست اور حکومت کے باب میں مسلمانوں کو تمام فرائض پورے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان ان فرائض کو اپنے نمائندوں ہی کے ذریعے ادا کر سکتے ہیں اور یہی اولوالامر یا اہل حل و عقد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

Marfat.com

"وقاتلوا فی سبیل اللہ ..... لا یحب المعتدین"۔ (   )

کیا مسلمانوں کے ممکن ہے کہ دشمن سے کسی نظام کے بغیر جنگ کر سکیں، جس کے سربراہ ذمہ دار اشخاص ہوں اور مسلمانوں کے قائد ہوں؟ اسی طرح قرآن میں وارد ہوا:

"ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب" (   )

سوچئے کہ حدود کی ضمانت یا قصاص وغیرہ کس طرح ممکن ہے۔ جب تک ایسی حکومت نہ ہو جو اس کام کی ذمہ دار ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے:

"واعدوا لھم ما استطعتم ...... عدو اللہ وعدوکم" (   )

وہ کیا طریقہ ہے جس سے یہ قوت بہم پہنچائی جا سکتی ہو، اگر نظام اور نظام کے چلانے والے نہ ہوں؟

اسلامی سیاسی نظام اپنی ذات میں مکمل ہے:

اسلامی سیاسی نظام مستقل بالذات حیثیت کا مالک ہے، جو دوسروں سے مختلف اور ممتاز ہے اور عہد حاضر کی سیاسی لغت کی کوئی اصطلاحات اس پر منطبق نہیں ہوتیں۔

بعض لوگوں نے جن اسلام کے دوست اور پیروکار اور مخالفین دونوں شامل ہیں یہ کوشش کی ہے کہ اسلامی نظام پر نئے یا پرانے نام چسپاں کریں۔ اسلام کے دوستوں نے یہ خیال کیا کہ اس بات میں اسلام کی عزت ہوتی ہے اور اس کی شان بلند ہوتی ہے۔ اسلام کے دشمن تو چاہتے تھے کہ لوگوں کی نظروں میں اسلام کی تحقیر ہو اور اس میں جو پاکیزگی اور اچھائی ہے، وہ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو۔

مسلمانوں میں سے کئی افراد اسلام پر جمہوریت، اشتراکیت، سرمایہ داری، شہنشاہیت یا آمریت کے نام جڑ دیتے ہیں اور دشمنانِ اسلام اسلامی حکومت کو "تھیاکریسی" یا مذہبی فرقے کی حکومت کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس مناسبت سے یہ لازم آتا ہے کہ بعض اعتراضات وغیرہ کا جائزہ لیا جائے:

۱۔ ان اسماء اور اصطلاحات کے اطلاق سے اسلام کی شان بلند نہیں ہوتی کیونکہ اسلام بذاتہٖ ایک مستقل اور نمایاں نظام ہے اور ان اصطلاحات کی اسے حاجت نہیں۔ سیاست اور حکومت میں اسلام کے اپنے اصول اور نظام ہیں اور دنیا کے تمام معروف و مشہور نظام اس کی برابری نہیں کر سکتے نہ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

۲۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی سیاسی نظام فلاں نظام سے مماثل ہے تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ کہ اسلام، وہ نظام ہے۔ مثلاً اگر جمہوریت کے بعض اصول، اسلامی حکومت میں پائیں جائیں تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ اسلام جمہوریت کا نام ہے کیونکہ جمہوری نظام میں کئی باتیں ایسی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متعارض ہیں کیونکہ اسلام، کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں اپنا خاص مزاج اور نظریہ رکھتا ہے یہی بات اشتراکیت، یا کسی اور نظام سے نسبت دینے پر صادق آتی ہے۔
یہ تمام اصطلاحات اور نظام، ایسے معاشروں کے تجربات کا ماحصل ہیں جو عرب اور اسلامی ماحول کے لیے اجنبی ہیں۔ یہ اصطلاحات تغیر و تبدل کے کئی ادوار سے گزر چکی ہیں۔ اس لیے مغرب کے لوگوں کے لیے جو انہیں استعمال کرتے ہیں ان کا ایک واضح اور معین مفہوم ہے۔ غیر عرب انہیں اس طرح استعمال کرتا ہے گویا یہ آخری مطلق حکم ہو اور اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ مرورِ ایام سے ان کے معنی کیسے بدل گئے۔ مثلاً جمہوریت (یا ڈیموکریسی) کو لیجئے، سب سے پہلے اس لفظ کو حکمائے یونان نے استعمال کیا اور ان کے نزدیک اس کا مطلب "عوام کی حکومت" تھا یعنی وہ "عوام" جو حکومت کرنے کے اہل تھے اور اصلاً یونانی تھے۔ اس قبیل کے لوگ یونان کے ہر شہر میں محدود تعداد میں تھے۔ یونانیوں نے جملہ ساکنین کو امورِ سلطنت میں شریک ہونے کی کبھی اجازت نہ دی کیونکہ ان میں غلام بھی تھے اور دوسرے درجے کے شہری بھی۔ چنانچہ یونان میں "جمہوریت" سے مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ سب لوگ حکومت میں حصہ لینے یا سرداری کے اہل ہیں۔
اس "جمہوریت" سے مراد اسلام میں کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ جدید جمہوری نظام اور اسلام میں مماثلت ہے کہ دونوں میں حقوق میں مساوات، فرائض کی ادائیگی اور حکومت کے کاروبار میں شرکت بنیادی اصول ہیں، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عوام یا ان کے نمائندے قانون سازی میں آزاد ہیں اور انہیں مطلق سیادت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ مروجہ اصول ہیں جنہیں صرف قرآن اور سنت نے صحیح و قعت بخشی ہے۔ اس لحاظ سے لفظ جمہوریت کا اسلام پر مکمل طور پر اطلاق نہیں ہوتا۔
اسی طرح بعض دانشوروں نے اشتراکیت کا نام بھی اسلام پر چسپاں کیا ہے، ہم جو کچھ اوپر جمہوریت کے بارے میں کہہ آئے ہیں، وہی بات اشتراکیت کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اگر اسلام کے "اشتراکی" ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ معاشرتی اور اجتماعی انصاف پر زور دیتا ہے یا شہریوں کو مساوی مواقع بہم پہنچاتا ہے، یا ذخیرہ اندوزی اور استحصال سے منع کرتا ہے تو اسلام "اشتراکی" ہے، مگر اشتراکیت، عرفِ عام

Marfat.com

ہیں، ایسی مخصوص اصطلاح ہے جو کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتی ہے۔ اور اس کے خصوصی ادارے ہیں۔ اس میں پیداوار میں کے ذرائع محدود ہیں، دولت کی تقسیم کے بارے میں اس کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور یہی حال حکومت کے لیے اہلیت کا ہے۔ اس معنی میں اسلام اشتراکیت سے مختلف ہے کیونکہ اشتراکیت اپنے فلسفے اور تصورات کے لحاظ سے خالص مادّی نظریہ ہے جبکہ اسلام اس کے بالکل برعکس ہے، اور اس میں ذرائع پیداوار، تقسیم دولت اور نظامِ حکومت وغیرہ کے نظریات اشتراکیت سے بالکل جدا ہیں۔

جہاں تک "تھیاکریسی" کا تعلق ہے، جیسے دشمنانِ اسلام، اسلامی سیاسی نظام پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اسلامی طرزِ حکومت پر منطبق نہیں ہوتا، اگرچہ اس کے بعض اصول سے اسلام اتفاق کرتا ہے۔ اگر تھیاکریسی سے مراد نظامِ سیاسی کو قانونِ خداوندی سے الگ کرنا ہے تو اسلام بھی یہی کہتا ہے اور اس میں اتنی لچک ہے کہ ہر زمانے اور ہر موقعے کی مناسبت سے تطبیق کا اہل ہے لیکن اگر اس سے وہ نظام مراد ہے جو قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں رائج تھا، تو غلط ہے کیونکہ اس طرزِ حکومت میں دین کا اجارہ دار طبقہ استبدادی اختیارات رکھتا تھا، اور ان کا رئیس پوپ تھا۔ اس دور میں یہ ایک نظام تھا اور عیسائیوں کے نزدیک اس نظام کو چلانے والوں کو حقوق اور اقتدار حاصل تھا۔ ایسا کوئی طبقہ مسلمانوں میں موجود نہیں کیونکہ مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور ہر مسلمان کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات و احکام سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا ہے جب اسے دین سے گہرا شغف ہو جائے تو وہ "عالم دین" کہلاتا ہے لیکن اس سے اُسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہوتی نہ وہ "طبقۂ علماء" کا رکن بن جاتا ہے جس کے خصوصی حقوق و اختیارات ہوں۔

یورپ میں تھیاکریسی بدترین نظامِ حکومت تھا جس سے زیادہ قابلِ نفرت، ظالمانہ اور آمرانہ نظام تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی گروہ یا طبقہ اس بات کا مدعی تھا کہ اُسے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست حکومت کا حق ملا ہے اور یہ کہ کسی کو اُن سے بازپرس یا ان کے افعال پر پابندی لگانے کا حق حاصل نہیں۔ نہ ان کے احکام سے بالاتر کسی کا حکم چل سکتا ہے۔ تھیاکریسی ہی وجہ سے یورپ میں دین و ریاست میں جدائی پیدا ہوئی۔ مسلمان اس طرزِ حکومت سے ناآشنا تھے اور اس کی سادہ وجہ یہی ہے کہ ایسا طبقہ اسلام میں تھا ہی نہیں۔ جب ہم اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد ایسے صاف ستھرے

Marfat.com

اور پاک نظام سے ہوتی ہے جو اسلامی اصولوں کے سرچشموں سے کسب قانون و شریعت کرتا ہے۔ ایسا نظام کوئی بھی فرد یا جماعت، جو علم، اہلیت اور صحیح رائے کی مالک اور اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے والی ہو، چلا سکتی ہے۔

اسلام میں حکومت کے بنیادی اُصول

حکومت ہو یا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نظام، ہر ایک معینہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ان بنیادوں میں فکری یا فلسفیانہ قواعد بھی ہیں اور عملی قواعد بھی، جن کے بغیر نظریاتی یا فکری اساس پوری طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کو اگر اسلام کے نظام حکومت پر منطبق کیا جائے تو ضروری ہے کہ دونوں قسم کی بنیادوں، یعنی نظریاتی اور عملی، پر بات کی جائے۔

نظریاتی اساس

اس دنیا کے تمام سیاسی نظام، کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی فلسفہ یا واضح نظریہ رکھتے ہیں۔ مختصر طور پر بعض نظاموں کے نظریاتی فلسفے کا ذکر کرتے ہیں، اور پھر اس فلسفے سے مقابلہ کرنے میں جس پر اسلامی سیاسی نظام قائم ہے، کوئی حرج نہیں۔

مثلاً مارکسیت زندگی کے بارے میں خالص مادّی نظریہ رکھتی ہے اور زندگی کے ہر تغیر کی، خواہ وہ فکری تغیر ہی کیوں نہ ہو، مادیت کے نقطۂ نظر سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاشرے کو فرد پر ترجیح دیتی ہے۔ اس کے چند موٹے موٹے اصول ہیں:

۱۔ جدلیاتی منطق (   ) جو صرف کائنات، انسان اور معاشرے کو تسلیم کرتی ہے اور خدا اور انسانی فطرت کا انکار کرتی ہے۔

۲۔ تاریخ کی مادی تعبیر۔ اس کی رُو سے معاشرے کی ہر تبدیلی مادی ہے جس میں افکار اور تربیت کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ معاشرتی نظام کی اشکال ہر معاشرے کے وسائل پیداوار میں تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔

۳۔ معاشرے میں فرد کی ہستی سے انکار اور انفرادی کوششوں کی نفی۔

Marfat.com

۴۔ طبقاتی جنگ (جو معاشرے میں تبدیلیوں کے باعث واقع ہوتی ہے) اور تمام وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت کی نفی۔

۵۔ جب اشتراکیت عام ہوجائے گی اور تمام بنی نوع انسان اشتراکی ہوجائے گی، تو دولت اور سرمائے کا خاتمہ ہوجائے گا۔

مغربی طرز جمہوریت کے بھی کئی بنیادی اصول ہیں۔ ان میں سب سے اہم "فرد کی آزادی" ہے چونکہ یہ نظام یورپ میں، جاگیردارانہ نظام کو ختم کرکے قائم ہوا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ یہ حقوق و فرائض میں مساوات اور معاشرے کے تمام افراد کی آزادی کا دعویدار تھا۔ ان اصولوں کا اعلان پہلے پہل "انقلاب فرانس" کے دوران ہوا۔ اور انہی اصولوں پر عوام کی آزادی (نظریاتی طور پر) کو سیاسی اور اقتصادی عمل میں شامل کرلیا گیا۔ اس سے فرد کو مکمل اقتصادی آزادی اور حرکت و عمل کی آزادی حاصل ہوئی۔ منافع میں شخصی مفاد کی اجازت کے نتیجے میں مغربی جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام بن گئی۔

اس وقت ان دونوں نظاموں (اشتراکیت اور جمہوریت) پر بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہم نے محض ان کے نظریاتی اصولوں کا ذکر کیا ہے تاکہ ان میں اور اسلام کے سیاسی نظام میں مقابلہ کیا جاسکے۔ ان دونوں نظاموں کے بارے میں ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک طرح کا مذہب ہیں۔ ایک آزادی کا مذہب اور دوسرا مارکسی مذہب، مگر دونوں، اختلاف موقف کے باوجود زندگی کا خالص مادی نظریہ رکھتے ہیں اور اللہ پر ایمان کا پہلے نظام انکار تو نہیں کیا مگر اسے اپنے اصولوں میں شامل بھی نہیں کیا، دوسرے نظام نے اس پر غور کیا مگر اس سے انکار کیا۔ یہیں سے اسلام شروع ہوتا ہے۔

اسلامی نظام ایمان باللہ کی اساس پر قائم ہے اور کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں اس کا نظریہ اسی ایمان سے پھوٹتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق کو اپنی مخلوقات کے جملہ امور میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے اور مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی رضا کے مطابق امتثال امر کرے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ارض و سما میں کوئی چیز اس کے علم سے خارج یا اوجھل نہیں، کیونکہ انسان کی طرح وہ باقی تمام اشیاء کا خالق بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے بندوں کے لیے اس کے دین و دنیا کے امور میں کونسی بات بہتر ہے جب اس نے

Marfat.com

بندوں کے لیے ایک نظام تجویز کیا تو لازمی طور پر یہ سب نظاموں سے افضل ہے اور انسانوں کے مفاد کے لیے، فرد ہوں، یا جماعت، سب سے بہتر اور قابل عمل نظام ہے۔

اللہ اپنے مصالح و شرائع میں حکیم بھی ہے۔ جب اس نے انسانوں کی طرف شریعت وحی کی تو وہ یقیناً اس غرض سے تھی کہ انسانی معاملات اس طرح تشکیل و تکمیل پائیں کہ اس سے فلاح و فوز حاصل ہو اور فساد کا خاتمہ ہو۔

اللہ تعالیٰ معبود بھی ہے۔ عبودیت کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ سے کامل محبت کے ساتھ عاجزی اختیار کرے۔ انسان دنیاوی اور طبیعی قانون کے سامنے مجبور ہو کر سر جھکاتا ہے۔ کیا شرعی قوانین جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کیے اس کے سزاوار نہیں کہ ہم پورے خضوع و خشوع سے اپنی عبودیت کا اظہار کریں تاکہ دنیا اور آخرت میں ہمیں بھلائی اور برکت نصیب ہو اور ہم ہدایت اور نور پائیں۔

یہ تو ایک رخ ہے دوسرے پہلو سے انسان اللہ تعالیٰ کا اس دنیا میں خلیفہ ہے۔

"هوالذی جعلکم خلائف الارض" (الانعام : ١٦٥)

اللہ نے اس کرۂ ارض کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کیا۔ ہر خلیفہ یا نائب یا ایجنٹ کا کام ہے کہ وہ اس شخص یا ہستی کی مرضی کے مطابق کام کرے جس نے اسے خلیفہ وغیرہ بنایا، اور اس کے لیے کسی طرح روا نہیں کہ وہ اس کے خلاف کام کرے یا اس کی مرضی پر چلنے سے انکار کر دے۔

اپنے تمام علم و معرفت کے باوجود، انسان اشیاء کی طبائع، یا قانون و تشریع کے ان تقاضوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے جو تمام احوال و امور میں انسانی مفاد و فلاح کے ضامن ہیں، اور اس کے میلانات، خواہشات اور طرزِ بود و باش یا کسی مخصوص طبقے یا گروہ سے نسبت سے متاثر کرتی کرتی ہے اور اس سے انسانیت کے لیے مکمل اور جامع قانون وضع کرنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔

اسلامی نظریے کے مطابق اسلام ہی وہ آخری اور مکمل دستور العمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند فرمایا اور اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا اور اس میں وہ تمام اصول و قواعد جمع کر دیے جن کی انسانیت کو احتیاج تھی اور اس میں آنے والی تبدیلیوں اور تغیرات کے امکان کو مدنظر رکھا جس کے سبب ہر زمانے اور ہر صورت حال میں اور ہر معاشرے کے لیے مفید مطلب ٹھہرا۔

Marfat.com

جہاں مارکسیت اور جمہوریت (سرمایہ دارانہ نظام) دونوں کی اساس مادی ہے، اسلام کی اساس روحانی ہے اور ایمان باللہ پر قائم ہے اور اس میں انسان کی مصلحتوں کی رعایت ہے، انسانیت کا احترام اور زمین میں اس کی خلافت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام کی بنیاد پر جس سیاسی نظام کی عمارت کھڑی ہے اس میں ایمان کی متیں، انسان کی تکریم، آزادی اور حقیقی انسانیت کے خلاف کوئی بات ہے۔

عملی اساس

اسلامی حکومت کی عملی اساس کے اہم پہلو یہ ہیں:

شوریٰ، جو عوام اور حکام کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے۔ اطاعت، جو عوام پر اس وقت تک واجب ہے جب تک حکام سیدھے رہیں اور راہ حق سے انحراف نہ کریں۔ عدل و انصاف جس سے حکومت کے دونوں فریقوں، یعنی عوام اور حکام میں صحیح تعلق پیدا ہوتا ہے۔

عدل و انصاف کے بارے میں ہم پہلے، اسلام کے مثالیوں پر بحث کرتے ہوئے کہہ آئے ہیں۔ اطاعت پر ہم اس وقت مفصل بات کریں گے جب ہم حکام کے حق میں عوام کے فرائض کا مفصل ذکر کریں گے۔ اس وقت ہم شوریٰ پر بات کرتے ہیں:

شوریٰ: شوریٰ کے اصول پر اسلام نے خصوصی توجہ دی ہے اور لازم قرار دیا کہ اس کی غیر موجودگی میں صحیح حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو مسلمانوں سے مشاورت کا واضح حکم دیا:

"وشاورھم فی الامر .... فتوکل علی اللہ۔" (آل عمران: ۱۵۹)

اور شوریٰ کو سچے اور نیک مسلمانوں کے لیے لازمی صفت قرار دیا:

"والذین استجابوا ...... ینفقون" (الشوریٰ: ۳۸)

اس کے بارے میں قرآن کے اہتمام کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ایک سورۃ کا نام ہی "الشوریٰ" رکھا۔

اس اصول کی ساخت میں اسلام تمام نظاموں اور مذاہب پر سبقت لے گیا۔ اس دور کے جدید معاشروں نے یہ اصول بالعموم انقلاب فرانس سے لیا ہے مگر اسلام اس سے بھی گیارہ صدیاں

Marfat.com

پہلے اس اصول کا اعلان کر چکا تھا۔ ہماری حیرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے شوریٰ کی پابندی اور اعلان لوگوں کے کسی مطالبے یا ان کے حالات میں تبدیلی یا سیاسی یا معاشرتی پروپیگنڈے کی خاطر نہیں کیا تھا، کیونکہ ظہورِ اسلام کے وقت کے معاشرے شوریٰ کے بارے میں سوچ سکتے تھے نہ اس کا مطالبہ کرنے کے اہل تھے۔ اس دور میں تو معاصر سلطنتوں کے "عوام" اپنے حکام کو خدا یا خدا کا نائب سمجھتے تھے۔ اور ان کے اعمال و افعال کو اتنا مقدس گردانتے تھے کہ ان پر نقد و جرح یا ان کے خلاف اظہارِ رائے "کفر" تھا۔ اسی وجہ سے عوام کو یہ حق نہ تھا کہ وہ کوئی رائے دے سکیں یا حکومت میں شریک ہوں، خود حکام بھی اپنی رعایا کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ عام طریقہ یہ تھا کہ اللہ کے رسول آتے تھے، وہ حکومت کرتے تھے اور اُن کے بعد اُن کے خلفاء انہی کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات تھی نہ ناپسندیدگی کیونکہ بالعموم یہی حکومت کا معمول تھا۔ مسلمانوں کو رسولِ کریمؐ سے اس قدر محبت تھی کہ آپؐ کے ادنیٰ سے اشارے پر مسلمان اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے اور آپؐ جس طرزِ حکومت کا مشورہ دیتے، مسلمان اُسے بے چون و چرا قبول کر لیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کاملہ و خالدہ اس قسم کے اصول سے رہا کرتی ہے اور وہ جماعتِ مسلمین کا درجہ بلند کرنا چاہتی ہے تاکہ عمومی مسائل اور ضروری مصلحتوں میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا رہے اور حکومت میں مشارکت ہو اور حکام کی نگرانی ہوتی رہے۔

چونکہ اسلام نے انسان کو بلند مقام عطا کیا ہے اس لیے اسلام کا یہ مؤقف فطری بات تھی۔ اسلام نے انسان کو زمین میں خدا کا نائب بنایا تاکہ دنیا اور آخرت میں وہ سرفرو ہو اور اس دنیا کو اس طرح آباد کرے کہ سب کی بھلائی ہو۔ اسلام ہی ہے جس نے مساوات، صحیح آزادی اور مطلق انصاف کے اصول لوگوں میں راسخ کیے۔

شوریٰ کے بارے میں قرآنِ کریم کا حکم محض نظریاتی نہیں تھا بلکہ رسولِ کریمؐ نے سب سے پہلے خود اپنی ذات پر اسے منطبق فرمایا اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے حتی الوسع اسے اپنے اوپر نافذ کیا۔ سیرت پاک کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ حضورؐ بڑے بڑے کاموں میں، ماسوی ان کے جن پر وحی نازل ہو یا نص قرآن موجود تھی، تمام مسلمانوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ غزوۂ بدر میں، جب نبی کریمؐ کو خبر ملی کہ قریش اپنے قافلے کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے ہیں اور آپؐ کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو کر رہے گی، تو بقول ابن ہشام، آپؐ نے اپنے

Marfat.com

صحابہ کرام ؓ سے مشورہ کیا۔ پہلے حضرت ابوبکر ؓ کھڑے ہوئے اور مناسب رائے دی، پھر عمر ؓ بن الخطاب کھڑے ہوئے اور مناسب رائے دی۔ پھر مقداد بن عمرو ؓ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ صلعم! اللہ نے آپ ؐ کو جو ہدایت دی ہے، اس کے مطابق عمل فرمایئے۔ ہم آپ ؐ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم! ہم ہرگز اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ ؑ سے کہا: تم اور تمہارا خدا جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ (ہم کہیں گے) آپ اور آپ کا خدا جائیں اور جنگ کریں اور ہم آپ ؐ کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ ؐ کو مبعوث فرمایا، اگر آپ ؐ ہمیں برک الغماد (یمن کا ایک مقام) تک بھی لے چلیں تو ہم اس راہ میں جنگ کرتے جائیں گے حتیٰ کہ وہاں تک پہنچ جائیں۔

رسول اللہ ؐ نے مقداد ؓ کے حق میں دعائے خیر فرمائی، پھر فرمایا: "مسلمانو! تم سب اس پر مشورہ دو" اور اس سے آپ ؐ کی مراد انصار تھے کیونکہ جب انہوں نے بیعت العقبہ کی تھی تو یہ حلف اٹھایا تھا کہ آپ ؐ کو مدینہ میں ہر حملہ آور سے بچائیں گے، مگر اب معرکہ خارج مدینہ ہونے والا تھا، اسی لیے رسول اللہ ؐ اس خاص سبب سے ان کی رائے جاننے کے خواہشمند تھے۔ اس کے بعد سعد بن معاذ ؓ انصاری، سردارِ خزرج، کھڑے ہوئے اور کہا: "یا رسول اللہ! شاید آپ ہماری رائے جاننا چاہتے تھے؟ آپ ؐ نے فرمایا: "ہاں!" سعد ؓ نے کہا: "ہم آپ ؐ پر ایمان لائے، آپ ؐ کی تصدیق کی اور گواہی کہ آپ ؐ جو کچھ لائے ہیں وہ برحق ہے تو آپ ؐ اپنا ارادہ پورا کیجیے، ہم آپ ؐ کے ساتھ ہیں"..... اس طرح انصار کے نمائندوں نے اپنی موافقت اور اطاعت کا اعلان کیا۔ اس وقت رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "اٹھو اور تمہیں خوشخبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں طائفوں (قریش کا لشکر یا ان کا قافلہ) میں سے ایک کا وعدہ مجھ سے فرمایا ہے۔ خدا کی قسم، گویا میں اس قوم کی قتل گاہیں دیکھ رہا ہوں۔" آپ نے اندازہ لگایا کہ رسول اللہ ؐ بدر کی طرف اس وقت تک روانہ نہ ہوئے، جب تک آپ ؐ کو یقین نہ ہو گیا کہ تمام مسلمانوں کی رائے آپ ؐ کی رائے سے متفق ہے۔

۲۔ معرکۂ بدر شروع ہونے سے پہلے رسول اللہ ؐ نے مسلمانوں کو وادی بدر میں ایک مقام پر نزول کرنے کا حکم دیا تو حباب بن منذر ؓ آگے بڑھے اور کہا: "یا رسول اللہ! کیا یہ مقام اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے؟ اس صورت میں ہم کوئی ردّ و قدح نہ کریں گے، لیکن اگر یہ آپ ؐ کی اپنی رائے اور جنگ اور حکمتِ عملی ہے تو اور بات ہے۔" آپ ؐ نے فرمایا: "نہیں، یہ میری اپنی رائے ہے۔" تو حباب ؓ نے کہا: "یہ مقام مناسب نہیں، آپ ؐ اٹھیے تاکہ ہم پانی کے ذخیرے پر قبضہ کر لیں، اس صورت میں ہم

Marfat.com

جنگ کریں گے تو ہم سیراب ہوں گے اور ہمارے دشمن پیاسے رہیں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے اس مشورے کو پسند فرمایا اور کہا: "تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔"

۳۔ رسول کریم ﷺ کی اپنے صحابہؓ سے مشورہ کرنے کی ایک اور مثال لیجئے، جو غزوۂ اُحد میں پیش آئی۔ آپؐ نے سنا کہ مشرکین بدر میں اپنی ہزیمت اور ذلت کا انتقام لینے کے لیے بھاری جمعیت کے ساتھ احد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپؐ نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟ انصار اور بعض بڑے بڑے صحابہؓ نے مدینہ ہی میں رہ کر مشرکین کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا اور حضورؐ بھی اس پر مائل تھے مگر بعض دیگر اہم مسلمانوں کی رائے میں اُحد پہنچ کر مشرکین کا مقابلہ ضروری تھا۔ ان میں نوجوانوں کی کثرت تھی جو بدر کے بارے میں سن چکے تھے مگر اس میں شریک نہ ہو سکے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایک معرکہ اور ہو جائے۔ ان میں سے نعمان بن مالک انصاریؓ نے کہا: "مجھے جنت سے محروم نہ فرمائیے۔ قسم اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں ضرور جنت میں داخل ہوں گا۔" آپؐ نے پوچھا: "کیسے؟" نعمان نے کہا: "اس وجہ سے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اُس کے رسولؐ ہیں اور میں جنگ سے پیٹھ پھیرنے والوں میں سے نہیں۔" جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مسلمانوں کی اکثریت مدینہ سے نکل کر اُحد میں مشرکین سے مقابلہ کرنا چاہتی ہے تو آپؐ نے اپنی زرہ طلب فرمائی اور اُسے زیب تن فرمایا۔ اس وقت وہ لوگ شرمندہ ہوئے جنہوں نے مدینہ میں رک کر لڑنے کا مشورہ دیا تھا اور انہوں نے گمان کیا کہ شاید انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہے اور انہوں نے معافی مانگی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپؐ کو جو مناسب سمجھتے ہوں اُس پر عمل فرمایئے۔ حضورؐ نے مسلمانوں اور ان کے حکام کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے، اپنے ارادے سے رجوع کو ترک فرمایا اور اس بات پر قائم رہے جس کا مسلمانوں کی اکثریت نے مشورہ دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ہتھیار اٹھا کر رکھ دے اور زرہ پہن کر اتار دے جب تک جنگ نہ کر لے۔"

کئی اور مثالیں بھی ہیں مگر یہاں تنگیٔ داماں کا گلہ ہے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم یہ نہ بھولیں کہ رسولِ کریم ﷺ مسلمانوں کے سردار اُن کے تمام امور میں اسوہ ہیں جس میں کسی تصرّف کی گنجائش نہیں۔ آپؐ نے چاہا کہ مسلمان عوام اور حکام دونوں کو یہ تعلیم دیں کہ ان کی ریاست مشورے ہی پر قائم ہونی چاہیئے اور تمام ظروف احوال میں حکام اور عوام کے درمیان مشارکت ضروری ہے۔

اگر ہم خلفائے راشدین کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ بھی اپنی حکومت کی اسی

Marfat.com

اصول پر چلاتے تھے، یعنی جس اصولِ مشاورت کا قرآن نے حکم دیا اور رسول ؐ نے اس پر عمل فرمایا حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین کے معاملے میں دوسروں سے مشورہ کیا، پھر حضرت عمرؓ کی خلافت میں بھی یہی اصول جاری رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے تو اپنی شہادت سے پہلے خلیفہ کے انتخاب کو بھی شوریٰ سے طے کرنے کا حکم دیا جس میں عبدالرحمن بن عوفؓ نے اجتہاد کیا کہ اہم مسلمانوں اور اہل رائے سے مشورہ کرنا چاہیے جس کی بدولت حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل آیا۔ رسول کریمؐ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ نہ بنایا اور اس کا اختیار عامۃ المسلمین کو دے دیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کیا، بہت سے لوگوں نے مخالفت بھی کی مگر جب حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب قرار دیا گیا تو بیعت کرنے والوں میں ان کے مخالف پیش پیش تھے گویا ان کا انتخاب کامل مشاورت سے انجام پایا۔ شاید اس دور کے عوام کے دل میں تاریخ اسلام کا یہ زمانہ گزرا بھی ہے یا نہیں! خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی اپنی مختصر سی مجلس مشاورت تھی لیکن شورائے عام بھی برقرار تھی۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ سے مشورہ فرماتے تھے جبکہ حضرت عمرؓ، حضرت علی، عثمان، زبیر، طلحہ، اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کرتے تھے۔ مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بالعموم قبرِ نبیؐ اور منبرِ رسولؐ کی درمیانی جگہ ہوتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو دور دراز سے کوئی خبر یا اطلاع ملتی تو وہ اپنے اصحاب کے پاس جاتے، انہیں صورتحال بتاتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے۔

شوریٰ کے بارے میں پڑھنے کے بعد اور حیاتِ اسلامی میں اس کی تطبیق سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ نصِ قرآنی نے شوریٰ کے بارے میں اتنی نرمی اور گنجائش رکھی کہ مسلمانوں کو کسی معین صورت یا مخصوص طریقے کا پابند نہ بنایا کہ لوگ اس کا التزام کرتے اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کرتے۔ یہ بات اہل حل و عقد اور عوام الناس پر چھوڑ دی گئی کہ وہ جو طریقہ چاہیں اختیار کر لیں، سوائے اس کے کہ شوریٰ بہ حقیقی معنوں میں، صحیح صحیح عمل ہونا چاہیے۔ یہ بات اس رائے پر مبنی ہے کہ اسلام دینِ انسانیت ہے اور اس کا نظام ہر عصر اور ہر دور کے لیے ہے، اس لیے قدرتی طور پر، وہ لوگوں کو تفصیلات اور جزئیات کا پابند نہیں بنا سکتا اور صرف اس کے عام اصولوں کو راسخ اور بنیادوں کو پائیدار بنانا چاہتا تھا جن کے بغیر چارہ نہیں۔ شوریٰ بھی ایسی حقیقت ہے جس سے گریز ممکن نہیں کہ اس سے کوئی سیاسی

Marfat.com

نظام، اسلامی بنتا ہے مگر اس پر عمل کا طریق کار مختلف رہا ہے کہ رسول کریمؐ کبار الصحابہ سے مشورہ فرماتے تھے اور خلفائے راشدینؓ صحابہ اور اسلام میں اسابقون الاوّلون سے مشورہ کرتے تھے، حالانکہ یہ لوگ خود مسندِ فضیلت و صدارت پر متمکن تھے اگر وہ شوریٰ پر عمل کرتے تھے تو کسی اور معاشرے کو شوریٰ کے قیام و استقرار سے کیا بات مانع آسکتی ہے؟ اہل حل وعقد، موجودہ دور کے انتخابات کی طرح کوئی سا طریقہ بھی اس کے لیے اختیار کر سکتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں سے تمام مسائل اور امور میں مشورہ کرنا واجب ہے، سوائے دو حالتوں کے:

اوّل یہ کہ جس امر کے بارے میں نصّ قرآنی وارد ہو چکی ہے اس پر مشورہ نہیں کیا جاسکتا، سوائے اس کے کہ قرآن اور سنت نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کے نفاذ اور انتظام کے حدود طے کیے جائیں۔ دوم: شوریٰ کا فیصلہ کسی ایسی بات کے لیے نہیں ہونا چاہیے جو نصّ قرآنی کی مخالفت کرے یا شریعت کی روح سے بغاوت ہو۔ یہ دونوں شرائط شوریٰ کی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتیں کیونکہ وہ نص قرآنی کسی بہتر تبدیلی یا صحیح فکر کے راستے میں رکاوٹ نہیں، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام زندگی کے مسائل کو عام مشاورت اور رائے سے حل کرنے کو اہم ترین عنصر گردانتا ہے تاکہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلا جاسکے اور ہر تغیر و تبدیل کے مطابق ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔

۳۔ علمائے اسلام اور مفکرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ شوریٰ، حاکم کے لازمی ہے یا اختیاری؟ یعنی کیا امام یا رئیس مملکت کے لیے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ مشورہ کرتا ہے تو مسلمانوں کی رائے سے جو طے پایا ہو، اس پر عمل کرنا اس پر واجب ہے یا نہیں؟ یا اُسے پھر بھی اختیار رہے کہ وہ ان کی رائے کو قبول کرے یا حسبِ سابق اپنی رائے پر ہی عمل کرے؟

بعض علماء کی رائے ہیں، شوریٰ اختیاری ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کے فرمان سے دلیل لاتے ہیں کہ قرآن نے شوریٰ کا حکم دینے کے بعد کہا:

"فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ"

وہ کہتے ہیں کہ عزم کا مطلب یہ ہے کہ حاکم چاہے تو اپنی رائے پر عمل کرے اور چاہے تو مسلمانوں کی رائے اختیار کرے، جیسا کہ بعض تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب مرتدین سے جنگ کرنے کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا تو غالب رائے یہ تھی (جن میں عمرؓ بھی شامل تھے) کہ ان سے نماز کی ادائیگی قبول کی جائے اور زکوٰۃ کا مطالبہ مؤخر کر دیا جائے۔ مگر ابو بکرؓ نے نماز

Marfat.com

کو، زکوٰۃ کی ادائیگی کے بغیر قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دونوں الگ الگ نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ایک حقوق اللہ میں سے ہے اور دوسری حقوق العباد میں سے۔ انہوں نے زور دے کر کہا: "خدا کی قسم! اگر وہ لوگ رسی کا ایک ٹکڑا دینے سے بھی انکار کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا"۔ ابوبکرؓ نے مرتدین سے جنگ کے بارے میں اپنی رائے پر اصرار کیا۔ یہ علماء اس سے یہ ثبوت لاتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کی اکثریت کی رائے میں اپنی رائے پر عمل کیا، جس سے واضح ہوگیا کہ شوریٰ اختیاری ہے۔ طبری اور قرطبی نے اپنی تفسیروں پر اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس کے برعکس، بعض دوسرے علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ حاکم کے لیے اکثریت کی رائے پر عمل لازم ہے۔ جب مسلمانوں کی یا اہل حل وعقد کی رائے کسی معاملے میں طے پا جائے تو حاکم کے لیے کسی اختلاف کی مجال نہیں رہتی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شوریٰ سے طے پانے والے معاملے پر اگر حاکم عمل نہیں کرتا تو شوریٰ بے وقعت اور بے کار ہے۔ اس بات پر وہ تاریخ اور سیرت سے حوالے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بے شمار موقعوں پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا اور ان کی پر عمل کیا جن میں اہم ترین جنگِ احد میں مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق پانی کے قریب نزول کا ہے۔ فریق اوّل حروبِ ردّہ میں ابوبکرؓ کے مسلمانوں سے مشورہ طلب کرنے اور پھر اس کے خلاف عمل کرنے پر جو دلیل لاتا ہے، فریق ثانی اس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ ابوبکرؓ مسلمانوں سے مسلسل رائے طلب کرتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ابوبکرؓ کی رائے کی طرف مائل کر دیئے جن میں عمرؓ بھی شامل تھے اور بالآخر تمام کبار صحابہؓ ابوبکرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے اور اس طرح ابوبکرؓ نے مسلمانوں کے مشورے سے اختلاف نہ کیا۔

۴۔ اسلام میں شوریٰ کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ حاکم کے انتخاب میں شوریٰ۔

ب۔ حکومت کا انتظام چلانے اور حکام کی نگرانی کے لیے شوریٰ۔

معنیٰ اوّل میں شوریٰ کا قیام اس طرح عمل میں آتا ہے کہ مسلمانوں یا اہلِ حل وعقد یا مجلسِ شوریٰ کی طرف سے حاکم اعلیٰ کا انتخاب ہو۔ ان کا کام ہے کہ وہ اس بہترین انسان کا انتخاب کریں، جو مقررہ شرائط پر پورا اترتا ہو۔

Marfat.com

معنیٔ ثانی میں شوریٰ، امت کے نمائندوں کے ذریعے، جو اہلِ حل وعقد میں سے ہوں، حاکم کو صحیح مشورہ دینے، اس کی خیر خواہی اور حکومت کے کاروبار میں نگرانی کرنے کا نام ہے، تاکہ حکومت اپنے مقاصد اور غایات سے منحرف نہ ہو۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اسلام نے شوریٰ کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں کی، مگر اتنا ضرور ہے کہ اس میں وہ افراد حصہ لیں جو اس کے اہل ہوں۔ اس لحاظ سے مجلسِ شوریٰ کے ارکان اہلِ دین و فقہ ہونے چاہئیں یا وہ لوگ جو شریعت میں قانون میں خصوصی نظر اور مہارت رکھتے ہوں تاکہ ان امور میں صحیح صحیح رائے دے سکیں جن کے بارے میں نصِ قرآنی موجود نہیں۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ امورِ حکومت کی نگرانی کریں۔

اس مجلس کے انتخاب وہیئت کے طریقے متعدد ہیں:

(ا) بعض لوگوں کے نزدیک اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ حاکم بذاتِ خود، عوام کی رائے اور توثیق سے اس کے ارکان کا تقرر کرے۔

(ب) کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مجلس میں پیشوں کے اعتبار سے نمائندگی دینی چاہیئے، یعنی مختلف کاروبار کرنے والے افراد کو رکن بنانا چاہیئے اور ان میں سے ایسے اشخاص کو منتخب کرنا چاہیئے جو مشورہ دینے کے اہل ہوں اور صاحبِ رائے بھی ہوں۔

(ج) کچھ اور لوگوں کی رائے میں تمام ارکان کا عام انتخاب ہونا چاہیئے اور یہ طریقہ دوسرے دونوں طریقوں کے مقابلے میں زیادہ مستعمل ہے۔

بہر حال، اسلام کسی خاص طریقے کا پابند نہیں کرتا کہ صرف اسی کو "اسلامی" کہا جا سکے۔ ہم عام انتخابات ہی کو مجلس شوریٰ کے قیام کا موزوں طریقہ سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ انتخابات کے سلسلے میں ہوتا یہ ہے کہ انسان خود اپنی نامزدگی کرتا ہے اور انتخاب کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے مگر یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے متعارض ہے کہ "ان لوگوں کو عہدے دینا صحیح نہیں جو انہیں طلب کریں یا اس پر اصرار کریں۔" بالعموم قانون ساز اداروں کے انتخابات غیر پسندیدہ طریقوں سے عمل میں آتے ہیں اور اس دور کے معاشروں میں لوگ خود ہی اپنے آپ کو انتخاب کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیئے کہ نامزدگی ان افراد کی جائے جو اس مجلس کی رکنیت کی شرائط پر پورے اترتے ہوں۔

5۔ شوریٰ اسلامی نظام کا امتیازی وصف ہے جو نرالا اور خیال انگیز ہے۔ جدید یا معاصر نظاموں

Marfat.com

سے تقابل سے اس کی قدر و منزلت معلوم ہوتی ہے۔ جمہوریت (ڈیموکریسی) بھی شوریٰ اور تعاون پر مبنی ہے، مگر عملاً اس میں محکوم، حاکموں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی اساس حاکموں اور محکوموں میں سمع و اطاعت اور اعتماد پر ہے مگر انجام یہ ہوتا ہے کہ اعتماد مٹ جاتا ہے اور حاکم مسلط ہو جاتے ہیں۔

ان کے برعکس اسلامی نظام، مشاورت کے مرحلے میں، شوریٰ اور تعاون پر مبنی ہوتا ہے اور نفاذ کے مرحلے میں سمع و طاعت اور اعتماد پر قائم ہوتا ہے، اور اس کے اصولوں پر اگر خلوص دل سے عمل کیا جائے تو کوئی فریق (حاکم و محکوم) ایک دوسرے پر مسلط نہیں ہوتا۔

رئیسِ مملکت کی شرائط

ہم نے اب تک ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ اب ہم ان قواعد کو بیان کرتے ہیں جو اسلامی مملکت اپنے قیام کے بعد، داخلی طور پر مضبوط کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رئیس مملکت کا عہدہ ایسی مملکت میں سب سے اہم بنیادی ہے۔

اسلامی مملکت کے رئیس کے عہدے پر اسلامی تاریخ، علم معاشرت اور علم کلام کی کتابوں میں وسیع بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بالعموم "امامت" کے عنوان کے تحت بحث ہوئی ہے کیونکہ بیشتر مؤلفین اسلامی مملکت کے رئیس اوّل کو "امام" یا "خلیفہ" لکھتے ہیں۔ ان کتابوں میں امام کی صفات، تقرری اور معزولی کا طریقہ، حکومت کرنے کے وسائل اور حکومت کے بنیادی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ ہم ان میں سے حاکم اعلیٰ کی صفات اور شرائط پر مفکرین اسلام کے اہم مباحث کو بیان کریں گے اور واضح کریں گے کہ ان صفات کی اہمیت کیا ہے اور طویل تاریخی دور گزرنے سے ان میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

الماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں سات اہم صفات بیان کی ہیں۔

۱۔ عدالت، جملہ شرائط کے ساتھ۔

۲۔ علم، جو حادثات و احکام دونوں میں اجتہاد کے قابل بنائے۔

۳۔ سماعت، بصارت اور گفتگو وغیرہ کے لیے حواس کی سلامتی۔

Marfat.com

۴۔ اعضاء کی سلامتی کہ حرکت اور اٹھنے بیٹھنے سے مانع نہ ہو۔

۵۔ رعیت کی سیاست اور مصالح کے انتظام میں پختہ رائے۔

۶۔ شجاعت اور جوکنا پن تاکہ ملت کا دفاع اور دشمن سے جنگ کر سکے۔

۷۔ صحیح النسب ہونا یعنی خلیفہ قریش میں ہونا چاہیئے۔

امام ابنِ حزم نے اپنی کتاب "الفصل فی الملل والاھواء والنحل" میں حاکم کے لیے چار شرطیں بیان کی ہیں:

۱۔ بالغ ہو، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا: "تین قسم کے لوگ مرفوع والقلم ہیں: سونے والا جب تک بیدار نہ ہو جائے۔ بچہ، جب تک بالغ نہ ہو جائے، دیوانہ، جب تک صحت یاب نہ ہو جائے۔

۲۔ مرد ہو، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا:

"وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاتی جس نے اپنے امور کسی عورت کے سپرد کر دیئے ہوں۔"

۳۔ فرائضِ دین کا علم، اور

۴۔ تقویٰ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور حد سے تجاوز کرنے میں تعاون نہ کرو۔"

ابنِ خلدون نے "مقدمہ" میں پانچ شرطیں گنوائی ہیں:

۱۔ علم۔

۲۔ عدالت

۳۔ کفایت (اہلیت و قابلیت)

۴۔ حواس و اعضاء کی سلامتی

۵۔ صحیح النسب ہونا (ابنِ خلدون نے کہا ہے کہ اس شرط پر اختلاف ہے)۔

مفکرین اسلام کا مقصد ان شرائط کے بیان کرنے سے یہ تھا کہ رئیس مملکت کے عہدے کے لیے ایسا مردِ صالح ڈھونڈا جائے جو امت کے امور کو سرانجام دے سکے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھے اور ان کے مفادات کی نگرانی کرے۔ اسی لیے انہوں نے اسلامی مملکت کے رئیس اوّل کے لیے عقل، قوتِ فکر، سلامتِ رائے، حکمتِ تدبیر، صحتِ اعضائے جسمانی اور ایسے نقائص بدنی سے

Marfat.com

ہونے کی شرائط مقرر کیں جو اس کے فرائض کی انجام وہی میں حارج ہوں۔ اسی طرح اس کے لیے لازم ہے کہ اُسے اسلام کے اصولوں کے مطابق حکومت چلانے کا طریقہ آتا ہو، اور وہ مملکت کی سیاست سے آگاہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس کا ایمان مضبوط اور عقیدہ درست ہو، آزاد ہو، منصف مزاج ہو، اسلام کے مفادات کو ملحوظ رکھے، اس کے شعائر کی تنظیم کرے اور دین صرف زنخانہ کرے نہ خلقت پر طعنہ زن ہو۔ اس کے ساتھ وہ شریعت کا عالم، اس کے احکام و مقاصد سے آگاہ، مخلص اور امانت دار ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی دانائی، شجاعت اور ہیبت ہو کہ اللہ کے حرمات، لوگوں کے حقوق اور مملکت کی حدود اور اقتدار کے خلاف عناصر کو کچل سکے۔

اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے، ہم ان شرائط اور اوصاف کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ شرائط جن کی عدم موجودگی میں کوئی شخص امام بن ہی نہیں سکتا۔

۲۔ وہ شرائط جو مختلف الرائے ہوں۔

وہ بنیادی شرائط، جو کسی مسلمان حاکم کے لیے ضروری ہیں اور جن پر اکثریت کا اتفاق ہے یہ ہیں:

۱۔ مرد ہونا

۲۔ بالغ ہونا

۳۔ صاحب عقل ہونا

۴۔ دین و دنیا کے اُن امور کا علم جو حکومت کے لیے ضروری ہیں۔

۵۔ حواس اور اعضاء کی سلامتی جو علم و عمل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

۶۔ عدالت، یعنی صحیح العقیدہ ہونا، فرائض اسلامی کی ادائیگی اور شعائر اسلام کی تعظیم۔

۷۔ آزاد ہونا (غلام نہ ہو)

۸۔ عمل کی اہلیت (کفایت)

اختلافی شرائط یہ ہیں:

۱۔ نسب، یعنی کسی خاص نسب، قبیلے یا برادری سے نسبت ہونا۔ بالعموم اس سے مراد ہے، قریشی ہونا، ان کی کسی خاص شاخ (ہاشمی یا عباسی وغیرہ) سے متعلق ہونا۔

مسلمانوں کی اکثریت کی رائے میں خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے، کیونکہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

Marfat.com

"الائمۃ من قریش" (یعنی امام قریش میں سے ہونے چاہئیں) اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا:
"قدموا قریش ولا تقدموھا" (قریش کو سبقت لینے دو اور ان پر سبقت نہ کرو)
بعض مسلمان مفکروں نے اس شرط پر زور نہیں دیا، جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

بعض مسلمان (مثلاً شیعہ) شرط عائد کرتے ہیں کہ خلیفہ ہاشمی النسب ہونا چاہیئے۔ ان میں کچھ اس کو فاطمہ رضؓ کی اولاد میں محدود رکھتے ہیں، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ آلِ عباس بن عبدالمطلب میں سے ہونا چاہیئے۔

۲۔ تمام مسائل دین، اس کے اصول اور فروع کا علم، مسلمانوں کی اکثریت یہ شرط عائد نہیں کرتی اور صرف اس پر اکتفا کرتی ہے کہ حاکم کو اتنا علم ہونا چاہیئے، جو اس کے امور میں آسانی پیدا کرے۔

۳۔ تمام گناہوں اور برائیوں سے پاک ہونا (عصمت) شیعہ میں سے امامیہ اس شرط پر اصرار کرتے ہیں، باقی تمام مسلمان اس سے متفق نہیں کیونکہ ان کے خیال میں "معصوم" صرف خدا کی ذات ہے اور کسی بھی انسان کے لیے خطا یا لغزش سے معصوم ہونا ممکن نہیں۔

حسب نسب کی شرائط تاریخ اسلام میں اہمیت رکھتی ہے "سقیفہ بن ساعدہ" ہی میں اس شرط پر اختلاف رونما ہو گیا تھا، جب انصار نے مطالبہ کیا کہ خلیفہ ان میں سے ہونا چاہیئے تو ابوبکر رضؓ نے اس بات کو قولِ رسولؐ سے مسترد کر دیا تھا (کہ آئمہ قریش میں سے ہونے چاہئیں) انصار اور جملہ مسلمان اس حدیث پر خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر دیا جو قریشی تھے پھر ان کے بعد عمرؓ، عثمانؓ اور علی رضؓ خلیفہ ہوئے جو سب قریشی تھے۔ ان کے بعد خلافت یا سرداری قریش ہی میں رہی خواہ وہ اموی تھے یا عباسی تھے یا فاطمی۔ غیر قریش میں سے کسی نے رئیس اول کے منصب کے مطالبے کی جسارت نہ کی۔ یہاں تک کہ خلافت عثمانیوں میں منتقل ہو گئی جو ترک تھے بہرحال مسلمانوں میں صدیوں تک یہ اجماع رہا کہ حاکم قریش ہی میں سے ہونا چاہیئے کیونکہ اس بارے میں احادیث رسولؐ صحیح ہیں جن میں کوئی شک نہیں، اور ان کے مقابلے میں دوسری احادیث (مثلاً "اگر تم پر کوئی حبشی بھی، جس کا سر کشمش کی طرح ہو، حاکم ہو تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو") ضعیف ہیں اور رئیس اول کے منصب سے ان کا تعلق نہیں بلکہ خاص حد تھے پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا اور ولی الامر کی اطاعت کی مسلمانوں کو ترغیب دی۔ اب جبکہ حدیثِ رسولؐ اور مسلمانوں

Marfat.com

ا اجماع اس بات پر وارد ہے کہ ریاست اولی قریش کے لیے ہے تو ان دو مصادر سے انکار اور ان سے
راف کیسے ممکن ہے اور کسی قریشی کے بغیر حکومت قائم کرنا کہاں تک جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ
کام شرعیہ کے کچھ نہ کچھ مقاصد ضرور ہیں اور حکومت انہیں پر مشتمل ہے اور انہی کی وجہ سے قائم ہوتی ہے
ھر قریش النسب ہونے کی شرط کا کیا مقصد ہے؟

اس بات پر بحث کو بڑھایا جائے تو اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ حکومت کی حمایت کے لیے عصبیت ضروری ہے جو اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ تاریخی طور پر عرب قریش ہی کو ولایت اور ومت کا اہل سمجھتے تھے، اسی پر ان کا اجتماع تھا اور انہی کی سرداری کو مانتے تھے اور قریش کے سوا کسی ر کی سنتے بھی نہ تھے۔ اگر رسول کریمؐ کسی غیر قریش کے ہاتھ میں زمام حکومت دے دیتے تو عربوں میں شار پیدا ہو جاتا اور حکومت پائیدار نہ ہوتی۔ قریش لوگوں سے حسب خواہش کام لینے پر قادر تھے اور ہ کسی فرد یا گروہ کی مخالفت رائے سے ڈرتے نہ تھے اس کا علی الاعلان اظہار "حروب ردہ" میں ہوا ب بیشتر عرب قبائل مرتد ہو گئے تھے۔ اور قریش ہی نے اس فتنے کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور لکت کو قوی بنایا۔

اسی باعث قریشی النسب ہونے کی شرط عائد کی گئی تھی۔ جب قریش کی عصبیت اور جمعیت ائل ہو گئی تو ان کی قوت بھی جاتی رہی اور قریشی النسب ہونے کی شرط کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس ں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان ایسے حاکم کو تسلیم کر لیں جو ان کو ایک مرکز پر جمع کرے اور ان میں اتحاد یدا کرے خواہ وہ قریشی ہو یا نہ ہو۔ تاریخ اسلام کے آخری دور کے مفکرین اسی رائے پر متفق تھے ن خلدون اس سلسلے میں پہلا شخص شمار ہوتا ہے جس نے اس رائے پر زور دیا اور اسی کی تائید کی۔

رئیس مملکت کی تقرری کا طریقہ

ہم نے دیکھا کہ اسلام مسلمانوں پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ریاست کو اسلام کے مبادی پر ائم کریں۔ اس بارے میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے ہم نے وہ بھی پیش کیا اور اس کا جواب بھی قرآن کریم ر رسول کریمؐ کی سنت و سیرت ہمارے قول کی تائید کرتی ہے۔ ہم نے واضح کیا تھا کہ مدینہ منورہ ں رسول اللہؐ کی حکومت میں آئینی اور بین الاقوامی قانون کے ماہرین کی تعریف کے مطابق، ریاست ے تمام عناصر موجود تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس نظریاتی اور عملی ریاست کی اساس کے جملہ پہلوؤں

Marfat.com

کا تذکرہ کیا۔ اب ہم اس ریاست کی تشکیل وصورت اور اسے تشکیل دینے والے بنیادی عناصر کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ چونکہ رئیس اعلیٰ کا موضوع ان سب سے اہم ہے، اسی لیے ہم نے اس کی صفات و شرائط بیان کردی تھیں۔ اب اُس کی تقرری کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے طریقے کا دو حصوں میں مطالبہ کیا جا سکتا ہے:

(ا) اس بارے میں تاریخی شواہد اور مثالیں، جو تاریخ اسلام میں بیان ہوئی ہیں۔

(ب) بعض اسلامی مفکرین کی آراء، اس میں ان امور پر غور کرنا ضروری ہے کہ قرآن اور سنت میں کیا حکم آیا ہے؟ کیا خلیفہ سابق نامزد کرتا ہے؟ یا انتخاب ہوتا ہے؟ یا خلیفہ سابق ولی عہد مقرر کرتا ہے یا یہ عہدہ موروثی ہے؟ اگر خلیفہ کا تقرر صرف انتخاب سے ہے تو انتخاب کا حق کس کو ہے؟ کیا ساری مسلم قوم کو؟ یا صرف اہل حل وعقد کو یا ان میں سے بھی چند ایک کو یا کسی فرد واحد کو؟

ا۔ تاریخی شواہد

تاریخی شواہد یا واقعات کے لحاظ سے ہم صرف خلفائے راشدینؓ کے تقرر کے طریقے کو مدنظر رکھیں گے کیونکہ ہم انہیں اپنے دین ودنیا کے بیشتر امور میں رسول کریمؐ کا صحیح پیرو کار گردانتے ہیں اس کے بعد اس طریقہ کا ذکر ہونا چاہیئے جس کے ذریعے اموی اور عباسی خلفاء وغیرہ برسر اقتدار آئے، جہاں تک خلفائے راشدینؓ کے طریقۂ انتخاب کا تعلق ہے تو چاروں خلفاء کا انتخاب ایک دوسرے سے الگ طریقے سے ہوا اور اسی طرح ان کے بعد کے خلفاء کا انتخاب خلفائے راشدینؓ کے انتخاب سے مختلف تھا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت مسلمانوں کے لیے کسی خلیفہ کا تقرر نہیں فرمایا تھا، حالانکہ آپؐ کو قربِ مرگ کا احساس تھا اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

تو بہت سے مسلمانوں کو بھی حضورؐ کے وداع کا احساس ہوگیا تھا اور پھر آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: "شاید اس برس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔" جب رسول اللہؐ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپؐ کو یقین ہوگیا کہ اب آپؐ رفیقِ اعلیٰ سے ملنے والے ہیں تو بھی آپؐ نے

Marfat.com

مسلمانوں پر کوئی سردار مقرر نہ فرمایا۔ آپؐ نے ابوبکرؓ کو ولی عہد مقرر کرنے کے بارے میں سوچا اور آپؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"میں نے چاہا یا ارادہ کیا، کہ ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے کو بلوا بھیجوں اور اپنے بعد نائب بنا جاؤں اور دیکھوں کہ کہنے والے کیا کہتے ہیں اور چاہنے والے کیا چاہتے ہیں۔ پھر میں نے کہا ہو سکتا ہے اللہ اسے نہ چاہے اور مسلمان بھی اسے رد کر دیں، یا اللہ رد کر دے اور مسلمان بھی انکار کر دیں۔"

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: رسول اللہؐ نے مجھ سے کہا:

"عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کو میرے پاس لاؤ کہ میں ابوبکرؓ کے لیے تحریر لکھ دوں کہ میرے بعد کوئی اختلاف نہ کرے۔"

پھر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا: "رہنے دو! خدا نہ کرے کہ مسلمان ابوبکرؓ کے بارے میں اختلاف کریں۔" بہرحال اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ نے نہ ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کیا نہ ان کے سوا کسی اور کو۔ اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے اس مؤقف کا سبب کیا تھا؟

بعض لوگوں نے یہ حجت دی ہے کہ حضورؐ کا مرض اتنا شدید تھا کہ آپؐ کو خلیفہ کے تقرر پر غور کرنے کا ہوش ہی نہ تھا، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کی بیماری ابتدائی ایام میں شدید نہ تھی، اور بعد میں بھی یہ علالت آپؐ کو مملکت کے اہم امور سرانجام دینے سے مانع نہ ہوئی۔ مثلاً آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ نماز میں مسلمانوں کی امامت کرنے کا حکم دیا اور آپؐ نے اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے پر بھی غور فرمایا تھا۔

بعض مستشرقین نے دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریمؐ اس بات سے آشنا تھے کہ قبائلی نظام میں وارث مقرر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے آپؐ نے خلیفہ کے تقرر کو مسترد کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی کہ آپؐ کے بعد حکومت سنبھالتی اور حکومت وراثتاً منتقل ہو جاتی۔ اگر آپؐ کسی کو منتخب فرماتے تو صحابہؓ ہی میں سے کرتے۔ آپؐ نے واضح طور پر کوئی اپنا مقرر نہ فرمایا مگر اشارۃً فرما دیا کہ "اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست کو بناتا تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتا۔" اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "میری امت میں لوگوں پر سب سے زیادہ رحم کرنے والا ابوبکرؓ ہے۔" البتہ آپؐ نے اس اشارے کو وضاحت کا جامہ نہ پہنایا۔

Marfat.com

ہمارے نزدیک قولِ راجح یہ ہے کہ حضورؐ اس بات سے گھبراتے تھے کہ اگر آپؐ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر فرما دیں تو مسلمان یہ گمان کریں گے کہ اس کا تقرر امرِ خداوندی ہے اور اس کی خلافت اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد کسی مسلمان کے لیے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہ رہتی۔ اس کے اعمال پر نکتہ چینی کی جاسکتی۔ اس طرح حکومت آمریت میں تبدیل ہو جاتی یا بعض لوگ اس خلیفہ کو مرتبۂ نبوت وغیرہ کا حامل قرار دیتے یا نبی کی جگہ سمجھتے۔ اسی لیے حضورؐ نے مسلمانوں کو اپنے امور سرانجام دینے میں آزاد چھوڑ دیا۔ تاہم آپؐ جانتے تھے کہ ابوبکرؓ سب سے زیادہ خلافت کے سزاوار ہیں اور مسلمان بھی اس بات کو جانتے تھے کیونکہ ابوبکرؓ حضورؐ کے رفیقِ غار تھے اور انہوں نے آپؐ کی تصدیق اس وقت کی جب دوسروں نے تکذیب کی اور آپؐ نے صرف انہیں کو اپنی امت میں سے "دوست" بنانا چاہا۔

حضرت ابوبکرؓ کا طریقۂ انتخاب

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے جو اولین کام کیا وہ آپؐ کے خلیفہ کا انتخاب تھا حتیٰ کہ انہوں نے اس کام کو حضورؐ کی تجہیز و تکفین پر بھی فوقیت دی۔ اس کام کو کسی سخت نقصان کے بغیر، مؤخر بھی کیا جاسکتا تھا مگر اس صورت میں ایک نوزائیدہ مملکت کسی ذمہ دار فرد یا حکم کے بغیر رہ جاتی اور یہ بات نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ جزیرۂ عرب کے بیشتر قبائل اس نئے دین سے عہد و پیمان توڑنے کی فکر میں تھے، اور روم اور فارس، جو اس نئی اسلامی ریاست سے خوفزدہ تھے، اُسے ختم کرنے کے لیے اپنے عساکر جمع کر رہے تھے۔

تمام مسلمانوں نے یکجان ہو کر خلیفۂ رسولؐ کے انتخاب کے بارے میں سوچا۔ ان میں انصار بھی شامل تھے جنہوں نے دل و جان سے اسلام قبول کیا تھا اور آڑے وقت میں اس کی مدد کی اور مسلمانوں کو پناہ دی تھی، اور بنو ہاشم اور عام مہاجرین بھی شامل تھے۔

جب حضرت عمرؓ کو علم ہوا کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں تو وہ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے، جو رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اور انہیں اس بات کی اطلاع دی۔ دونوں انصار کے اس اجتماع میں پہنچے۔ راستے میں انہیں ابوعبیدہ بن الجراح مل گئے تو انہیں بھی ساتھ لے لیا۔

Marfat.com

بعض مستشرقین، جو تاریخ اسلامی میں عیاری اور مداہنت کے خوگر ہیں، ان تینوں اصحابِ رسولؐ کے اجتماع کو بھی "سازش" قرار دیتے ہیں کہ وہ تینوں یکے بعد دیگرے خلافت یا حکومت کے خواہشمند تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے بعد ہی سے، جب رسولِ کریمؐ کے قتل کی افواہ پھیل گئی تھی اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ سب مستشرقین کی خرافات اور ان کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینے کا نتیجہ ہے۔ ہم تو اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کریں۔ مستشرقین کو سازشوں اور عیب جینیوں کے عادی ہیں اور نہیں جانتے کہ صحابہ رسولؐ کو رسول اللہؐ سے کیا ربط اور کیا عشق تھا۔ یہ وہی عمرؓ تھے جنہوں نے رسولِ کریمؐ کی وفات سن کر دھمکی دی تھی کہ جو ان کی موت کا ذکر کرے گا وہ اسے قتل کر دیں گے!

بہرحال، انصار سقیفہ میں جمع ہوئے اور پھر کچھ مہاجرین بھی آ گئے جن میں سرفہرست ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ تھے۔ یہ اجتماع تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور بڑے بڑے سیاسی اجتماعات میں اس کا شمار ہوتا ہے، یہ نہ صرف اسلامی تاریخ کا، بلکہ انسانی سیاسی فکر کا زندہ و جاوید وثیقہ ہے۔

مسلمانوں یا ان کے اہلِ حل و عقد نے دل کھول کر اس اجتماع میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا اور ایک دوسرے پر پوری آزادی سے جرح و تنقید کی، انہیں اس بات کا قطعاً خوف نہ تھا کہ دوسرا فریق ان کے اظہار خیال سے ناراض ہوگا کیونکہ سب کا مقصد ایک تھا یعنی مسلمانوں کی فلاح اور ان کی بھلائی کی کوشش۔ مہاجرین کے نمائندے اپنی مدلّل رائے دیتے اور انصار کی رائے کا جواب بھی۔ اسی طرح انصار اپنی رائے پیش کرتے اور بحث کرتے۔ اس کے نتیجے میں سب نے حضرت ابوبکرؓ کو متفقہ طور پر منتخب کر لیا اور جو لوگ مخالفت کر رہے تھے انہوں نے بھی بیعت میں پس و پیش نہ کی۔

اس تاریخی جلسے کی اہمیت کے پیش نظر ہم طبری کی مختصر تاریخ سے اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کے بارے میں کتب تواریخ میں بے حد غلط بیانی اور دسیسہ کاری ہوئی ہے[1]۔

اس عظیم مؤرخ نے مکمل اسناد کے ساتھ ایک طویل حدیث میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

Marfat.com

"جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور کہنے لگے محمد ﷺ کے بعد ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو ولی الامر مقرر کرتے ہیں۔ سب نے انہیں بلوا بھیجا حالانکہ وہ بیمار تھے اور ان سے اپنے خیال وارادے پر رائے طلب کی۔ اور مہاجرین کا بھی نقطۂ نظر بھی بیان کیا۔ اسی اثنا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر مل گئی وہ تیزی سے حضور ﷺ کے دولت خانے پر گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو اندر تھے، بلوا بھیجا وہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت رسول کریم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اور کہا کہ جلدی سے آیئے ایک ایسا معاملہ ہو گیا ہے جس میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔

جب ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر آئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو ولی الامر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک قریش میں تھے۔ دونوں چل پڑے راستے میں انہیں ابوعبیدہ بن الجراح مل گئے جنہیں ساتھ لے کر اجتماع انصار میں پہنچے۔ عمر رضی اللہ عنہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: آرام سے، پہلے مجھے بات کرنے دو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپ ﷺ کو اپنی امت پر گواہ بنایا کہ اسی کی عبادت کریں اور اُسے ایک جانیں۔ اس سے پہلے کئی خداؤں کی پوجا ہوتی تھی جنہیں وہ اپنا شفیع سمجھتے تھے۔ کوئی خدا پتھر سے تراشا ہوا تھا اور کوئی لکڑی سے گھڑا ہوا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلاوت کی:

"ویعبدون من دون اللہ..... شفعاؤنا عند اللہ"

"وقالوا ما نعبدهم...... زُلفیٰ"

"عربوں پر یہ بات شاق تھی کہ وہ اپنے آباؤ و اجداد کا دین ترک کر دیں، اس لیے اللہ نے آپ ﷺ کی قوم سے اولین مہاجرین کو مخصوص کیا کہ وہ آپ ﷺ کی تصدیق کریں آپ ﷺ پر ایمان لائیں، آپ ﷺ کی   کریں اور آپ ﷺ کے ساتھ مصائب پر صبر کریں۔ حالانکہ آپ ﷺ کی قوم نے ایذا دہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور آپ ﷺ کی تکذیب شدومد سے کی۔ ہر قوم کے اندر مخالف نظریات رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے

Marfat.com

جنہوں نے اس سرزمین پر پہلے پہلے اللہ کی عبادت کی اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ یہی لوگ آپؐ کے اولیاء ہیں اور آپؐ کے بعد سرداری یا حکومت کے زیادہ سزاوار ہیں۔ صرف بے انصاف لوگ ہی اس بات پر جھگڑا کریں گے۔ اے قوم انصار! جہاں تک تمہارا تعلق ہے، کوئی بھی دین میں تمہاری فضیلت اور اسلام میں سبقت سے انکار نہیں کرے گا۔ اللہ نے تمہیں اپنے دین اور اپنے رسولؐ کا انصار بنانا پسند فرمایا اور آپ لوگوں ہی کی طرف آپؐ نے ہجرت کی۔ تمہیں میں آپؐ کی ازواج اور اصحاب ہیں اس لیے مہاجرین اولین کے آپ لوگوں کی منزلت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تم وزراء ہو جن سے مشورے میں کوتاہی نہیں کی جائے گی اور امورِ ریاست تمہارے بغیر سرانجام نہ پائیں گے۔"

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حباب بن منذر انصاری اور انصار کے لیے حکومت کا مطالبہ کیا کہ ان کے خلاف جانے کی کوئی جرأت نہ کرے گا، اور لوگ انہی کی رائے پر عمل کریں گے کیونکہ "ہم لوگ اہل عزت و قوت ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، تجارت کے مالک ہیں اور طاقت رکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ (مہاجرین) اس سے انکار کریں تو ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

حضرت عمرؓ اس کا جواب دیئے بغیر نہ رہ سکے:

"افسوس دو تلواریں ایک نیام میں نہیں رہ سکتیں اور دو اونٹ ایک رسی سے نہیں باندھے جا سکتے۔ خدا کی قسم! عرب اس پر راضی نہیں ہوں گے کہ امیر تم میں سے ہو اور نبی دوسروں میں سے۔ البتہ عربوں کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ وہ امارت بھی اسی کو دے دیں جس میں نبی تھا، اور اپنے امور کو خود ہی سرانجام دیں۔ اس لحاظ سے ہمارے پاس اس شخص کے لیے جو عربوں (کی سیادت سے) انکار کرے۔ واضح دلیل اور ظاہری طاقت ہے۔ جو محمدؐ کے اختیار اور اس کے حکم میں جھگڑا کرتا ہے، جبکہ ہم اس کے ولی اور اہل خاندان ہیں، تو وہ دلیل باطل پیش کر رہا ہے یا گنہگار ہے یا ہلاکت میں گرنے والا ہے۔"

حبابؓ بن المنذر نے حضرت عمرؓ کی بات کا سختی سے جواب دیا (جس کو طبری نے پورے کا پورا نقل کیا ہے) ان کے بعد ابوعبیدہ نے کہا:

Marfat.com

"اے انصار! تم اولین لوگ تھے جنہوں نے (اسلام کی) مدد کی اور پشت پناہ تھے اب تمہیں زیبا نہیں کہ تمہیں سب سے پہلے پلٹنے والے اور بدلنے والے بن جاؤ۔"

پھر بشیر بن سعد کھڑے ہوئے اور کہا:

"اے انصار! خدا کی قسم! ہم لوگ مشرکین سے جہاد میں سب سے آگے اور دین میں سبقت رکھنے والے ہیں، اس سے ہماری غرض صرف خدا کی رضا اور نبی کی اطاعت تھی اور ہم نے اپنی جانوں کو تکلیف میں ڈالا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان باتوں سے لوگوں پر رُعب ڈالیں، نہ ہم اللہ سے اس کا کوئی اجر یا بدلہ چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح تو اللہ نے ہم پر احسان کیا تھا، مگر یاد رکھو کہ محمدؐ قریش میں سے تھے اور ان کی قوم کا حق اولین رکھتا ہے اور خدا کی قسم، میں تو ہرگز اس بارے میں اُن سے بحث نہیں کروں گا تم بھی خدا سے ڈرو اور اس بارے میں ان کی مخالفت کرو نہ ان سے جھگڑا کرو۔"

حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

"یہ عمرؓ ہیں اور یہ ابوعبیدہؓ ان میں سے جس کے ہاتھ چاہو بیعت کرلو۔"

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"خدا کی قسم، ہم آپ کے مقابلے میں حکومت کے اہل نہیں کیونکہ آپ مہاجرین میں افضل ہیں۔ حضورؐ کے رفیق غار ہیں اور نماز میں رسول اللہ کے خلیفہ ہیں اور نماز دین اسلام کا سب سے افضل رُکن ہے، کون چاہے گا کہ آپ پر سبقت کرے اور امارت کو آپ پر مسلط کرے؟ ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔"

جب دونوں بیعت کے لیے بڑھے تو بشیر بن سعد اُن پر سبقت لے گئے۔ پھر پورے قبیلہ اوس نے بیعت کی اور پھر باقی مسلمانوں نے ان کی کی۔

اس عالی شان اجتماع اور ان بلند پایہ مباحث کا جو وہاں اٹھائے گئے تجزیہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب حضرت عمرؓ کی نامزدگی، اہل حل وعقد کی موافقت اور تمام مسلمانوں کی بیعت سے عمل میں آیا۔ اس بحث و تمحیص سے، جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی، یہ صاف نظر آتا ہے کہ دونوں مخالف نظریوں میں اُبھرتی ہوئی اسلامی مملکت کا مفاد ہی مقدم تھا۔ انصار کا خیال تھا

Marfat.com

کہ چونکہ مملکت اُن کے علاقے میں قائم ہو رہی ہے اس لیے وہ اس کی حفاظت اور دفاع پر زیادہ قادر ہیں۔ ان کے مقابلے میں مہاجرین کی رائے تھی کہ عرب معاشرہ مصلحت عامہ کے معاملے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس لیے وہ قریش سے زیادہ کسی کو امارت کے اہل نہ پاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے انتخاب کا طریقہ

حضرت عمرؓ کا انتخاب، حضرت ابوبکرؓ کے طریقہ انتخاب سے بالکل مختلف تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے لیے اپنی زندگی ہی میں عہد لے لیا تھا اور مسلمانوں کے اہل حل و عقد نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو مسلمانوں کو علم تھا کہ ان کے بعد ان کا امیر کون ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں میں کھڑے ہوئے اور اپنی بیعت کے عہد سے انہیں آزاد کرتے ہوئے ان سے خلیفہ منتخب کرنے کو کہا، مگر مسلمانوں نے یہ انتخاب انہی پر چھوڑ دیا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ کے بارے میں مشورہ کرنا شروع کیا۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ خواہش کہ مسلمان کسی ایک نام پر بطور خلیفہ متفق ہو جائیں، اس لیے تھی کہ اس وقت مملکتِ اسلامی دو عظیم مملکتوں (فارس و روم) سے زبردست جنگ میں الجھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے رئیسِ اعلیٰ کے انتخاب میں کسی بحث یا تاخیر کی گنجائش نہ تھی تاکہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے فوراً بعد مسلمانوں کے امور اور مفادات کا کوئی نہ کوئی نگران موجود ہو۔

یوں حضرت ابوبکرؓ کبار صحابہ سے مشورہ کرنے لگے اور اہل حل و عقد کو بلا کر بات چیت کی۔ وہ مسلمانوں کی رائے بھی ٹٹولتے رہے۔ انہوں نے عبدالرحمن بن عوف، عثمان بن عفان، سعید بن زید، اسید بن الحضیر رضی اللہ عنہم سے رائے بالخصوص چاہی۔ وہ سب حضرت عمرؓ کی فضیلت، خلافت کی اہلیت اور مسلمانوں کی سیادت میں اولیت پر متفق تھے۔ البتہ بعض نے حضرت عمرؓ کی فضیلت کے ساتھ ساتھ اُن کی سخت مزاجی کا خدشہ ظاہر کیا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تسلی دی کہ عمرؓ کی نرمی ان کی سختی پر غالب آجائے گی اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو نرمی اور رحم کا مؤقف اختیار کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت عمرؓ سے بڑھ کر مسلمانوں میں خلافت کا مستحق کوئی نہ تھا، کیونکہ وہ دور ایسا تھا، کہ مملکتِ اسلامیہ تکلیف دہ حالات سے دوچار تھی اور شدید جنگوں میں اُلجھی ہوئی تھی جن کی وجہ سے

Marfat.com

کسی ایسے شخص کا عہدہ خلافت سنبھالنا ضروری تھا جو دور اندیش، صاحب عزیمت اور بارعب ہو۔

چنانچہ جب ابوبکرؓ نے اپنی مشاورت ختم کیں اور عمرؓ کے انتخاب پر مسلمانوں کا اجماع پایا تو انہوں نے مسلمانوں کے رُوبرو ہو کر حضرت عمرؓ کے انتخاب کی اطلاع دی، مسلمانوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی۔ اس لحاظ سے حضرت عمرؓ کا انتخاب، حضرت ابوبکرؓ کی ذاتی نامزدگی سے ہوا جس سے مسلمانوں نے اتفاق کیا۔ یہ معاملہ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی ہی میں طے پا گیا گیا حضرت عمرؓ کے انتخاب پر شوریٰ کا انعقاد اسی طرح واضح تھا جس طرح خود حضرت ابوبکرؓ کی تقرری میں تھا۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کا طریقہ

حضرت عمرؓ جب ابولؤلؤ فیروز کے ہاتھوں زخمی ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کو جمع کیا کہ ان کے بعد خلیفہ کا فیصلہ کرلیں۔ مسلمانوں کے اصرار کے باوجود انہوں نے اپنے بیٹے یا کسی کو اور نامزد کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ اگر ابوبکرؓ کسی کو خلیفہ نامزد کر سکتے تھے تو وہ بھی کر سکتے تھے۔ اور اگر ایسا کرتے، تو سنتِ رسولؐ بھی تھی لیکن عمرؓ نے نیا طریقہ سوچا اور چھ عظیم صحابہ کے شوریٰ پر معاملہ چھوڑ دیا کہ رسول اللہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اُن سے راضی تھے۔ یہ چھ صحابہ عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام طلحہ بن عبید اللہ اور سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں اور انہیں تین دن کی مہلت دی کہ زیادہ سے زیادہ اس عرصے میں رئیس اول کا انتخاب ہو جانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی کہا کہ ان چھ صحابہ کی مشاورت میں ان کے بیٹے، عبداللہ بن عمر بھی شریک ہوں گے مگر انہیں خلافت کا حق نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کی کہ اگر چھ میں سے تین، ایک امیدوار کی اور تین دوسرے امیدوار کی حمایت کریں تو وہ اس فریق کا ساتھ دیں جس میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہوں اور یہ حکم بھی دیا کہ جو شخص اکثریت کے اختیار کردہ امیدوار کی مخالفت کرے یا اس کی بیعت میں رکاوٹ ڈالے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔

جب اصحابِ شوریٰ جمع ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ خلافت کے عہدے کی امیدواری سے دستبردار ہو گئے۔ باقی سب نے ان سے درخواست کی کہ مشورے میں ان کا ساتھ دیں اور اُسے نامزد کریں جس پر مسلمان متفق ہوں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف دن رات لوگوں کی رائے معلوم کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں احساس ہوا

Marfat.com

کہ لوگ دو میں سے کسی ایک کے انتخاب کو تسلیم کر لیں گے، یعنی علیؓ بن ابی طالب اور عثمانؓ بن عفان عبدالرحمنؓ نے بالآخر یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی اکثریت حضرت عثمانؓ کی رحم دلی اور نرمی کو پسند کرتی ہے، شاید مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب ان کی مملکت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو چکی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ وہ پُرامن ماحول میں زندگی گزاریں اور مرفہ الحالی سے لطف اندوز ہوں۔

جب عبدالرحمنؓ مشاورت کر چکے تو اب اُن کے لازم تھا کہ وہ دو میں سے ایک کو مسلمانوں کے لیے نامزد کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کیا اور پہلے حضرت علیؓ کو بلا کر پوچھا کہ وہ کتاب اللہ، سنتِ رسولؐ اور آپؐ کے دونوں خلفاء کے طریق کے مطابق حکومت کرنے پر آمادہ ہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ وہ حسبِ استطاعت ان کے مطابق عمل کریں گے۔ پھر انہوں نے یہی سوال حضرت عثمانؓ سے کیا تو انہوں نے صرف "ہاں" کہا اور کوئی شرط عائد نہ کی۔ اس پر عبدالرحمنؓ نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور تمام مسلمانوں نے بھی بیعت کی جن میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ اس طرح عبدالرحمنؓ نے مسلمانوں سے کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو نامزد کر دیا، جس کی توثیق بعد میں اہلِ حل و عقد اور جملہ مسلمانوں نے عام بیعت کے ذریعے کر دی۔

حضرت علیؓ کے انتخاب کا طریقہ

حضرت علیؓ کا انتخاب خلفاء سابقین سے بالکل مختلف تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے حالات مختلف تھے۔ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل چکا تھا اور مسلمان گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ امیر المومنین عثمانؓ قتل ہو چکے تھے اور لوگ سخت اضطراب اور پریشانی میں تھے۔ مدینہ میں اقطار و جوانب کے لشکر جمع تھے گویا وہ حالتِ جنگ میں ہوں۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خلیفہ کی اچانک رحلت کے بعد جو اُن کے لیے بے حد اندوہناک تھی، کیا کریں اور خلیفۂ مقتول کی جگہ کسے مقرر کریں اور مملکتِ اسلامیہ کو حیاتِ نو بخشنے کے لیے کیا اقدام کریں، اور جس ظالمانہ فعل کا ارتکاب کیا گیا ہے اس کا صدمہ کس طرح زائل کریں؟

تمام لشکر حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو گئے اور تقاضا کیا کہ وہ مسلمانوں کے امیر کا عہدہ سنبھال لیں علیؓ نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ انہیں (لشکریوں کو) خلیفہ کے انتخاب کا حق حاصل نہیں علیؓ کو احساس تھا کہ اگر انہوں نے اربابِ حل و عقد کی رضامندی کے بغیر، محض ان لوگوں کی بیعت سے

Marfat.com

خلافت قبول کر لی تو ایک ایسی نظیر قائم ہو جائے گی جو خطرناک بھی ہو سکتی ہے، اور عملاً یہ بیعت جبر و اکراہ کے دائرے میں آئے گی، اس لیے حضرت علیؓ نے یہی چاہا کہ حسب سابق اور اپنے سے پہلے تینوں خلفاء کے طریق کار کے مطابق، صحابہ کبار اور ارباب حل و عقد ہی کو خلیفہ کے انتخاب کا اختیار ہونا چاہیے۔

جب کبار صحابہ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور انہیں خلافت پیش کی تو علیؓ نے اس سے انکار کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے اصرار کیا اور بہت زور دیا۔ اس پر علیؓ نے کہا کہ سب مسلمان مسجد نبوی میں جمع ہوں اور عام بیعت کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سب حاضرین نے علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو اجماع ابوبکرؓ، عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بیعت پر ہوا تھا وہ بیعت علیؓ کے وقت مفقود تھا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے بعد میں کہا کہ انھوں نے بجبر و اکراہ بیعت کی تھی اور دونوں نے حضرت عائشہؓ کا ساتھ دیا۔ اور حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح معاویہؓ اور اہل شام نے بھی اپنے ذاتی سبب سے بیعت سے انکار کیا اور علیؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ عثمانؓ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ ماحصل یہ کہ مسلمانوں میں دو خوفناک اور اندوہناک جنگیں، جنگ جمل اور جنگ صفین اسی مناقشے کے نتیجے میں لڑی گئیں۔

حضرت علیؓ کی بیعت پہلے اہل مدینہ نے کی اور پھر آس پاس کے تمام علاقے کے مسلمانوں نے، سوائے اہل شام کے، بیعت کر لی۔

حضرت حسنؓ بن علیؓ، معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہو گئے اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے معاویہؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا، جس کے بعد خلافت موروثی حکومت بن گئی، اگرچہ ہر نیا خلیفہ، اپنے سابق خلیفہ کا ولی عہد مقرر کیا جاتا تھا۔ مثلاً معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کے لیے عہد لیا، مروان نے اپنے بیٹے عبدالملک کے لیے عہد لیا، پھر اس نے اپنے بیٹے ولید کے لیے اور پھر دوسرے بیٹے سلیمان کے لیے عہد لیا اور یہ سلسلہ اسی طرح چل نکلا۔ اتنا ضرور تھا کہ بنو امیہ اور ان کے بعد کے خلفاء بیعت کی پاسداری کرتے رہے اور یہ عمل جاری رکھا۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے بیٹے کے حق میں، یا اپنی زندگی ہی میں کسی اور کے لیے بیعت لے اور اس کے بعد اس کے تخت نشین ہونے پر مسلمان دوسری دفعہ بیعت کریں۔ اس موروثی نظام کی ایجاد پر بعض نے معاویہؓ

Marfat.com

کی طرف یہ عذر پیش کیا ہے کہ حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے ایسا نظام ضروری ہوگیا تھا۔ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ چکا تھا، فتوحات کو مستحکم کرنا لازمی تھا اور اسلام کی دشمن طاقتوں کے ہوتے ہوئے، جو گھات لگائے بیٹھی تھیں، ایک مضبوط مملکت کے قیام کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر ایک ایسی حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی جو "عصبیت" رکھتی ہو ــــ اور ان حالات میں صرف بنوامیہ کی "عصبیت" ہی اس بات پر قادر تھی کہ اسلامی حکومت کے استقرار کا بوجھ اٹھا سکے اور اس کی بنیادوں کو پختہ کرے انہی اسباب کی بنا پر معاویہ نے یہ نظام رائج کیا اور اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا۔

ہم نے حاکم اعلیٰ کے انتخاب کے بارے میں تاریخی واقعات پیش کر دیئے ہیں، اور اب ہم ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ ہم حالات کا جائزہ لے سکیں۔ جن کے تحت مسلمانوں نے خلیفہ یا امام کی تعیین کی یکمد یہ واضح رہے کہ ہم ان نظائر کے اتباع یا التزام کے پابند نہیں۔ ہم تو ان سے صرف روشناس ہونا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ کوئی آسمانی حکم نہیں جس کی پیروی لازمی ہو، مسلمان اپنے حالات، ماحول اور زمانے کے مطابق اور مناسب کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

خلیفہ کے انتخاب کے بارے میں یہ طریقے سامنے آتے ہیں:

۱۔ اہل حل وعقد کی طرف سے انتخاب۔
۲۔ ماسبق خلیفہ کی طرف سے نامزدگی۔
۳۔ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھنے والے کی طرف سے اعلان اور اس کے ہاتھ پر مسلمانوں کی بیعت
۴۔ خلیفہ سابق کی طرف سے اس کے جانشین کے انتخاب کے طریقے کا تعیین
۵۔ وراثت۔
۶۔ جبر وغلبہ
۷۔ قرآن یا سنت یا خلیفہ سابق کی طرف سے کوئی حکم۔

مثالی طریقہ تو یہی ہے کہ ــــ اور یہی سب طریقوں میں قدر مشترک رہی ہے ــــ کہ ارباب حل وعقد خلیفہ کا انتخاب کریں۔ "ارباب حل وعقد" کون ہیں؟ ان کے بارے میں ہم بعد میں تفصیل سے عرض کریں گے۔ مگر اتنا جان لیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی مملکت میں رائے رکھتے ہیں اور ان کی بات سنی جاتی ہے۔ علمائے سیاست اور فقہائے مسلمین کی اکثریت کی رائے میں ارباب حل وعقد وہ ہیں جو مملکت میں خلیفہ کے انتخاب کی حیثیت کے حامل ہیں، خلیفہ اوّل کے انتخاب کے وقت جو لوگ جمع تھے ان کی حیثیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ شوریٰ کا مفہوم کیا ہے؟

Marfat.com

علمائے سیاست و دین اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں کہ انتخاب خلیفہ کے لیے اربابِ حل وعقد سے کیا مراد ہے۔

پہلی یہ کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو انتخاب کے وقت مملکت اسلامیہ یا دارالحکومت میں موجود ہوں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ خلفائے اربعہ کا انتخاب اُن اہل حل وعقد نے کیا جو مدینہ میں موجود تھے۔ یہ زیرِ غور رہے کہ اگر مملکت کے گوشے گوشے سے تمام اہلِ رائے کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو بڑی دشواری پیش ہو گی، کیونکہ سفر کے حالات آسان نہیں ہوتے، اور اگر اس میں تاخیر روا رکھی جائے تو حاکم اعلیٰ جیسے اہم منصب کے انتخاب میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ "الاحکام السلطانیہ" کا مصنف، الماوردی اس رائے کا حامل ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے تمام منطقوں اور علاقوں کے ارباب حل وعقد کو شریک ہونا چاہیئے کیونکہ پہلی رائے کے حق میں کوئی دسنت سے کوئی سند نہیں ملتی۔ "الفصل فی الملل والاہواء والنحل" کے مصنف، ابن حزم نے اس کی سخت مخالفت کی ہے کہ اس میں ہرگز کوئی خوبی یا فائدہ نہیں۔

ہماری رائے میں صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے مقابلے میں ہمارے زمانے کے حالات بدل چکے ہیں اور جو باتیں اُن کے لیے دشوار تھی اب ابتداً اتنی دشوار نہیں رہی، مثلاً سفر میں اب خاصی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں، اور اب ایسا نظام بالعموم رائج ہو چکا ہے جس "ارباب حل وعقد" سال میں کئی بار دارالحکومت میں جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مملکت کے سب لوگ انتخاب خلیفہ (یا حاکم) میں شریک ہوں۔ البتہ اگر حالات اجازت نہ دیتے ہوں تو اور پوری مملکت سے ارباب حل وعقد کا اجتماع مشکل ہو جائے تو پھر دارالحکومت میں موجود افراد ہی پر اکتفا کرنا چاہیے
جہاں تک خلیفہ سابق کی طرف سے اپنے جانشین کی نامزدگی کا تعلق ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا تو اس بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ کو نامزد کرتے وقت ابوبکرؓ نے صرف اپنی رائے سے کام نہیں لیا تھا بلکہ انہوں نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور اہل حل وعقد کی اکثریت کی رائے معلوم کی۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ سب کی رائے یہی ہے کہ عمرؓ سب مسلمانوں سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں اگرچہ ایک نے عمرؓ کی سخت مزاجی کا تذکرہ ضرور کیا تو ابوبکرؓ نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ بعد میں عمرؓ کی سخت مزاجی سے خوفزدہ ہونے والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ سختی حضرت ابوبکرؓ کی نرمی کے سبب تھی۔

Marfat.com

ابن حزم کے خیال میں حاکمِ اعلیٰ کے انتخاب کا یہ طریقہ سب سے بہتر ہے کہ اس سے حکومت میں فصل یا وقفہ نہیں آتا اور اہلِ رائے کا مشورہ بھی شامل ہوتا ہے۔

اگر کبھی ایسا ہو کر اربابِ حل وعقد خلافت کے لیے کسی کا انتخاب نہ کریں اور خلیفۂ سابق بھی اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرے، تو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص، جو خلافت کی شرائط پر پورا اترتا ہو، اپنے آپ کو پیش کر دے اور اگر مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد کی اکثریت اس کی تائید کرے اور اس کی بیعت کر لے تو وہ مملکت کا حاکمِ اعلیٰ بن جائے گا۔

یہاں اس بات کا اشارہ ضروری ہے کہ زیدیہ کی اکثریت (جو یمنی شیعوں کا اعتدال پسند گروہ ہے) اس طریقے پر عمل کرتی ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "نص کی رو سے" امامت تو علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کا حق تھی مگر ان کے بعد جو بھی امامت کا مستحق ہو، اس کا دعویدار ہو سکتا ہے۔

خلیفۂ سابق یہ بھی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے بعد کسی خاص شخص کو نامزد کرنے کی بجائے انتخاب کا طریق کار متعین کر جائے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا کہ انہوں نے اصحابِ شوریٰ مقرر کر دیئے اور ان پر چھوڑ دیا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو، مسلمانوں سے مشورے کے بعد، منتخب کر لیں۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہونے کے بعد، کس طرح مسلمانوں کے خیالات معلوم کیے اور ان سے مشورہ کیا، اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت عثمانؓ اور علیؓ میں سے کسی ایک کے حق میں ہے تو انہوں نے دونوں امیدواروں کو بلا کر عہد لینا چاہا کہ وہ قرآن وسنت اور شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے۔ عثمانؓ نے تو بلاتردد مان لیا مگر علیؓ نے تذبذب کا اظہار کیا، جس پر عبدالرحمٰنؓ نے فوراً عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور تمام مسلمانوں نے (جن میں حضرت علیؓ شامل تھے) ان کی پیروی کی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی بیعت ایک لحاظ سے "نامزدگی" تھی، اور جملہ مسلمانوں کی بیعت 'انتخاب' کی حیثیت رکھتی تھی۔

ہمارے خیال میں یہ تمام طریقے اہل حل وعقد کی موافقت پر مبنی ہیں۔ بعض علماء نے وراثت کو بھی خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ ٹھہرایا ہے اس طریقے کے مطابق کسی دور یا ملک میں رائج نظامِ وراثت کے تحت حکومت بیٹے، بھائی یا کسی اور کو منتقل ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں میں اس طریقے کی حمایت سب سے پہلے ابنِ خلدون نے کی۔ اس کے ہم خیال علماء کے نزدیک ایک طرح سے سابق خلیفہ کی طرف سے ولی عہد نامزد کرنے کے مشابہ ہے اور استقرارِ حکومت اور ملک میں امن وسلامتی کا ضامن ہے۔ ہم یہ کہنے میں باک نہیں کہ خلفائے بنوامیہ، نظامِ وراثت کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنے نامزد ولی عہد کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے پر

Marfat.com

بیعت لینے میں بہت شدت سے کام لیتے تھے۔ جب اُن کا نامزد منصبِ خلافت سنبھالتا تھا تو عامۃ المسلمین سے دوبارہ بیعت لی جاتی تھی۔ اس طرح یہ نامزدگی اور "انتخاب" جبراً ہوتا تھا اور عوام اس میں مجبوراً حصہ لیتے تھے۔

بعض فقہائے احناف نے "قہر و غلبہ" کے طریقے کی حمایت کی ہے کہ یہ بھی مسلمان حاکمِ اعلیٰ کی تقرری کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے قبیلے یا خاندان یا دوسرے حامیوں کی مدد سے حکومت پر قابض ہو جائے تو وہ فی الامر حاکم ہو جاتا ہے۔ شاید اس طرح فقہائے احناف اس اقدام کی تائید کر رہے ہیں جو معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کی خاطر اٹھایا اور اس وقت بعض مسلمانوں نے اس کی بیعت کرنے کی پس و پیش کی۔ ممکن ہے اس طرح استقرارِ حکومت کا مقصد تو حاصل ہو جائے مگر اس طریقے کی حمایت سے اقتدارِ اعلیٰ کے ہر حریص شخص کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ قوت اور رعب سے مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے، خواہ وہ اس کا اہل ہو یا نہ ہو۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے اتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل جائے گا جسے بند کرنا ممکن نہ ہو گا۔

آخر میں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ شیعوں کے بعض فرقے کہتے ہیں کہ امام کے انتخاب میں نصّ کا اعتبار افضلیت رکھتا ہے۔ (امامیہ (جعفریہ) فرقے کی رائے میں قرآن اور سنت، رسول اللہؐ کے بعد، حضرت علیؓ کی امامت پر دلالت کرتے ہیں۔ علیؓ، حضرت حسنؓ پر نصّ ہیں، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ پر، اور حسینؓ اپنے بعد علی (زین العابدین) پر نصّ ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔ امامیہ نے آیات اور احادیث کی ایسی تاویلیں کی ہیں جو تکلف محض نظر آتی ہیں اور جن کی حمایت عربی زبان کرتی ہے، نہ تاریخی واقعات۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے:

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون (المائدہ (۵) : ۵۵)

شیعہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ "نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور رکوع کرنے والے" سے مراد دراصل علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ اس تاویل میں عربی لغت اور حقیقت سے بہت بڑا انحراف ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے۔

"وان تظاھرا علیہ فان اللہ مولٰہ وجبریل وصالح المؤمنین" (التحریم (۶۶) : ۴)

شیعہ "صالح المؤمنین" سے مراد حضرت علیؓ لیتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی مقامات ہیں، جو حضرت علیؓ کی امامت

Marfat.com

پر انتہائی کمتر درجہ ہیں۔

مملکت میں اختیار اور قیادت کا منبع

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حاکم (یا عمومی لحاظ سے "حکومت") شہریوں پر اختیار اور قیادت کا حق دار اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مملکت کا سربراہ ہوتا ہے۔ یہ سربراہی قیام مملکت کے لیے لازمی شرط ہے، جس سے عوام کے مختلف طبقوں میں رابطہ اور یک جہتی پیدا ہوتی ہے، ملک کے تمام خطوں میں تعلق پیدا ہوتا ہے اور نظام حکومت ایک مرکز پر چلتا ہے۔ اسی لیے حکومت کے پاس اختیار ضروری ہے۔

سربراہِ مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مناسب حد تک عوام کی آزادیوں پر پابندیاں عائد کرے ٹیکس لگائے اور مختلف قوانین پر عمل درآمد کرائے۔ اس غرض سے حاکم کو اپنے اختیارات کے استعمال کا حق حاصل ہے تاکہ نظم وضبط پیدا ہو، مملکت کو استقرار ملے، شہریوں کے حقوق محفوظ ہوں اور فتنہ وفساد کا قلع قمع ہو سکے۔

حاکم کے ان اختیارات کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیا محض اپنی شخصیت کے بل بوتے پر اسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، یا حاکم اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے؟

اس کے بارے میں کئی نظریات ہیں مگر ہم دو پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ حاکم کو خدا سے حکومت کا حق ملتا ہے (اس رائے کے حامل افراد کے نزدیک وہ اللہ تعالیٰ کا نائب اور زمین پر اس کا خلیفہ ہے اس لیے اس کے اختیارات کا سرچشمہ خدا ہے۔ ماضی میں یہ نظریہ بہت عام رہا اور قرون وسطیٰ تک رائج تھا۔ بعض اوقات تو حاکم اپنے آپ کو خدا کا نائب نہیں بلکہ خود خدا اور "خدا کی اولاد" سمجھنے لگتا تھا، ورنہ کم سے کم وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ وہ خاندان، خون اور عزت کے لحاظ سے جملہ شہریوں سے ممتاز ہے۔

اس نظریے کے نتیجے میں کئی ایسے حاکم پیدا ہوتے جو آمر تھے یا مطلق العنان حکمران تھے، اور عوام کو ان پر تنقید یا جرح یا حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کا کوئی حق نہیں تھا۔ حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں، جس نے انہیں لوگوں پر حکومت کرنے کا حق تفویض کیا ہے اور اُن کی جان و مال پر تصرف عطا کیا ہے۔

Marfat.com

اس نظریے کے حامی استبدادی نظامِ حکومت کی تائید کرتے ہیں، اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ خود اپنے لیے ظلم پسند کرتا ہے، نہ اپنے بندوں میں سے کسی کو اس کی اجازت دیتا ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ حاکم، امت کے دوسرے افراد کی طرح ایک فرد ہے، اور جو بھاری ذمہ داری وہ اٹھاتا ہے وہی اُسے عام لوگوں سے منفرد بناتی ہیں۔ ان کی رائے میں امت کا ارادہ ہی اختیارات کا سرچشمہ ہے، اور یہ ارادہ قانون کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ امت ہی حکام کے اعمال پر نظر رکھتی ہے اور وہی انہیں اقتدار، سربراہی اور حکومت کرنے کا حق دیتی ہے۔ یہ نظریہ فرانسیسی مفکر "روسو" کے "معاہدۂ عمرانی" میں پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ نظریہ بھی استبداد اور مطلق العنانی کا راستہ نہ روک سکا، بلکہ بعض اوقات تو حکمران، اقتدار پر پوری طرح قابض ہو گئے اور یہ دلیل دی کہ وہ عوام کے ارادے کے مظہر ہیں، اور عوام کی رائے بہرحال مقدس ہے!

اس مسئلے پر اسلامی نظام کیا مؤقف رکھتا ہے؟

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام بلحاظ روح و نص، "تفویض الٰہی" کے نظریے کو قبول نہیں کرتا، بلکہ اسے اختیار پر قبضے اور حکومت میں مطلق العنانی کا زینہ سمجھتا ہے جو لوگ یہ بحثتے ہیں کہ حاکم، زمین پر خدا کا خلیفہ ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام رُوئے زمین کے تمام انسانوں کو اللہ کا خلیفہ سمجھتا ہے، جو اپنی عقل اور ہدایت قبول کرنے کی استعداد کے اعتبار سے، اشرف المخلوقات ہیں اس لیے کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ باقی تمام انسانوں کو چھوڑ کر تنہا "خلیفۃ اللہ" قرار پائے۔ یہ کہنا کہ حاکم خدا کی مرضی سے اختیارات کا مالک بنتا ہے تو اس صحیح بات سے غلط مطلب اخذ کیا جاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کی ہر چیز، اللہ ہی کے ارادے اور قدرت سے انجام پذیر ہوتی ہے، اور صرف حاکم ہی اختیار کے استعمال کے معاملات میں منفرد نہیں۔ کسی کو یہ سزاوار نہیں کہ وہ یہ دعوے کرے کہ اُسے خدا یا انبیاء کی جانب سے حکومت کرنے کا اختیار ملا ہوا ہے۔

مسلمان علماء میں سے بعض اس نظریے کے حامی ہیں اور وہ حضرت عثمانؓ کے اس قول سے حجت لاتے ہیں کہ "میں اس لباس کو کس طرح اتار دوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنایا ہے۔"

حضرت عثمانؓ کے اس قول کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات اور واقعات پیشِ نظر

Marfat.com

جن میں انہیں ایسا کہنا پڑا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان رض کے عہد خلافت کے اواخر میں مسلمانوں میں فتنہ پھوٹ پڑا تھا، اور بعض شر پسندوں اور فتنہ پروروں نے چاہا کہ وہ سادہ لوح لوگوں کا استحصال کر کے خوں ریزی برپا کریں۔ ان سازشیوں کا سرغنہ عبداللہ بن سبا (یہودی) تھا جس نے عوام اور سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کیا۔ انہوں نے چکنی چپڑی باتوں سے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھایا اور ان افواہوں کو اسلام کے دشمنوں نے بڑھا چڑھا کر پھیلایا۔ انہوں نے مدینے کا محاصرہ کر لیا اور حضرت عثمان رض کو مطلع کیا کہ یا تو وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

قدرتی طور پر حضرت عثمان رض نے اس کے خلاف سخت مؤقف اختیار کیا کہ وہ خود خلافت سے کس طرح دستبردار ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں مطالبہ کرنے والوں میں کوئی بڑے سے بڑے صحابی یا اصحاب رائے و مشورہ نظر نہ آئے۔ اگر ہر شرعی حاکم (یعنی جو جائز طور پر اقتدار میں آیا ہو) سازشیوں، باغیوں اور اطاعت شکنوں کے مطالبات ماننے لگے، جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہوں تو حکومت کو قرار حاصل ہو گا نہ نظام حکومت میں انصاف کا عمل دخل ہو گا۔ ہماری رائے میں اگر عثمان رض مطالبہ کرنے والوں میں صحابہ یا اہل رائے و مشورہ کو پاتے تو دوسرا مؤقف اختیار کرتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بخوشی خلافت سے دستبردار ہو جاتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ کبھی غلط مشورہ نہیں دیں گے۔

ہمارے اس مؤقف کی تائید میں کہ حاکم اعلیٰ کا اختیار شخصی نہیں اس کے لیے مناسب ہے کہ مطلق العنان بن جائے، رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رض کے کئی اشارے اور مواقف ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی حاکم کا اختیار رسول ﷺ اور خلفائے راشدین رض سے بالاتر نہیں۔ روایت ہے کہ کوئی شخص رسول کریم ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ کے رعب سے گھبرا گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ آپ نے فرمایا: "ڈرو نہیں، میں بادشاہ ہوں نہ جابر حکمران۔"

حضرت عمر رض کے بارے میں لوگوں کو احساس تھا کہ وہ سخت مزاج اور حق کے اظہار میں صاف گو ہیں، لیکن عمر رض ان سے کہتے: "خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ میں تمہیں غلام بناؤں اور تم پر جبر حکومت کروں۔ میں تو تم جیسا اور تمہی میں سے ہوں۔ میرا مقام وہ ہے جو کسی یتیم کے ولی کا اس کے مال کے معاملے سے ہوتا ہے۔" یعنی وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ وہ مسلمانوں میں سے ایک فرد ہیں، اور ان کے معاملات کی نگرانی اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح کسی یتیم کا ولی حسن و خوبی و نیکی سے یتیم کی مصلحت کا خیال رکھتا ہے۔ حضرت عمر رض نے اپنے ایک والی سے کہا: "اے ابو موسیٰ! میں اور تم لوگوں ہی میں سے

ہیں، سوائے اس کے اللہ تعالیٰ نے ہمارا بوجھ بھاری کر دیا ہے۔" کسی شاعر نے اس معنی میں ان کی مدح کی، جسے حضرت عمرؓ نے قبول کیا اور اگر وہ اس کے اشعار میں خلاف طبع کوئی بات پاتے تو ضرور اسے ڈانٹتے۔

أنت الامام الذی من بعد صاحبه

ألقی إلیک مقالید النُّهیٰ البشر

(تو ہی وہ امام ہے جسے، اس کے رفیق کے بعد، لوگوں نے اپنی عقل کی کنجیاں سونپ دی ہیں)

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُمت یا عوام اختیار کا منبع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات نظام اسلامی پر منطبق نہیں ہوتی کیونکہ عوام کو اختیارات کا منبع تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری کی ساری قانون سازی عوام یا اُن کے نمائندے کریں۔ اسلام نے امت کی سربراہی اور سیادت تسلیم نہیں اُسے اہلِ خلافت یا حامل خلافت کہا ہے جس طرح خلیفہ اپنے اختیارات میں شریعت کا پابند ہے اور وہ نہ تو زمین پر خدا کا سایہ ہے نہ اُسے کوئی "خداوندی حق" حاصل ہے، اس طرح حاکم اعلیٰ خدا اور اس کے رسولؐ کی شریعت کے مطابق، امت کے امورِ دین اور ان کے دوسرے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے گویا "وکیل" یا ایجنٹ ہے اور امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حاکم اعلیٰ کو نیک مشورہ دے، اس کی رہنمائی کرے اور اگر وہ غلط چلے تو تنبیہ کرے بلکہ اگر وہ دین سے انحراف کرے تو اُسے معزول کرنے کا حق بھی ہے۔ وکالت کا یہ "معاہدہ" اس بیعت سے واضح ہوتا ہے جو امت اپنے مسلمان حاکم کے ہاتھ پر کرتی ہے۔

فقہاء کی کثیر تعداد اور مسلمانوں میں سے علم سیاست کے پرانے اور نئے ماہرین یہی رائے رکھتے ہیں اس سے یہ استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمین کو عام معاملات میں من حیث الجماعۃ خطاب کرتا ہے نہ کہ کسی فردِ واحد کو،

مثلاً قرآنِ مجید میں آیا ہے:

"یا ایها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط...... فلا تتبعوا الهویٰ أن تعدلوا"۔ (النساء: ۱۳۵)

اور مزید فرمایا:

"یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود"۔ (المائدہ: ۱)

اور یہ بھی کہا:

"وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ: ۲)

پوری کی پوری امتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ حدود اللہ کی پاسداری کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکام کی پیروی کرے۔ اُسے حاکمِ اعلیٰ کے انتخاب اور حکام پر نظر رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا قول بھی اسی معنی میں ہے کہ: "میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہو، تو وہ قبول ہوئی۔" اس کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ جب امت کسی رائے پر متفق ہو جائے تو وہی حق ہوتا ہے اور اس پر عمل درآمد واجب ہو جاتا ہے کیونکہ اس رائے کا استعمال انسان نے صاحبِ خلافت اور حاملِ خلافت کی حیثیت سے کیا ہے۔

اس حیثیت سے اُمت اپنے حقوق کا استعمال اپنے نامزد نمائندوں کی وساطت سے کرتی ہے، جن کو قرآن مجید "اولوالامر" کہتا ہے۔ فقہا اور علما ان کی صفات اور تعداد کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں، لیکن بالعموم ان کا کہنا یہ ہے کہ ان میں بھی وہی صفات ہونی چاہئیں جو مسلمان حاکم کے لیے ضروری ہیں (سوائے شرطِ نسب کے، اور وہ بھی جو امام کے لیے ضروری سمجھتے ہیں)

ماوردی کی رائے میں اہم صفات یہ ہیں: انصاف پروری، علم، صائب الرائے ہونا، اور دانائی، کون لوگ "اولوالامر" ہونے کے مستحق ہیں تو بعض علما، ان میں صرف امرا اور اعلیٰ سول و فوجی حکام کو شمار کرتے ہیں، بعض دیگر علما، ان میں امراء اور حکام کے علاوہ علماء، فوجی افسر اور وہ تمام افسر اور حکام شامل کرتے ہیں جن کے پاس لوگ حاجت روائی کے لیے جاتے ہوں یا عام معاملات کی تکمیل کے لیے۔

رئیسِ مملکت کے حقوق و فرائض

اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق، حاکمِ اوّل اُمت کے افراد میں سے ایک فرد ہے۔ اس میں اور دوسرے افراد میں صرف یہ فرق ہے کہ اس پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری بھی سب سے بڑی ہے۔ اُس کو کوئی ایسی خصوصی اہمیت حاصل نہیں کہ وہ مشورے اور ہدایات سے بے نیاز ہو یا فرائض کی ادائیگی اُسے معاف ہو۔ اُمتِ مسلمہ میں اُسے ایسا کوئی "تقدس" بھی حاصل نہیں جیسا کہ بعض حکام دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ تو محض امت کا نمائندہ اور کارندہ ہے، جسے مملکت کے امور کو چلانے اور عوام کے

Marfat.com

مفادات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی ہے[11]

رئیس اعلیٰ خدا کا خلیفہ بھی نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ وہ تو محض "خلیفۂ رسول اللہ" ہے۔ قرآن کے نزدیک تو انسان، بحیثیت انسان، خدا کا خلیفہ ہے۔ اسلام خلیفہ یا "رئیس اول" کو "عصمتِ مطلقہ" (کامل بریت) عطا نہیں کرتا کیونکہ وہ صرف خدائے واحد کی صفت ہے۔

اُس کی اطاعت بھی اسی حد تک کی جاسکتی ہے کہ اس کے اعمال و احکام کس حد تک اسلام کے صحیح اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس راستے سے ہٹ جائے اور کجروی اختیار کرے تو لوگوں کا حق ہے کہ اُسے تنبیہ کریں کیونکہ امت کو اُسے سیدھا کرنے، تنبیہ کرنے اور اس کے اعمال پر نظر رکھنے کا حق حاصل ہے کیونکہ اُمت ہی نے اُسے وہ مقام عطا کیا ہے اور کسی جبر و اکراہ کے بغیر، نیک نیتی سے بیعت کر کے اُسے اپنے امور سونپے ہیں۔ نبی کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگی میں حاکم اعلیٰ اور اُمت کے درمیان کامل مساوات دیکھنے میں آتی تھی اور وہ اس اعلیٰ اصول کی سختی سے پیروی کرتے تھے۔

ابن اثیر نے اپنی کتاب "الکامل" میں روایت کی ہے کہ حضورؐ مرض الموت میں فضل بن عباسؓ اور علی بن ابی طالبؓ کا سہارا لیے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور منبر پہ آ کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"اے لوگو! اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر (ظلم کیا) کوڑے لگائے ہوں، تو یہ میری پیٹھ حاضر ہے، وہ اپنا بدلہ لے لے۔ جس کسی کی عزت پر میں نے (غلطی سے حملہ کیا ہو وہ بھی مجھ سے بدلہ لے لے۔ اگر کسی کا مجھ پر قرض ہو تو وہ بھی مجھ سے وصول کر لے۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں تم سے ناراض ہوں گا، کیونکہ یہ میرا رتبہ نہیں۔ میرے نزدیک تم سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو مجھ سے اپنا حق لے لے، اگر کوئی نکلتا ہو یا مجھے معاف کر دے تاکہ جب میں اپنے رب سے ملوں تو پاک اور صاف ہوں۔"

خلفائے راشدین کا طرز عمل بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آپ کو کئی بار بدلہ لینے کے لیے پیش کیا۔ جب اُن سے اُس کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا:

"میں نے رسول اللہ کو یہی کرتے دیکھا ہے اور ابوبکرؓ کو بھی۔ میں انہیں کی پیروی کر رہا ہوں۔"

مسلمان حاکم ہمیشہ یہ ذہن نشین رکھتے تھے کہ اسلام اس میں اور محکوموں میں فرق نہیں کرتا، حتیٰ کہ عقوبت اور قصاص میں بھی سب برابر ہیں۔

Marfat.com

اسلام نے اس پر لازم کر دیا ہے کہ وہ امت کی حسب منشا، اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے، اپنے فرائض کمال تندہی اور دیانتداری سے ادا کرے۔ اسی طرح اُمت پر بھی اسلام نے کچھ فرائض ادا کیے ہیں۔ حاکم کے فرائض، اُمت کے حقوق ہیں اور اُمت کے فرائض حاکم کے حقوق ہیں۔ یہ ایک ہی کے دو رُخ ہیں:

حاکم کے فرائض

حاکم کے فرائض پر سیاسیات کے علماء نے مختصر اور طویل دونوں طرح سے بحث کی ہے الماوردی نے دس فرائض گنوائے ہیں جو حاکم کے لیے ادا کرنا لازم ہیں: اور علماء کی اکثریت نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

۱ قاضی ابو یعلیٰ ان فرائض کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"امام پر، اُمت کے معاملات میں دس باتیں فرض ہیں:

۱۔ اُن اصولوں پر دین کی حفاظت جن پر سلف اُمت کا اجماع ہے۔ اگر وہ کجروی اختیار کرے، اور اُس پر ذات پر شبہ ہو جائے تو اس پر حجت قائم ہو جائے گی اور اُسے صحیح راستہ دکھانا لازم ہو گا اور حقوق و حدود دینا ہوں گی تاکہ دین خلل سے اور اُمت لغزش سے بچ جائے۔

۲۔ متنازع فریقوں کے درمیان احکام کا نفاذ اور جھگڑے کا خاتمہ تاکہ انصاف قائم ہو اور کوئی ظالم حد سے نہ بڑھے اور کوئی مظلوم اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھے۔

۳۔ ملک و سلطنت کی سرحدوں اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت، تاکہ لوگ اطمینان سے اپنے کاروبار کر سکیں۔ اور ان کے سفر محفوظ ہوں۔

۴۔ شرعی حدود کا نفاذ، تاکہ اللہ تعالیٰ کی حرمات کی خلاف ورزی نہ ہو، اور لوگوں کے حقوق ضائع اور تباہ ہونے سے محفوظ رہیں۔

۵۔ پوری قوت اور طاقت سے سرحدوں کی حفاظت، تاکہ دشمن کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو اور کسی مسلمان یا معاہد کی عزت اور جان یا مال نہ ہو۔

۶۔ اسلام کے دشمنوں کو دعوت دینے کے بعد جہاد تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں یا اہل ذمہ بن جائیں۔

۷۔ کسی جبر کے بغیر ان ٹیکسوں کا نفاذ، جس کی نص نے وضاحت کی ہے اور انہیں فرض قرار

Marfat.com

دیا ہے۔

۸۔ بیت المال سے (فضول خرچی کے بغیر) مستحقین کی مدد، جس میں کسی سے زیادتی ہو نہ کسی کے حق میں کمی آئے، اور کسی پس و پیش اور وقت کے زیاں کے بغیر جاری ہو۔

۹۔ عاملین حکومت اور مشیروں کی جانچ پڑتال اور محاسبہ، تاکہ وہ اپنے کام میں غفلت نہ کریں۔ اور لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں۔

۱۰۔ وہ بذاتِ خود، امور و احوال کا جائزہ لیتا رہے تاکہ اُمت کے مفادات کی نگرانی میں کوتاہی نہ ہو اور ملت کی حفاظت ہو سکے اور عیش و عشرت یا کثرتِ عبادت میں مشغول ہو کر اپنے فرائض سے غافل نہ ہو کیونکہ بعض اوقات دیانتدار لوگ خیانت کرتے ہیں اور قابلِ اعتماد افراد دھوکہ دے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں پر زمین پر خلیفہ بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو۔" (ص (۳۸) : ۲۶)

اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کو ذاتی طور پر فرائض سونپے ہیں اور اُسے جواب دہ بنایا ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک راعی (چرواہا) ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔" ابو یعلیٰ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا ہے:

"جب امام، اُمت کے حقوق کا خیال رکھے تو اُمت پر بھی دو فرض عائد ہوتے ہیں۔ اطاعت، اور تعاون، جب تک امام سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہ ہو جو اُسے امامت سے خارج کر دے۔"

موجودہ دور کے حالات کے مطابق، حاکم کے فرائض یوں ہوں گے:

۱۔ ایسے مسلم معاشرے کا قیام جو اسلام کے مطابق زندگی گزارے اور اپنے تمام معاملات، مسائل اور اداروں یا نظاموں میں اسلام ہی کی پیروی کرے، خواہ وہ معاملات فکر و عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں یا مالی و اقتصادی، اخلاقی و قانونی مسائل ہوں۔

۲۔ ہر اسلام دشمن سے وطن کی حفاظت اور ہر سازش کی، جو اس کی سرزمین کو لپیٹ میں لے بیخ کنی۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ ہر ممکن وسائل سے سازشوں کا قلع قمع کرے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس مقصد کے لیے اُس سے جو قربانی طلب کی جائے اُسے پیش کرنے میں دریغ نہ کرے۔

۳۔ اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لیے کوشش تاکہ امت کے دلوں میں اس کے اصول راسخ

Marfat.com

ہو جائیں اور اقطار عالم میں تمام انسانوں پر اسلام کی فضیلت واضح ہو۔ امت مسلمہ عقیدے رسالت کی امت ہے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اسلام کی تبلیغ اس دور کے حکام کے فرائض سے متعارض ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی تقریباً ہر حکومت، مختلف ذرائع ابلاغ سے اپنے عقائد کو نشر کرتی رہتی ہے، حتیٰ کہ روس اور دوسری اشتراکی حکومتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور اپنے عقیدے کی اشاعت پر بے بہا خرچ کرتی ہیں۔ یہی حال امریکہ وغیرہ کا ہے (اور بھارت جو اپنے آپ کو "لادینی" ملک کہتا ہے، ہندومت کی تبلیغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا) پھر اسلامی مملکتیں اس فریضے کی ادائیگی سے کیوں شرمائیں اور کیوں جھجکیں۔

۴۔ امت میں عدل و انصاف کا قیام، مظلومین کی دادرسی، ظلم و تعدی کے خلاف قانون کا نفاذ، اور کمزور عوام کو دوسروں کے جبر اور بندگی اور حیلہ گری سے آزادی دلانے کی کوشش کسی بھی حاکم کے لیے اپنی مملکت کی حدود میں اور امت اور شہریوں کے لیے انصاف کا قیام سب سے بڑا فرض ہے اور مملکت کی حدود سے باہر مظلوم اقوام کی مدد و نصرت بھی حاکم کا اہم فریضہ ہے کیونکہ اسلام کسی بھی انسان پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اسی لیے مبعوث کیا کہ سب انسانوں کو انصاف ملے اور خاتم الانبیاء کو اس لیے بھیجا کہ لوگوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی سے نجات دلا کر صرف اللہ کی بندگی کا سبق دیں، اور دنیا جن پر تنگ ہو گئی ہو انہیں فراخی اور کشادگی اور کئی مذاہب و ادیان کی بجائے صرف اسلام کی انصاف پروری کی چھاؤں فراہم کریں۔

حاکم اعلیٰ کے حقوق

جب حاکم اپنے مفوضہ فرائض کو پورا کرے اور حکومت کی امانت کا حق ادا کرے، مسلمانوں کے لیے مخلص ہو اور ان میں عدل و مساوات قائم کرے تو عوام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ حاکم کے حقوق کی پاسداری کریں۔ الماوردی اور دوسرے علمائے سیاست نے امت کے دو فرض بیان کیے ہیں:

۱۔ ایسے کاموں اور احکام میں اطاعت، جن میں معصیت نہ ہو۔

۲۔ حاکم کی مدد و نصرت، پشت پناہی اور اخلاص۔

Marfat.com

اطاعت

جب حکومت عدل و شوریٰ پر قائم ہو، تو عوام کے لیے لازم ہے کہ وہ حاکم اعلیٰ کی اطاعت کریں، اس کے احکام بجالائیں اور اس سے سرکشی نہ کریں۔ جب تک حاکم اسلام کے اصولوں کی پیروی کرتا ہے اور شریعت کی پابندی کرے تو مسلمان شہریوں کے لیے اس کی اطاعت دینی فریضہ بن جاتی ہے۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ حاکم اعلیٰ اور امت کے حقوق پورے کر رہا ہو، پھر بھی اس کی بات نہ مانی جائے، نہ اس کی اطاعت کی جائے۔

قرآن مجید نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے:

"اے ایمان والو، اللہ کی، اس کے رسولؐ اور اپنے میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو" (النساء ۴:۵۹)

حاکم اعلیٰ، ان اولوالامر میں سے ہے جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کی ہے۔ احادیث رسول اللہؐ بھی اس پر زور دیتی ہیں، مثلاً صحیح مسلم میں آتا ہے:

"تم پر ہر حال میں، تنگی ہو یا آسانی، پسند ہو یا نہ پسند، یا تمہاری خودغرضی شامل ہو (حاکم کی بات) سننا اور اُسے ماننا لازم ہے۔"

متفق علیہ احادیث میں نبی کریمؐ کا قول ہے:

"ہر مسلمان پر سننا اور اس کی کرنا فرض ہے، خواہ اُسے پسند ہو یا ناپسند، جب تک اُسے مجبور نہ کر دیا جائے، لیکن اگر اُسے معصیت کا حکم دیا جائے تو اُس پر سننا اور اطاعت کرنا لازم نہیں۔"

گویا اطاعت حتمی فریضہ ہے اور صرف ایک بات اس فرض کی ادائیگی کو معاف کرتی ہے کہ حاکم واضح طور پر شریعت کے احکام سے انحراف کرے اور اسلام کے اصولوں سے بغاوت کرے، کیونکہ خدا کی نافرمانی میں مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بنتے ہی فرمایا:

"اے لوگو! میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر تم مجھے حق پر پاؤ تو میری مدد کرو اور اگر باطل پر پاؤ تو مجھے روک دو۔ جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔"

Marfat.com

اگر کسی حاکم سے معمولی غلطی سرزد ہو جائے یا اس کا اجتہاد صحیح ثابت نہ ہو تو اس سے بغاوت درست نہیں کیونکہ وحدتِ اُمت سب سے اعلیٰ اور اہم ہے۔ رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ:

"حالات میں کئی تبدیلیاں آئیں گی، اگر کوئی شخص اس امت میں تفرقہ ڈالے حالانکہ وہ جماعت ہو تو جس کے بس میں ہو اس کی گردن مار دے۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"جو شخص بغاوت کر کے میری امت میں تفرقہ ڈالے اس کی گردن مار دو۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"جو شخص تمہارے پاس آئے اور کسی ایسے شخص کی اطاعت پر سب کو مجبور کرے جو تمہاری جمعیت کو پارہ پارہ کر دے یا جماعت میں تفرقہ ڈالے تو اُسے قتل کر دو۔"

اب سوال یہ ہے کہ اگر حاکم سے ایسی خطا سرزد نہ ہو جو امت کو بغاوت کا جواز فراہم کرے تو کیا کرنا چاہیئے؟ اسلام نے خطا کی تصحیح اور انحراف سے بچنے کا طریقہ بنایا کہ حکومت کو شوریٰ کے تابع کر دیا۔ سبے اہل رائے کا فرض ہے کہ وہ بحث و تمحیص کے بعد حاکم اعلیٰ کو خلوص سے مشورہ دیں۔ اس کے لیے پہلے وہ خط و کتابت اور بات چیت سے، نرمی کے ساتھ، غلطی کی نشاندہی کریں، اور پھر واضح انحراف پر احتجاج کریں۔ اگر اس سے کام نہ چلے تو بڑی گمراہی اور کجروی کو اعلانِ حق کے ساتھ مسترد کر دیں، خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ:

"سب سے عمدہ جہاد جابر و ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"جو تم میں سے کسی بُرائی کو دیکھے تو ہاتھ سے اُسے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو زبان سے ہٹائے اور اگر یہ مقدور بھی نہ ہو تو دل میں اُسے بُرا سمجھے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔"

اطاعت کا عہد توڑنے اور حاکم اعلیٰ کے خلاف بغاوت کرنے کے بارے میں ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

علامہ محمد اسد نے اپنی کتاب "منہاج الاسلام فی الحکم" میں، جو اس موضوع پر آیات و احادیث کا مجموعہ ہے، چار باتیں پیش کی ہیں:

۱۔ جو حکمران مملکت میں شرعی حکومت کا نمائندہ ہو، وہ تمام شہریوں سے اطاعت کا حقدار ہے قطع نظر اس بات سے کہ ان میں سے کوئی فریق یا فرد اُسے پسند نہ کرتا ہو یا حکومت چلانے کی

Marfat.com

سیاست سے اختلاف رکھتا ہو۔

ب۔ اگر حکومت ایسے قوانین یا احکام جاری کرے جن سے شریعت کی صریح معصیت واقع ہوتی ہو، تو شہریوں پر ان قوانین و احکام کا ماننا اور ان پر عمل کرنا واجب نہیں۔

ج۔ جب حکومت کوئی ایسا مؤقف اختیار کرے جو صریحاً نصِ قرآنی سے متعارض ہو، اور اگر یہ مؤقف واضح طور پر کفر کا اظہار کرتا ہو تو لازم ہے کہ اختیار اس سے چھین لیا جائے اور ایسی حکومت کو ہٹا دیا جائے۔

د۔ جب اختیار ایسی حکومت سے چھینا جائے تو یہ لازم ہے کہ عوام کی اقلیت کی طرف سے مسلح انقلاب نہ لایا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے کا استعمال منع فرمایا ہے اور کہا ہے:

"جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے نہیں۔"

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"جو ہم پر تلوار سونت لے وہ ہم میں سے نہیں۔"

۲۔ حاکم کی مدد و نصرت

اگر حاکم اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کر رہا ہو، رعیت میں عدل و انصاف قائم ہو، شوریٰ پر عمل ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ضمانت ہو اور جملہ مبادیٔ اسلام نافذ ہوں تو امت پر فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے، اُس سے تعاون کرے۔ اور اس کی پشت پناہ ہو، بالخصوص اس وقت جب کوئی شخص حکومت کے خلاف بغاوت کر دے، اطاعت سے منحرف ہو اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہو جس سے دولتِ اسلامیہ کی تباہی و بربادی کا امکان ہو۔ اسلام کے نزدیک جو کسی وجہ کے بغیر اطاعت سے انحراف کرے، مفسدہ پرداز ہے اور خدا، رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ حاکم کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسے شخص کو راہِ راست پر لائے اور امت پر بھی فرض ہے کہ ایسے کام میں حاکم کی مدد کرے۔

جب حاکم اور عوام کے درمیان مضبوط رشتہ پیدا ہو جائے، اور ان میں کامل ہم آہنگی ہو، حکومت میں مشورہ اور ہدایت کو اہمیت حاصل ہو کہ اللہ کا قانون نافذ ہو جائے اور لوگوں میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو، تو اسلام نے عوام پر فرض کیا ہے کہ اگر وہ اجتہاد میں غلطی کرے تو اُسے صحیح مشورہ دیں یا اسلام کے اصولوں کی مخالفت کا اظہار ہو تو اس کی اصلاح کر دیں۔ انسان کا مرتبہ اور قدر و قیمت کیسی ہی

Marfat.com

کیوں نہ ہو، اس کا علم کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو اور اُسے معاملات سے نمٹنے کا کتنا ہی سلیقہ کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی غلطی اور لغزش کا امکان ضرور رہے، عیب کی بات یہ نہیں کہ انسان غلطی کرے، عیب کی بات یہ ہے کہ تنبیہ اور توجیہ کے بعد بھی غلطی کا اعادہ کرے۔ اسلام نے اسی لیے غور و فکر اور جرح و تنقید کی آزادی پر زور دیا ہے کہ مسلمان اس اہم فریضے سے غافل نہ ہوں، یعنی حکمرانوں کے لیے صحیح مشورہ اور تنبیہ۔ اگر مسلمان اس فرض کو کما حقہٗ ادا کرتے رہیں تو حکومت پائیدار ہوگی اور مملکت مضبوط، ہر انسان کو اپنے بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہوگا اور اُسے اپنے فرائض سے بھی آگاہی ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے کہ: "دین، نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے"۔ آپؐ سے سوال کیا گیا کہ: "خیر خواہی کس کے لیے؟" آپؐ نے فرمایا: "اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کے لیے"۔

خیر خواہی سے مراد یہ نہیں کہ ہر گناہِ صغیرہ یا چھوٹی چھوٹی غلطی پر حاکم کے خلاف بغاوت کر دی جائے۔ اسلام اس قسم کے سخت قدم کی اجازت صرف اس صورت میں دیتا ہے جب مسلمان حکمران کو راہِ راست پر لانے اور غلطی کی اصلاح کے تمام ذرائع مسدود ہو چکے ہوں، اور امر بالمنکر اور نہی عن المعروف انتہا کو پہنچ چکی ہو، کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔"

اور یہ اسی وقت مناسب ہے جب نرمی اور حسنِ سلوک سے اصلاح ممکن نہ رہی ہو۔

ہماری تاریخ میں ایسے جرأت آمیز واقعات کی کمی نہیں جب مسلمانوں اور علمائے باعمل نے کسی حکمران کو اُس راہ سے بھٹکتے ہوئے دیکھا جو اسلام نے بتایا ہے تو اُسے واضح طور پر تنبیہ کی اور اس کے سامنے حق بات کہنے سے قطعاً دریغ نہ کیا۔

حاکمِ اعلیٰ کے عہدے کی مُدت

قدیم و جدید نظام ہائے سیاست، حاکمِ اعلیٰ کے عہدے کی مدت کے بارے میں دو رائیں رکھتے ہیں: اوّل وہ جو اُسے ایک مقررہ مدت کے لیے منتخب کرنے کے حق میں ہیں (خواہ وہ مدت قلیل ہو یا طویل) اور دوسرے وہ ہیں جو حاکمِ اعلیٰ کو اس کی زندگی تک کے لیے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اسلامی نظام کا تعلق ہے تو قرآن و سنت میں اس کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اس کا اختیار مسلمانوں کو سونپ دیا گیا ہے کہ وہ حالات و ضروریات، ماحول، معاشرے کی پسند اور امورِ عامہ

Marfat.com

سے اس کی دل چسپی کے مطابق فیصلہ کریں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابتدائے خلافت سے سلطنت عثمانیہ کی انتہا تک دوسری رائے یعنی مدت العمر کے لیے انتخاب یا تقرری کو اپنایا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی نظام میں کسی گڑبڑ کے بغیر حاکم کو ہٹانے کا کوئی طریقہ ہے؟ کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ظالم حاکم کا ظلم برداشت کرتے چلے جائیں۔ یا وہ دیوانہ ہو تو اس کی دیوانگی پر کچھ نہ کریں؟ کیا حکمران کے لیے بھی پابندی ہے کہ وہ حکمرانی سے خود ہی دامن چھڑانا چاہتا ہو تو ہٹ نہ سکے؟ اس سلسلے میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا حاکم اعلیٰ خود اپنے عہدے سے ہٹ سکتا ہے یا مستعفی ہو سکتا ہے؟

۲۔ کیا امت کو اجازت ہے کہ وہ کسی حکمران کو ہٹا دے یا معزول کر دے؟

۳۔ اگر ایسا ہو تو امت کو کن حالات میں اس کی اجازت ہوگی؟

جہاں تک حکمران کے خود مستعفی ہونے کا تعلق ہے تو علم سیاست کے ماہرین اس کے بارے میں بھی دو رائیں رکھتے ہیں: بعض حاکم اعلیٰ کو اس کی اجازت دیتے ہیں اور بعض دوسرے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دونوں فریق تاریخ اسلامی سے سند لاتے ہیں۔

جو لوگ حکمران کو مستعفی ہونے کی اجازت دیتے ہیں وہ حسن بن علی رضؓ کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے معاویہؓ بن ابوسفیان کے حق میں خلافت چھوڑ دی تھی۔ حضرت حسنؓ نے بڑی دانائی سے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ ان کے ارد گرد جتنے امراء اور سرداران لشکر تھے، ان کی مدد کرنے سے قاصر تھے اور ان کی اطاعت نہ تھی جس پر وہ بھروسہ کر سکتے۔ وہ سب لوگ متردد رائیں بنانے والے تھے، عمل کے لحاظ سے کورے تھے۔ پھر انہوں نے معاویہؓ کے دربار پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے اہالی موالی، سختی و نرمی میں ان پر جان فدا کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ معاویہؓ کے کسی حکم سے روگردانی نہ کرتے اور جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر بحث نہ کرتے۔ حسنؓ کے اردگرد لوگ گروہوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جبکہ معاویہؓ کے ماتحت یک جان تھے۔ جب معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا کہ مسلمانوں کی خوں ریزی سے بچنے اور ان کی گم شدہ جمعیت و وحدت کو واپس لانے کے لیے حسنؓ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو انہوں نے مان لیا اور ۴۱ھ میں خلافت سے الگ ہو گئے۔ اس سال کو تاریخ اسلامی میں "عام الجماعۃ" (جمعیت کا سال) کہا جاتا ہے۔

جو لوگ حکمران کے دستبردار ہونے کے خلاف ہیں وہ حضرت رضؓ کے موقف کو پیش کرتے ہیں کہ جب

Marfat.com

ان سے مدینہ پر قابض لشکریوں نے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم اس حادثے کے اسباب بیان کرتے ہوئے پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا کہ سازشی اور غارت گر افراد شرعی حکومت کو ختم کرنے کے عادی نہ ہو جائیں۔ اس لیے اس حادثۂ فاجعہ کو ان لوگوں کی رائے کے لیے حجت نہیں مانا جا سکتا۔

ہماری رائے میں حاکم اعلیٰ کوئی بھی سیاسی موقف اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ اگر وہ محسوس کرے کہ وہ حکومت کا بوجھ اٹھانے پر قادر نہیں تو اُسے حکومت کرتے رہنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مصلحت یہی ہے کہ ہم اُسے مجبور نہ کریں کیونکہ جو انسان اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہو وہ کسی خاص سبب ہی سے یہ موقف اختیار کرے گا۔

مسلمان علماء نے غیر صالح حکمران کو معزول کرنے کے بارے میں بھی بحث کی ہے، اور کہا ہے کہ بعض حالات میں اُسے معزول کرنا جائز ہے۔ حاکم اعلیٰ بننے کے لیے چند شرائط ضروری ہیں، اگر حاکم اعلیٰ کسی وقت بھی ان شرائط سے، یا کسی ایک اہم شرط سے انحراف کرے تو اُسے معزول کیا جا سکتا ہے۔

الماوردی اور قاضی ابو یعلی الفراء نے کہا ہے کہ دو باتیں حکمران کی معزولی کو جائز بناتی ہیں: اس کا انصاف مجروح ہو چکا ہو (یعنی وہ انصاف سے عاری ہو) اور اس میں کوئی جسمانی نقص پیدا ہو جائے۔ انصاف سے عاری ہونے یا فسق و فجور میں مبتلا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملاً شہوات میں پڑ جائے یا شریعت کی حرام کی ہوئی باتوں کا عادی ہو جائے یا ان کا حکم دے اور اعتقاداً حق اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کے نظام کی مخالفت کا اظہار کرے۔

جسمانی نقص سے مراد یہ ہے کہ اُس کے حواس و اعضاء میں ایسی خرابی پیدا ہو جائے جو اس کے حکومت کرنے میں حائل ہو، مثلاً وہ دیوانہ ہو جائے یا اس کے حواس کام کرنا چھوڑ دیں۔

جب حکمران معزولی کا مستحق ہو جائے تو اُسے معزول کرنے کے وجوب کے بارے میں بھی مسلمان علماءِ سیاست کی مختلف رائیں ہیں۔ وہ اس بات پر تو متفق ہیں کہ معزولی کے مستحق حکمران کو جب بھی ممکن ہو ہٹا دینا چاہیے مگر ان کے مدنظر یہ بھی ہے کہ وحدتِ اُمت پارہ پارہ نہ ہو اور فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔ اسلام میں بنیادی اصول امام کی اطاعت ہے۔ اختلاف اس بات پر ہے کہ کسی غیر صالح حکمران کے خلاف بغاوت جائز ہے یا نہیں اور اگر حالات کا تقاضا ہو تو اس کے خلاف طاقت کا استعمال یا ہتھیار اٹھانا مناسب ہے؟ یا محض اُسے سمجھانا کافی ہے یا اُسے نرمی سے سیدھے راستے پر ڈالنا چاہیے یا

Marfat.com

اُس کی بُرائیوں اور سختیوں پر صبر کرنا چاہیئے۔

شاید اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نبی کریمؐ سے جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں صبر کی تلقین کی گئی اور حکمرانوں یا اماموں سے اختلاف سے منع فرمایا گیا ہے، سوائے اس کے کہ وہ صریح کفر اختیار کرلیں۔ تاریخ میں البتہ شواہد موجود ہیں کہ بعض مسلمانوں نے اموی خلفاء کے خلاف بغاوت کردی مگر اس وقت بھی بعض دوسرے مسلمانوں نے بغاوت سے روکا اور فتنہ و فساد سے الگ رہے کیونکہ ان کے نزدیک وحدتِ اُمت کا لحاظ ضروری تھا اور کم تر خرابی یا نقصان کو اختیار کیا۔

اسی طرح بعض مسلمان علماء نے، معزولی کے مستحق امام کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیا اور بعض دوسروں نے اس سے منع کیا ہے۔ جن لوگوں نے بغاوت کو جائز نہیں سمجھا انہوں نے اُن احادیثِ رسولؐ پر اعتماد کیا ہے جن میں صبر و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور سوائے کفرِ صریح کی حالت کے بغاوت سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً" ایک حدیث میں آیا ہے :

"جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو قیامت کے دن وہ اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔"

یہ بھی مروی ہے کہ :

"جو اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اُسے اس پر صبر کرنا چاہیئے کیونکہ اگر اُس نے سلطان سے بالشت بھر مخالفت بھی کی اور اسی حالت میں مر گیا تو گویا جاہلیت کی موت مرا۔"

جن لوگوں نے معزولی کے مستحق حاکم کے خلاف بغاوت کو واجب قرار دیا ہے کہ اس کی زیادتیوں پر صبر کو گناہ بتایا ہے تو انہوں نے اُن آیات و احادیث سے من حیث الکل استنباط کیا ہے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کی گئی ہے اور گناہ اور زیادتی پر عدم تعاون کا حکم دیا گیا ہے مثلاً" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

"ولتکن منکم اُمة ...... وینھون عن المنکر" (آل عمران۔ ۳ : ۱۰۴) یا

"وتعاونوا علی البر ...... علی الاثم والعدوان" (المائدہ۔ ۵ : ۲)

ہر مسلمان جانتا ہے کہ کسی مسلمان کا یا ذمی کا مال چھیننا یا بے سبب اُسے مارنا یا اللہ نے جس بات کا حکم نہیں دیا، اُس کا حکم دینا، گناہ اور زیادتی ہے جسے دور کرنا اور اس کے خلاف ڈٹ جانا فریضہ ہے۔

Marfat.com

احادیث میں آیا ہے :

"جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اُسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو اُسے دل سے بُرا جانے مگر یہ کمزور ترین ایمان ہے۔"

یہ بھی وارد ہوا ہے کہ:

"معصیتِ خداوندی میں اطاعت لازم نہیں۔"

یا آپؐ نے فرمایا:

"جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے دین کے دفاع میں مارا گیا وہ شہید ہے، جو کسی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔"

اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

"ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں کئی احادیث صحیحہ ایسی ملتی ہیں جن میں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اور بغاوت سے منع فرمایا گیا ہے ——— اور کچھ ایسی ہیں جس میں ظالم حاکم کا مؤاخذہ کرنے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے کا حکم بھی ہے۔ کیا اسے تناقض سمجھا جائے اور ہم اس بظاہر تعارض سے کیسے نکل سکتے ہیں؟ امام ابن حزم نے واضح کیا ہے کہ ان احادیث میں ناسخ و منسوخ ہیں، یعنی اُن کے نزدیک جن احادیث میں ظلم کو روکنے اور ظالم حاکم کے خلاف بغاوت کرنے کا حکم ہے، وہ پہلی حدیث سے بعد کی ہیں اور اس لیے اُن کی ناسخ ہیں، یعنی صبر کرنے اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانے کی احادیث منسوخ ہیں۔ اس طرح ان احادیث میں کوئی تعارض یا تناقض نہیں رہتا۔

درحقیقت یہی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ رائے امتِ اسلامیہ کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ نے بھی یہی کہا کہ یہ بہترین اُمت ہے کیونکہ نیکی کا حکم دیتی ہے اور بُرائی سے روکتی ہے۔ اسلام، جس کی کتاب کہتی ہے کہ "تمام عزت اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے"، اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ مسلمان ذلت کی زندگی گزاریں یا ظلم کے سامنے گردن جھکا دیں، خواہ یہ ظلم اُن ہی سے اپنے حاکم کریں یا اجنبی حاکم۔

لازم یہ ہے کہ حاکم کو پہلے نصیحت، موعظت اور تنبیہ سے راہِ راست پر لایا جائے، پھر یہ یقین کیا جائے

کہ ظالم حاکم کے خلاف بغاوت سے کوئی بڑا نقصان یا فتنہ برپا نہ ہوگا کیونکہ اہلِ حق کا ساتھ چند لوگ ہی دیتے ہیں۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ پیش آئندہ معرکہ برابر کا نہیں ہوگا اور اس سے مسلمانوں میں بڑی خوں ریزی یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ اُمت کے لیے بغاوت کا فیصلہ اسی وقت صحیح ہوگا جب اُسے ظالم حاکم کے خلاف کامیابی کا پورا یقین ہو، یا گمان غالب ہو کہ وہ اُسے ہٹانے پر قادر ہے۔

بین الاقوامی تعلقات اور شہریوں و غیر ملکیوں کے حقوق

اسلام میں سیاسی تنظیم کی صورت واضح کرنے کے لیے ان دو معاملات پر اظہار خیال بھی ضروری ہے۔ اسلام سے پہلے، بین الاقوامی تعلقات بالعموم مخاصمت اور مخالفت پر مبنی تھے اور ان میں جنگ کا قانون رائج تھا کہ جو جو طاقتور ہو وہ کمزور پر قوت اور غلبہ پالے۔ اسلام نے تمام انسانیت کی فلاح کے لیے قوانین طے کیے جو تمام غیر مہذب قوانین کی جگہ نافذ ہوئے اور اسی سلسلے میں بین الاقوامی تعلقات بھی نئی بنیادوں پر استوار ہوئے۔

اسلام نے جو بنیادی اصول مقرر کیے وہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی دونوں تعلقات کے بارے میں تھے۔ ان میں سے اہم یہ تھے: تکریم انسانیت، انصاف، مساوات، حریت، وفائے عہد، برابر کا معاملہ، درگزر، تعاون اور فتنہ و فساد کی روک تھام۔ اسلام نے امن و صلح کو بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد بنایا، جنگ کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم ...... خطوات الشیطٰن (البقرہ ۲۰۸)

اور فان اعتزلوکم ...... فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا۔ (النساء: ۹۰)

اس سلسلے میں ضروری ہے کہ اس بہتان اور افترا کو دور کیا جائے جو بالعموم دشمنان اسلام، اسلام پر لگاتے ہیں اور جسے بعض کم عقل دہراتے رہتے ہیں، یعنی یہ کہ "اسلام تلوار کے زور پر پھیلا" اور یہ کہ "اسلام سوائے آہن و آتش کے بین الاقوامی تعلقات میں اور کوئی راستہ نہیں سمجھاتا۔"

یہ سب لغو باتیں ہیں۔ اسلام صرف تلوار ہی سے نہیں پھیلا، نہ اس نے دوسروں کے خلاف محض ظلم کی خاطر ہتھیار اٹھائے۔ اسلام میں جنگ کرنے کے اسباب شرع نے بیان کر دیئے ہیں، جو تین سے زیادہ نہیں ہیں۔

Marfat.com

۱۔ مملکت اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف حقیقت میں واقع ہونے والی محاذ آرائی کو روکنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ ..... المعتدین ۞ ...... وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ

...... ان اللہ مع المتقین ۞ (البقرۃ: ۱۹۰، ۱۹۳، ۱۹۴)

اور: واذن للذین یقاتلون ..... علی نصرھم لقدیر (الحج: ۳۹)

اس قسم کی جنگیں تو تمام قوانین اور تمام معاشروں میں جائز ہیں۔

۲۔ مملکت کو متوقع محاذ آرائی اور حملے سے بچانے کے لیے جنگ۔ یہ اس صورت میں جب مسلمانوں کو پورا یقین ہو جائے کہ کوئی دوسرا یا دوسرے ملک مل کر مملکت اسلامی کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ ہاتھ باندھے بیٹھے رہیں اور دشمن انہیں اچک لے۔ ان کے لیے واجب ہے کہ وہ دشمن کا سر اسی کے بل میں کچل دیں۔ جو قوم اپنے ہی ملک میں لڑتی ہے وہ خوار و زبوں ہوتی ہے۔ یہ عمل ہر اس قوم کا ہے جسے اپنے خلاف جنگ کا خطرہ ہوتا ہے۔

۳۔ اُن غیر اسلامی حکومتوں کے مسلمانوں کے عقیدے پر حملے کو روکنے کے لیے جنگ جو ان کے اپنے ہی ملک میں قائم ہو جائیں، اور اسلام کی نشر و اشاعت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ مملکتِ اسلامی، اپنی رعایا، میں سے غیر مسلموں کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے اور عقائد کی پابندی کرنے سے منع نہیں کرتی اسلامی تاریخ میں، ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ غیر مذاہب اپنے مذہب پر کاربند رہنے سے روکا گیا ہو کیونکہ اسلامی معاشرہ اعتقاد اور مذہب کی آزادی کا علمبردار ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو دوسری حکومتوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ مسلمانوں سے برابر کا سلوک کریں اور اُن کے عقیدے، دین اور تبلیغ اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر دوسری حکومتیں ایسا کریں گی تو گویا وہ بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی کریں گی۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ عقیدے پر ہونے والے حملے کو روکیں، خواہ اس کے لیے ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھانے پڑیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دین کو مٹنے سے اور عقیدے کو فنا ہونے سے بچایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دعوت الی اللہ دینے کی آزادی۔ بااخلاص داعیوں کو پوری طرح بہم پہنچائی جائے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے پاس ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے پیغام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے اور لوگوں کو اس کی طرف بلائے اس کی تائید اسلامی تاریخ سے بخوبی ہوتی ہے۔ اگر نبی کریمؐ کے تمام غزوات و سرایا پر نظر ڈالی جائے تو واضح

Marfat.com

ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کسی پر زیادتی نہیں کی بلکہ آپؐ پر زیادتی کی جاتی رہی۔ مثلاً غزوہ بدر کا اصل ہدف جنگ نہ تھا بلکہ بعض مسلمانوں کے ان اموال کو چھڑانا تھا جو قریش نے غصب کر رکھے تھے اتفاق سے وہ قافلہ بچ نکلا جو مال لے کر جا رہا تھا۔ مشرکین کے امکان میں تھا کہ اس نجات پر قناعت کرتے۔ اور جنگ کے لیے نہ ابھارتے۔ مگر انہوں نے ہٹ دھرمی دکھائی، دھوم دھڑلے سے بدر پر پہنچے، خوب شراب پی اور مسلمانوں کو للکارا۔ اس لحاظ سے غزوۂ بدر مسلمانوں پر زبردستی عائد کر دیا گیا۔ جہاں تک غزوۂ اُحد کا تعلق ہے، تو یہ بات واضح ہے کہ اس کا مقصد اس جنگ کو روکنا تھا جو مشرکین نے پھر مسلمانوں کے خلاف شروع کی تھی۔ وہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ باندھ کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور نہ صرف بدر کے مقتولین کا بدلہ لینا چاہتے تھے بلکہ نئی قائم شدہ اسلامی مملکت کو ابتداء ہی میں کچل دینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں نے ان کے حملے کو روکنے کے لیے لشکر کشی کی۔ اسی طرح غزوۂ خندق میں ہوا۔ جہاں تک اُن سرایا کا تعلق ہے جو نبی اکرمؐ نے رومی سلطنت کے خلاف روانہ کیے تو وہ اس لیے تھے کہ غسانی اور رومی جزیرۃ العرب کے شمال میں بسنے والے ان قبائل کو پریشان کر رہے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ سب کے سب مشرکین کے ساتھ جنگ کریں جس طرح وہ سب کے سب مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں اور اُن کے صلح کے تمام ذرائع، مثلاً صلح حدیبیہ، مسدود ہو چکے تھے۔ یا ان پر عمل نہ ہوا تھا۔ مشرکین ہر طرح سے مسلمانوں کو تنگ کرنے اور ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے، حالانکہ مسلمان اس حال میں نہ تھے کہ وہ مشرکین کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ سلطنتِ فارس اور سلطنتِ روم اور مسلمانوں کے درمیان جنگیں بھی اسی بناء پر شروع ہوئیں کہ عیسائی وغیرہ مسلمانوں کو یکسر مٹا دینے پر آمادہ تھے۔

ان ممالک میں مسلمان طاقت سے اسلام پھیلانے کے لیے داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر بھی اور موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے بھی صحیح ہے۔ مسلمانوں نے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنا دین ترک کر کے اسلام قبول کر لے۔ نہ انہوں نے غیر مسلموں کے معبدوں کو تباہ کیا۔ اس بات پر وہ معاہدے شاہد ہیں جو مسلمان خلفاء اور ان کے سرداروں نے بلادِ مفتوحہ کے ساکنین کے ساتھ کیے۔[31] یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسلمان جن جن ممالک میں داخل ہوئے ان میں اب بھی غیر مسلم کثرت سے ہیں۔ مسلمان جب اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے تھے تو ان کا مقصد ایسا ماحول پیدا کرنا ہوتا تھا، جہاں دعوتِ اسلامی کی اجازت ہو اور ان کا راستہ نہ روکا جائے، جہاں

Marfat.com

تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس پر جبر و اکراہ سے عمل نہیں کرایا جا سکتا۔

"إنك لا تهدي من احببت" (آپ جسے چاہیں اُسے ہدایت نہیں دے سکتے۔)
(القصص ۲۸ : ۵۶)

علماء اور فقہائے اسلام نے آیت قرآنی :

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔) (البقرہ ۲ : ۲۵۶)

کے حوالے سے تین نظریے پیش کیے ہیں :

۱۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ نبی کریم جزیرۂ عرب میں اسلام کے سوا کوئی دین پسند نہ کرتے تھے۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوئی بلکہ یہ اہلِ کتاب سے مخصوص ہے جیسا کہ رسول اللہ کے اہلِ یمن کے نام مکتوب سے واضح ہے کہ "یہودیوں یا نصرانیوں میں سے جس کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ اپنے ہی دین پر رہا۔

۳۔ بلکہ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت نہ منسوخ ہے نہ مخصوص۔ اس رائے کے حامی امام رازی (تفسیر)، ابنِ تیمیہ (رسالۃ القتال)، ابن کثیر، طبری، آلوسی، حصاص، ابوحیان وغیرہ ہیں۔

دنیا کی "دارالاسلام"، "دارالحرب" اور "دارالعہد" میں تقسیم

فقہاء نے دنیا کو تین قسم کی مملکتوں میں تقسیم کیا ہے :

۱۔ دارالاسلام (اسلامی مملکتیں)

۲۔ دارالحرب (اسلام دشمن مملکتیں)

۳۔ دارالعہد (مسلمانوں کی حلیف مملکتیں)

یہ تقسیم قرآن، سنت میں وارد نہیں ہوئی، بلکہ مسلمان علماء نے اُن حالات کو عملاً دیکھتے ہوئے کی جن میں مسلمان زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ یہ تقسیم اختلافِ مذاہب کی بناء پر نہیں بلکہ اس کا تعلق حالتِ امن یا حالتِ خوف سے ہے جو مسلمانوں کو کسی مملکت یا مملکتوں کو درپیش ہوا۔[1]

Marfat.com

جہاں تک دارالاسلام کا تعلق ہے تو اس میں وہ تمام ممالک و بلاد داخل ہیں جو اسلام کے اقتدار کے ماتحت ہیں، جن میں اس کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور حدود قائم ہوتی ہیں۔ مسلمانوں پر اس کا دفاع فرض کفایہ یا فرض عین کی حیثیت سے واجب ہے۔ کسی اسلامی مملکت پر غیر ملکی قبضے سے اس کے دفاع کی خاطر جہاد ساقط نہیں ہو جاتا خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ گزر جائے (جس طرح مثلاً فلسطین اور افغانستان) دارالاسلام کو "دارالعدل" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بات فرض کر لی جائے گی کہ اس مملکت کی اساس عدل پر قائم ہوگی۔ اسی طرح "دارالتوحید" کے مقابل "دارالشرک" ہے۔

اور دارالحرب وہ ممالک ہیں جن میں اسلام کے احکام دینی و سیاسی نافذ نہیں ہوتے اور جو اسلامی اقتدار سے خارج ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں جن کے حکمران مسلمان نہیں اور نہ ان میں احکام شریعت چلتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صرف یہی وجہ امتیاز ان ممالک کو ایسے بلاد نہیں قرار دیتی جو مسلمانوں سے آمادۂ پیکار ہوں۔ بعض مسلمان فقہا نے کسی مملکت کو "دارالحرب" قرار دینے کے لیے تین شرائط مقرر کی ہیں:

۱۔ مذکورہ بالا اختلاف نظام حکومت و شریعت

۲۔ دارالاسلام سے ہمسائیگی (کہ سرحدیں ملتی ہوں)

۳۔ یہ کہ وہاں کے مسلمان باشندوں کی جان و مال، عزت اور دین محفوظ نہ ہوں۔

جو مملکت تیسری شرط پر بالخصوص پوری اترتی ہو، تو وہ بے شک و شبہ دولت اسلامیہ کی دشمن محارب مملکت سمجھی جائے گی۔ جہاں تک مجاورت، یا ہمسائیگی کا تعلق ہے کہ عصر حاضر میں یہ لازمی نہیں رہی کیونکہ حقوق مشترک نہ ہونے کے باوجود عداوت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ضرب و سائل حرب اور تباہ کن آلات میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہے۔

"دارالعہد" یہ وہ مملکتیں ہیں جہاں مسلمانوں نے قبضہ نہ کیا ہو مگر انہوں نے وہاں کی حکومت اور باشندوں سے معاہدۂ صلح کر رکھا ہو، اس معاہدے کی اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ معاہد مملکت، مسلمان حکومت کو سالانہ تاوان ادا کرے گی، جسے "خراج" کہا جاتا ہے۔ اس شرط کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ معاہد مملکت کا دفاع کریں جس طرح معاویہؓ بن ابی سفیان کے عہد میں

Marfat.com

آرمینیا کے ساتھ معاہدے میں درج تھا۔ "دارالعہد" کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اسلامی قوانین و شریعت کا پابند ہو، اور اُسے اپنی حکومت اور اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی آزادی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ مسلمانوں اور مملکتِ اسلامی کے مفادات کو ضرر نہ پہنچائے۔

مسلمان فقہا نے جب دنیا کی ان تین منطقوں میں تقسیم کی تھی تو وہ اپنے دور کے حالات سے مجبور ہو گئے تھے کیونکہ بعض قرون میں ساری کی ساری دنیا ہی مسلمانوں کے ساتھ آمادہ بجنگ تھی۔ بہرحال اس تقسیم کا اسلام کے اعلیٰ مثالیوں پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا اور نہ اس بات پر کہ اسلام کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات کا بنیادی اصول امن ہے، جنگ نہیں۔

دولتِ اسلامیہ میں شہریوں اور غیر ملکیوں کے حقوق

اسلام سے قبل، اس وقت کی مشہور سلطنتوں میں کسی غیر ملکی کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے کیونکہ ہر مملکت اپنے شہریوں کے سوا ہر ایک کو مخالف اور دشمن سمجھتی تھی اور اس لیے غیر ملکیوں کو دشمن سمجھا جاتا تھا اور ان سے دیسی سلوک ہوتا تھا۔ اسلام نے جس طرح بین الاقوامی معاملات میں انسانیت اور امن کو فروغ دیا، اسی طرح اسلامی مملکت کے افراد کے ساتھ مراسم کو بھی انہیں اصولوں کے تابع کیا خواہ وہ افراد اس کے اپنے شہری ہوں یا غیر ملکی، مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، اسلام نے درگزر میں ایسی رفعت پائی کہ کوئی "مشرک حربی" بھی دارالسلام میں داخل ہو جاتا تو مسلمان کو اجازت نہ تھی کہ اس سے برا سلوک کریں، بلکہ اسلام کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حاکم اعلیٰ (یا اس کے نائب) کا فرض ہے کہ وہ اس مشرک حربی کی حفاظت کرے تاآنکہ وہ محفوظ جگہ پہنچ جائے۔ قرآنِ مجید کا حکم ہے:

"إن احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مأمنه"
(اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ کا طلبگار ہو تو اُسے پناہ دو یہاں تک وہ کلام اللہ سن لے اور پھر اُسے اس کی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ التوبہ ۹ : ۷)

اس لیے ضروری ہے کہ ہم شہریوں اور غیر ملکیوں کے احوال پر ایک اجمالی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انہیں دولتِ اسلامیہ کی حدود میں کیا فوائد حاصل ہیں:

مسلمان فقہا نے دولتِ اسلامیہ کے باشندوں کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ مسلمان

Marfat.com

۲۔ ذمّی

۳۔ امان کے طلبگار (المستامنون)

ان میں سے مسلمانوں اور ذمیوں کو دولتِ اسلامیہ کی رعایا یا شہری شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس میں مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ "مستامن" غیر ملکی ہیں کیونکہ وہ دارالاسلام میں محدود مدت کے لیے آتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں کے حقوق و فرائض بیان کرنے سے پہلے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مملکت اپنے تمام شہریوں پر یکساں سیادت رکھتی ہے، اور ان لوگوں پر بھی جو اس کی حدود میں مقیم ہوں اس لیے یہ صحیح نہیں کہ اس معاملے میں کسی فرد یا گروہ کو مروجہ قانون یا ضوابط سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، ورنہ اسے یا تو لوگوں کے درمیان امتیازی سلوک قرار دیا جائے گا یا حکومت کا اختیار و اقتدار ناقص شمار ہوگا۔ جب کوئی مملکت اپنی حدود میں مقیم افراد یا طبقوں کے مذاہب اور اختلافِ شریعت کو معتبر مان لے تو پھر ان میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں کیونکہ یہ مملکت کے اقتدار کے منافی ہے

مسلمان رعایا

کسی دولتِ اسلامیہ میں رہنے والے مسلمان وہ افراد ہیں جو اسلام کو بطور دین و نظام تسلیم کرتے ہوں۔ ان افراد کا اپنی مملکت سے اشتراکِ وطن و عقیدہ ہوتا ہے۔ مسلمان کسی بھی اسلامی مملکت میں رہے وہیں کی رعایا شمار ہوگا، خواہ اس کا وطن کچھ بھی ہو اور اس کی راہ میں رکاوٹیں اور پابندیاں عائد کرنا مناسب نہیں۔ بلکہ اسے مسلمانوں کے تمام علاقوں میں نقل و حرکت اور کاروبار کی آزادی حاصل ہے عصرِ حاضر میں جو پابندیاں مسلمانوں پر عائد کی جاتی ہیں اسلام میں ان کی کوئی حیثیت و مقام نہیں۔ مسلمان، مسلمان کا وارث ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں کا شہری ہو۔ یہ بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے وہ دارالاسلام سے باہر کوئی جرم کرے مگر اسے سزا اسلامی قانون کے مطابق ہی ملے گی۔ دراصل اسلام کو دنیا بھر کے مسلمانوں کا وطن گردانا جاتا ہے۔

ذمّی

یہ وہ لوگ ہیں جو "ذمہ" کے معاہدے کے تحت مسلمانوں کے درمیان مستقل اقامت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مسلمانوں کی رعایا اور دولتِ اسلامیہ کے شہری ہیں۔ مسلمانوں کا اپنی مملکت کے ساتھ

Marfat.com

شہریت اور دین کی وجہ سے ربط ہے جبکہ ذمیوں کا ربط محض شہریت اور وطنیت کی وجہ سے ہے۔ ذمی دراصل وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں کے باشندے تھے اور چونکہ انہوں نے اپنے علاقے میں اور اپنے دین پر قائم رہنا پسند کیا اس لیے وہ مسلمانوں کا "ذمہ" بن گئے یا ان کی پناہ میں آگئے۔ جب کوئی قوم ذمی بننا پسند کرے تو اس کے لیے ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے معمولی سا مالی بوجھ برداشت کرے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دولتِ اسلامیہ مالی احکامات اور تعزیرات کو قبول کرے۔ اس قوم کو ایسے عام قانون کی پابندی سے، جس میں شادی، طلاق، وراثت کے شخصی معاملات آتے ہیں، معاف کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ ان کے دینی امور ہیں جس میں جبر نہیں کیا جا سکتا۔

دولتِ اسلامیہ میں ذمیوں کی موجودگی پر لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف افترا پردازی کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ اعتراض "جزیہ" پر کیا جاتا ہے۔ جو دولتِ اسلامیہ کے سامنے میں آنے والے ہر ذمی پر واجب ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے مخالف اس مشہور طریقے پر عمل کرتے ہیں کہ "حملہ کرنا ہی بہترین دفاع ہے۔" پہلے تو وہ مسلمانوں پر تہمت دھرتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف تلوار استعمال کرتے ہیں اور پھر اسلام پر "نظرِ کرم" کرتے ہوئے اُسے "تلوار کا مذہب" قرار دیتے ہیں اس طرح مسلمان اس تہمت کے جواب میں مصروف ہو جاتے ہیں اور دفاعی جواب دیتے رہتے ہیں۔ اگر مسلمان انہیں یاد دلائیں کہ ان کا اپنا سلوک ان مسلمانوں کے کتنا گھناؤنا ہے اور ان پر کتنے مظالم ہوتے ہیں جو ان کی مملکت میں ہیں تو غیر مسلم فوراً مسلمانوں پر تہمت لگا دیتے ہیں اور الزام دھرتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی مثال کے طور پر جزیہ کو پیش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں حقیقت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قاتلوا الذین لا یؤمنون ...... حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (التوبہ: ۲۹)

بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت میں "عن ید" سے مراد ہے "آسانی سے" اور بچے، عورتیں اور بوڑھے جو ادا نہیں کر سکتے، اس سے خارج ہیں اور "وھم صاغرون" سے مراد یہ ہے کہ وہ دولتِ اسلامیہ کی اطاعت اور اس کے قوانین کی پابندی کریں۔

جزیہ اس خدمت کا صلہ یا معاوضہ ہے جو مسلمانوں پر ذمیوں کی حفاظت کے سلسلے میں عائد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس معافی کا بدل بھی ہے جو انہیں دولتِ اسلامیہ کے بقا اور اس کے شہریا

Marfat.com

کے دفاع کے لیے لڑنے سے مل جاتی ہے۔ تاریخ میں وارد ہے کہ جب بھی مسلمان ذمیوں کی حفاظت سے قاصر رہتے تھے، وہ جزیہ کی رقم غیر مسلموں یا ذمیوں کو لوٹا دیتے تھے۔ مثلاً ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے شام کے تمام شہریوں سے وصول کی ہوئی جزیہ کی رقم اس وقت واپس کرنے کا حکم دیا جب انہیں معلوم ہوا کہ شمال میں رومی لشکر نے دولت اسلامیہ کی حدود کا محاصرہ کر لیا ہے اور انہیں احساس ہوا کہ وہ ذمیوں کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے سرداران کو لکھا کہ وہ ذمیوں کو بتا دیں: "ہم نے اموال اس لیے واپس کیے ہیں کہ ہم جو کر سکتے تھے کر چکے اور تم نے ہمارے اوپر یہ شرط عائد کی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، مگر اب ہم اس سے قاصر ہیں۔" ان کے اموال واقعی واپس کر دیئے گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں کے ذمیوں نے کہا: "خدا تمہیں جلد واپس لائے اور ان پر فتح دے (یعنی رومیوں پر، حالانکہ وہ ان کے ہم مذہب تھے) کیونکہ اگر وہ تمہاری جگہ ہوتے تو ہرگز ایک کوڑی بھی واپس نہ کرتے بلکہ ہمارا بچا کھچا مال بھی چھین لیتے۔" ان کے بعد صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا جب اس نے شام کو خالی کرتے وقت وہاں کے نصاریٰ کا جزیہ واپس کر دیا۔ مشہور مستشرق آرنلڈ نے اپنی کتاب "الدعوۃ الی الاسلام" میں یہ واقعہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے: "غیر مسلموں کو اسلامی حکومت پر اتنا اعتماد تھا کہ (جب صلاح الدین ایوبی رخصت ہونے لگا تو) وہ اسے الوداع کہہ رہے تھے مگر اس کے لوٹ آنے کی دعا بھی مانگ رہے تھے کیونکہ مسلمان حکمران اپنی قدیم عادت کے مطابق دوسری قوموں سے درگزر اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے تھے۔" گویا جزیہ محض حفاظت کی قیمت تھی اور اس کی مقدار اس سے کہیں کم تھی جو مسلمان زکوٰۃ، عشر وغیرہ کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جزیہ کی اختراع اسلام نے نہیں کی، بلکہ اس سے پہلے یونان، روم اور فارس میں اس پر عمل ہوتا تھا مگر اسلام نے جب اسے عائد کیا تو ایسی صورت میں کیا کہ کسی معاشرے نے اس سے پہلے اتنی فراخدلی اور انصاف کا مظاہرہ نہ کیا ہوگا اور اس نے غیر مسلموں کے کوائف اور احوال کو مدنظر رکھ کر کیا۔

اسلام نے ذمیوں کو اپنی عبادات اور عقائد میں مکمل آزادی عطا کی ہے اور انہیں اجازت دی ہے کہ ان کو تجارت، کاروبار، نقل و حرکت وغیرہ کے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو ہیں[15] بلکہ بعض معاملات میں انہیں وہ حقوق بھی حاصل ہیں جو مسلمانوں کو نہیں، اور بے شمار فقہا نے کہا ہے کہ نصاریٰ کو شراب اور خنزیر کا کاروبار کرنے کی اجازت ہے کیونکہ ان کے دین میں حرام نہیں

Marfat.com

حالانکہ کسی مسلمان کو یہ کاروبار کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔

اسلام نے ذمیوں کی حفاظت فرض قرار دی ہے اور ان کا خون اور مال دونوں محفوظ ہیں۔ ان کی آزادی اور عزت محترم ہیں۔ رسول کریمؐ نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے:

"جس نے کسی ذمی کو تکلیف دی تو قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہوگا اور جس کی مخاصمت میں کروں گا اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔"

حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں اپنے عمال سے سب سے پہلے ذمیوں کے بارے میں پوچھتے تھے آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے عمرو بن العاص، والئ مصر کے بیٹے کو اس لیے کوڑے لگوائے کہ اس نے کسی ذمی سے بدسلوکی کی تھی اور حضرت عمرؓ نے اس وقت اپنا معروف قول کہا تھا: "تم نے لوگوں کو کیسے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا"

دولت اسلامیہ میں ذمیوں کا اس قدر خیال رکھا جاتا تھا کہ اگر ان کی مالی حالت ہوتی تو بیت المال سے ان کی مدد کی جاتی، حالانکہ وہ مسلمانوں کا ادارہ تھا۔ خالدؓ بن ولید نے اہل حیرہ کے بارے میں حکم دیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی ایسا بوڑھا ہو جو کام سے معذور ہو یا اس پر کوئی مصیبت آئی ہو، یا امیر تھا، مگر فاقے کرنے لگا کہ اس کے ہم مذہب اُسے صدقہ خیرات دینے لگے، تو ان کا جزیہ معاف کر دیا گیا اور جب تک وہ دارالاسلام میں رہنا چاہتے مسلمانوں کے بیت المال سے ان کی اور ان کے اہلِ خانہ کی امداد جاری رہتی۔

مستامنین (غیر ملکی)

یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی علاقوں میں محدود مدت کے لیے داخل ہوں اور ان کی نیت مستقل قیام کی نہ ہو۔ اگر مستقل قیام کا ارادہ ہو تو ان سے ذمیوں کی طرح سلوک کیا جائے گا۔ سب سے پہلے اسلام ہی نے غیر ملکیوں کے حقوق تسلیم کیے جبکہ انسانیت نے ان حقوق کی پابندی کے لیے بیسویں صدی عیسوی میں قوانین وضع کیے۔

غیر ملکیوں کو دولتِ اسلامیہ میں عارضی قیام اور نقل و حرکت کی آزادی ہے، انہیں تجارت اور کاروبار کا حق بھی حاصل ہے اور عام ضرورت کی تمام سہولتوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ دولتِ اسلامیہ کے نظام و قوانین کے تابع رہیں۔ یعنی مملکت میں امن و امان قائم رکھیں، قانون شکنی

Marfat.com

نہ کریں، مسلمانوں کے عقائد اور رسم و رواج کا احترام کریں اور ہر اس فعل سے باز رہیں جس سے مسلمانوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

فقہا نے غیر ملکیوں کے لیے کئی باتیں کہی ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں:

۱۔ کسی غیر ملکی کا اس مال پر حق زائل نہیں ہوتا جو اس نے دارالاسلام میں کمایا ہو، خواہ وہ دارالحرب کو لوٹ جائے یا مسلمانوں کے خلاف ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھا لے۔

۲۔ اگر دارالاسلام میں اس کی وفات ہو جائے تو اس کا مال و اسباب اس کے وارثوں کو پہنچا دیا جائے اور اگر وہ دارالحرب میں پہنچ کر بھی مر جائے تو اس کا دارالاسلام میں مال اس کے وارثوں کو منتقل کر دیا جائے گا، خواہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا ہی کیوں نہ مارا گیا ہو، لیکن اگر وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ آزما ہو اور قیدی بنا لیا جائے جس کے بعد اُسے چھوڑ بھی دیا جائے تو اس کا اپنی ملکیت پر حق زائل ہو جائے گا۔

۳۔ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے تو ان پر بھی وہی نافذ ہوں گی جو باقی سب لوگوں پر ہوتی ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ کریں تو جمہور فقہا انہیں سزا دینے کے حق میں ہیں، صرف امام ابوحنیفہؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ النساء : ۵۹

۲۔ النساء : ۸۳

۳۔ آلِ عمران : ۱۵۹

۴۔ المائدہ : ۴۹

۵۔ اس نقطۂ نظر کے سربراہ علی عبدالرازق ہیں جو اپنی کتاب "اسلام اور اصول حکومت" میں کہتے ہیں: "محمد دینی دعوت کے لیے بھیجے گئے تھے، جو خالصتاً دین کے لیے تھی جس میں ملک و سلطنت کی آمیزش نہ تھی کیونکہ نبی کریم ملک و سلطنت قائم کرنے نہیں آئے تھے، اور آپ نے اس معنی میں کسی مملکت کو قائم نہیں کیا جس معنی میں علمِ سیاست میں معروف ہے آپ اپنے سے پہلے انبیاء کی طرح رسول تھے، بادشاہ نہیں، نہ کسی سلطنت کے بانی نہ حکومت کے دعویدار۔"

مؤلف مذکور جب حقیقت کا سامنا کرتے ہیں کہ رسول کریم اللہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے تمام امور کے مالک تھے جن و جہاد و غزوات، جنگ کے بعد انتظام مثلاً معاہدے اور حدود کا قیام وغیرہ شامل تھے، تو یہی کہتے ہیں کہ ان تمام امور کو آپ دین اور دعوت دین کے حصے کے طور پر سرانجام دیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: "بعض اوقات سیرتِ نبوی میں ایسے اعمال بھی نظر آتے ہیں جو حکومت کا عمل یا ملک و سلطنت کا مظہر معلوم ہوتے ہیں، مگر ان سے شک میں نہ پڑیں کیونکہ یہ تمام معاملات و افعال دین کے قیام اور دعوت کی تائید کے وسائل تھے۔"

۶۔ ڈاکٹر فتح جبر اللہ کہتے ہیں:

"اسلام صرف دین ہی نہیں بلکہ نظام سیاسی بھی ہے۔ مسلمانوں میں بعض افراد ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "روشن خیال" کہتے ہیں اور یہ اصرار کرتے ہیں کہ اسلام میں دین و سیاست

Marfat.com

الگ الگ ہیں، مگر فکرِ اسلامی نے واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں دونوں متلازم ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔"

پروفیسر نالینو کہتے ہیں:

"محمدؐ نے دین اور ریاست کی بیک وقت اساس رکھی اور دونوں کی حدیں آپؐ کی زندگی میں ایک دوسرے سے منسلک تھیں۔"

ڈاکٹر شافٹ کہتے ہیں:

"اسلام کا بیشتر حصہ دین ہے مگر اس میں نظریات، قانونی و سیاسی بھی داخل ہیں اور درحقیقت یہ ایسا مکمل نظام ہے جو دین و ریاست دونوں پر محیط ہے۔"

پروفیسر سٹروٹمان کہتے ہیں:

"اسلام بیک وقت دین بھی ہے اور سیاست بھی، کیونکہ اس کا بانی نبیؐ بھی تھا اور حاکم بھی جو حکومت کے کاروبار سے واقف تھا۔

۷۔ محمد اسد: منہاج الاسلام فی الحکم

۸۔ ایضاً

۹۔ طبری: گیارہویں سن ہجری کے واقعات

۱۰۔ اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھئے: مولانا مودودی: "اسلام کا سیاسی نظریہ"

۱۱۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسی: "نظام الحکم فی الاسلام"

۱۲۔ استاذ محمد ابو زہرہ: العلاقات الدولیہ فی الاسلام

۱۳۔ ان میں، مثلاً، وہ معاہدۂ امان ہے جو حضرت عمرؓ نے اہلِ ایلیاء کے ساتھ جس کی رو سے اُن کی جانیں، اموال، صلیبیں، بیمار اور صحت مند افراد اور ان کی قوم کے تمام لوگوں کو پناہ دی گئی تھی اور عہد کیا گیا تھا کہ ان کے معبدوں پر قبضہ نہیں کیا جائے، نہ ان سے کچھ غصب کیا جائے گا، نہ اُن پر اُن کے دین کی وجہ سے سختی کی جائے گی اور نہ ان میں کسی کو آزار پہنچایا جائے گا۔

۱۴۔ استاذ محمد ابو زہرۃ: العلاقات الدولیۃ فی الاسلام

۱۵۔ عمرو بن العاصؓ نے مصر کے لوگوں کو امان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے جان و مال، دین و مذہب

Marfat.com

گرجے، صلیبیں سب محفوظ رہیں گی۔ اور ان کو خشکی و تری دونوں جگہ امان ہے۔ ان کے ان حقوق میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔ روم اور بلادِ افریقہ کے جو لوگ ان سے صلح کریں گے ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے اور وہی فرائض عائد ہوں گے، جو اسے پسند نہ کرے اور لوٹ جانا چاہے تو جب تک وہ اپنی پناہ گاہ میں نہیں پہنچ جانا، مامون ہے یا وہ ہمارے حیطۂ اقتدار سے نکل جائے۔ جو لوگ رہنا چاہیں انہیں درآمد برآمد کی تجارت سے منع نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

اقتصادی نظام

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام، زندگی کا جامع نظام ہے، اور اس کا ایک رُخ، یعنی اسلام کا سیاسی نظام ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم چند ایک وہ اصول بیان کرتے ہیں جن پر اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس ہے۔ اس سلسلے میں ہم انسان کی ان سرگرمیوں کا جائزہ بھی لیں گے جن میں وہ اپنی مادی ضروریات پورا کرنے کے لیے مصروف ہوتا ہے۔ "اقتصادی تنظیم سے مراد عموماً یہ لی جاتی ہے کہ یہ انسان کی ان کوششوں کے لیے ضوابط ہیں جو وہ ضروری حاجات یا آسائشوں کے حصول کے لیے کرتا ہے، یا دولت کی پیداوار گردش اور تقسیم کے لیے کرتا ہے اور افراد کے اقتصادی حقوق اور جماعت کے مفاد کے مقابل ان کے مفاد کی حدود طے کرتا ہے۔

یہ دہرانا ضروری ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام باقی سب اقتصادی نظاموں سے مختلف ہے کیونکہ یہ مستقل اور ممتاز ہے۔ اگر کہیں کہیں اس کے اصول دوسرے نظاموں سے مشابہ نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کسی دوسرے نظام کی خوشہ چینی کی ہے یا ان نظاموں سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔

اس وقت دنیا میں دو بڑے بڑے اقتصادی نظام رائج ہیں: ان میں سے ایک آزاد و اقتصادی نظام اور دوسرے کو اشتراکی نظام کہا جاسکتا ہے۔ آزاد اقتصادی نظام دولت کی پیداوار اور افزائش میں ذاتی مفاد اور انفرادی آزادی کو ملحوظ رکھتا ہے اور حکومت کی دخل اندازی کو ناپسند کرتا ہے۔ جبکہ اشتراکی نظام اس کے برعکس اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتا ہے

Marfat.com

اور حکومت کو ہر چیز کا مالک قرار دیتا ہے اور پورا اقتصادی نظام حکومت کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اسلامی نظام دونوں مفادات یعنی اجتماعی اور انفرادی، کا یکساں خیال رکھتا ہے کیونکہ وہ فرد کی اقتصادی آزادی پر اس حد تک پابندی ضرور لگاتا ہے جو اجتماعی مفاد کے لیے ضروری ہو۔ اس طرح وہ مختلف طبقوں اور افراد میں توازن پیدا کر کے درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے

اسلامی اقتصادیات کا ہدف اور اس کے وسائل (مقاصد و ذرائع)

جس طرح اسلام کا سیاسی نظام، لوگوں میں انصاف، اور ان کے حقوق و فرائض میں مساوات قائم کرتا ہے، اسی طرح اقتصادی نظام، اجتماعی اور معاشرتی انصاف قائم کرتا ہے یعنی ہر انسان کے لیے کم سے کم مادی حد کی ضمانت، جو اس کی عزت نفس کو برقرار رکھ سکے اور اس مرتبہ عالیہ سے ہم آہنگ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے چاہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ ان تمام مواقع سے بہرہ اندوز ہو جو اس کی حاجت روائی کے لیے حاصل ہوں بشرطیکہ اس کی عزت اور انسانیت پر حرف نہ آئے۔ اسلام یہ مقصد اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ایک ایسی صاف ستھری اور پاکیزہ فضا پیدا کی جائے جس میں انسان اپنے تمام وسائل کو کام میں لاتے ہوئے صحیح و سالم انسانی فطرت کے مطابق، اپنی خواہشات پوری کر سکے۔ اسلام اس بات کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ انسان کی جزوی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے کیونکہ اس کے پیش نظر زندگی کے ارفع مقاصد ہیں۔

اس غرض سے اسلام دو بنیادی ذرائع استعمال کرتا ہے، شریعت اور تربیت۔ بیشتر اقتصادی نظام، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے صرف قانون کا سہارا لیتے ہیں، جبکہ اسلام کامل معاشرہ بنانے کے لیے جہاں مقاصد کے عملی حصول کے لیے قانون سازی کا سہارا لیتا ہے وہیں وہ انسان کی تربیت کا بندوبست بھی کرتا ہے جس سے وہ مادی ضروریات پوری کرنے سے بلند ہو کر، زندگی کا اعلےٰ نصب العین حاصل کرتا ہے۔

اس کی مثال شریعت میں نظام زکوٰۃ اور اس کے ضوابط ہیں جو اجتماعی کفالت کی بنیاد ہیں۔ اسلام نے نہ صرف اسے فرض قرار دیا بلکہ اس سے انحراف کرنے والوں کے خلاف جنگ کا اعلان بھی کیا اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے مسلمانوں کو اپنے مال میں سے صدقہ و خیرات کے لیے بھی ابھارا اور اس میں اضافی مالی قربانی سے اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان مال و دولت کی ہوس سے بالاتر ہو جائے

Marfat.com

جس طرح اسلام نے عام طور پر جاہلی زندگی کا نقشہ بدل دیا، اسی طرح اس کے اقتصادی نظام نے بوسیدہ مالی نظام میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس تغیرِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقراء مال و دولت سے مستفید ہونے لگے اور امراء اپنا مال اُن پر خرچ کرنے لگے۔ اسلام سے پہلے عوام تمام "گھٹیا" کاموں کے لیے وقف تھے اور ان کا کام صرف فرائض ادا کرنا تھا۔ افراد کی کفالت اور اجتماعی انصاف میں بھی حکومت جانبداری سے کام لیتی تھی اور عوام کے برخلاف، صرف با اثر کا ساتھ دیتی تھی۔ رسول کریم کی وفات کے بعد "حروبِ ردّہ" وہ پہلی جنگ تھی جو مسلمانوں نے محض اس لیے کی کہ اجتماعی انصاف اور زکوٰۃ کی وصولی کا مقصد حاصل ہو سکے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حکومت اور دولت الگ الگ ہیں۔ اب صرف وہی شخص حکمران ہو سکتا تھا جو لوگوں کے مفادات کا خیال رکھے اور حق کو قائم کرے جبکہ ماضی میں حکمران وہ ہوتا جو مال و دولت اور طاقت میں سب سے بڑھ کر ہوتا تھا۔

یہاں ہم اقتصادی نظام کے مختلف اجزا بیان نہیں کر سکتے، لیکن بعض اہم موضوعات کا ذکر کرنا ضروری ہے، مثلاً:

۱۔ ملکیت کے بارے میں اسلام کا مؤقف
۲۔ ملکیت اور پیداوار کے وسائل پر قیود
۳۔ منافع
۴۔ بنک
۵۔ اجتماعی کفالت اور زکوٰۃ

ملکیت کے بارے میں اسلام کا مؤقف

ملکیت کے بارے میں تمام اقتصادی نظام مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہر قسم کی انفرادی، اجتماعی، عام اور خاص ملکیت کی اجازت دیتے ہیں اور بعض صرف اجتماعی ملکیت، بالخصوص پیداوار کے وسائل کی اجازت دیتے ہیں۔

اسلام انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے مگر اجتماعی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اُسے جماعت کے مفادات سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے اور ایک ایسے اقتصادی نظریے کا حامی ہے جو فرد اور جماعت دونوں کے مفادات کا بخوبی نگران ہو، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام

Marfat.com

ہیں ملکیت خاص، اجتماعی قرار دا کرتی ہے۔

قرآن مجید میں کئی عبارات ایسی ہیں جو مال و دولت کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتی ہیں اور چند آیات اُسے انسان سے منسوب کرتی ہیں مثلاً:

"وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم" (النور: ۳۳)

"وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ" (الحدید: ۷)

"انما اموالکم واولادکم فتنۃ" (:۱۵)

"الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار" (البقرہ: ۲۷۴)

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مال کی نسبت سے مقصود یہ ہے کہ جماعت کو اس کے نمائندوں کو اس کا حق دیا جائے گا کہ وہ اس مال سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کی تنظیم کی نگرانی کریں اور اس کا استعمال غلط جگہ پر نہ ہو یا ایسے مصارف ہوں جو اجتماعی مفادات کے خلاف ہوں۔

اسلام نے انفرادی حق ملکیت کو اس لیے تسلیم کیا ہے کہ یہ انسان کی طبیعت اور فطرت کے مطابق ہے۔ کوئی انسان بالعموم اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا جب تک اُسے اس سے ذاتی فائدہ حاصل نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کا حق ملکیت، جو اس کے عمل کا ثمرہ ہے اور تمام انسانی سرگرمیوں کا محرک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو مملکتیں صرف حکومت کو ملکیت کا حق دیتی ہیں۔ وہ بھی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے انفرادی محرکات کی تلاش میں رہتی ہیں اور بالآخر انہیں کسی نہ کسی قسم کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ قرآن مجید انسان کی مال و ملکیت سے محبت کو جانتے ہوئے کہتا ہے:

"وانہ لحب الخیر لشدید" (العادیات ۱۰۰: ۸)

"وتحبون المال حباً جماً" (الفجر ۸۹: ۲۰)

"زین للناس حب الشھوات من النساء وا والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ" (آل عمران ۳: ۱۴)

انفرادی ملکیت کے اثبات کے لیے وہ آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن میں مال و دولت کی انسان کی طرف نسبت کی گئی ہے، اور اسی طرح احادیث رسول ﷺ اور گزشتہ تمام صدیوں میں مسلمانوں کا طریق کار بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔

Marfat.com

اسلام اس بات میں کوئی خرابی نہیں پاتا کہ فرد کو حق ملکیت دیا جائے جب تک صاحب مال اپنا حق ادا کرتا ہے اور اس کی دولت صرف تونگروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق" (النحل: ۷۱)

"اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر" (الرعد: ۲۶)

"نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیاۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات" (الزخرف: ۳۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں میں تفاوت کے بے شمار اسباب ہیں۔ مثلاً ہر فرد کی خلقت، اس کی ذہانت، اس کی طاقت، اس کا کام وغیرہ۔ یہ بات معقولیت سے بعید کہ کسی ذہین عالم کو کسی غبی جاہل کا ہم پلہ قرار دیا جائے یا کسی بے کار سست انسان کو محنتی کاریگر کے برابر سمجھا جائے۔ ان اسباب سے ہم کسی بھی معاشرے کو اپنے افراد کے درمیان مختلف انواع کے اختلافات سے خالی نہیں پاتے۔

اسلام اگر انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ دست فقر اور بدمست امیر کے وجود کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام حکومت کو انفرادی ملکیت میں دخل اندازی کی اجازت تو نہیں دیتا مگر مفاداتِ عامہ سے تعارض بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ دخل اندازی بھی انفرادی ملکیت کو بالکل ختم کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ انفرادی ملکیت اور مفاد عامہ کے درمیان مدافعت پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے اور یہ بات اسلامی شریعت کی اساس شمار ہوتی ہے اور اس ملکیت کے استعمال کو منظم کرنے کے لیے لازمی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاشرے پر ظلم محض انفرادی ملکیت کا حق دینے سے نہیں ہوتا بلکہ اس ملکیت کے غلط استعمال سے ہوتا ہے۔

جب اسلام انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے تو یہ بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ اس حق کے تحت اس کے تمام حقوق بھی ادا کیے جائیں تاکہ یہ دوسروں کی ضرر رسانی کا باعث نہ بن جائے۔ مملکت اسلامی ہر فرد کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق دیتی ہے کہ وہ اسے بیچ دے، ہبہ کر دے یا کرائے پر اٹھا دے بشرطیکہ اس کا عمل شرعی حدود کے اندر ہو۔ اس طرح فرد اپنی ملکیت کی

Marfat.com

وصیت کرسکتا ہے اور قانون کے تحت اس کے مرنے پر اس کے وارثوں کو اس کی جائداد منتقل ہو سکتی ہے۔

ملکیت کی حدود اور پیداوار کے ذرائع

بنیادی طور پر اسلام میں مال و دولت اللہ کا مال ہے اور انسان محض اس کا نائب ہے یا اس مال پر کارندہ ہے۔ کسی بھی کارندے کا فرض ہے کہ وہ ملازمت کی شرائط سے انحراف نہ کرے یعنی اس کا مال پر تصرف ان حدود میں ہونا چاہیے جو اسلام نے مقرر کی ہیں:

حق ملکیت پر اسلام نے کئی پابندیاں عائد کی ہیں، اور اس طرح دولت کی پیداوار کے ذرائع قیود سے مبرا نہیں۔ ہر فرد کے مال پر معاشرے کا حق عائد کیا گیا ہے۔ حق ملکیت پر درج ذیل پابندیاں ہیں:

۱۔ دولت کا حصول شرعی طریقے سے ہو۔

۲۔ دولت کو جمع کر کے نہ رکھا جائے کیونکہ جمع کرنے سے دولت معطل ہو کر رہ جاتی ہے اور فرد و جماعت کی خدمت میں استعمال نہیں ہو سکتی۔

۳۔ دولت کو معقول طریقے سے اور حدود میں استعمال کیا جائے کہ اس میں نہ اسراف ہو نہ بخل۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تسرفوا إن الله لا يحب المسرفين" (الانعام ۶ : ۱۴۱)

"والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما" (الفرقان ۲۵ : ۶۷)

ممکن ہے کوئی مسرف (فضول خرچ) اپنے اموال کے استعمال سے روک دیا جائے۔ اس صورت میں وہ اس کے وصی یا وارث کے ہاتھ لگیں گے، جو انہیں مفت کی کمائی سمجھ کر خوب خرچ کرے گا اور اس طرح اسراف اسلامی معاشرے میں، جو تعاون پر مبنی ہے، کئی بیماریاں پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔

۴۔ یہ مناسب نہیں کہ دولت کسی چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں محدود رہے اور انہیں میں گردش کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله وللرسول ولذي القربى

Marfat.com

والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کی لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم" (الحشر ۵۹:۷)
اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ کو بنی نضیر کے یہودیوں کا مالِ غنیمت ہاتھ لگا تو آپؐ نے اُسے تمام مسلمانوں پر تقسیم نہ کیا بلکہ صرف مہاجرین کو عطا کیا اور غریب انصار کو بھی نہ دیا کیونکہ انصار کے مادی حالات مستحکم اور پائیدار تھے۔ جس کے برعکس مہاجرین اپنے اموال مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ ان اموال کی تقسیم رسول اللہؐ نے قرآنِ کریم کی ہدایت کے مطابق کی۔

۵۔ وہ ملکیتیں جو عام مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہیں، اجتماعی ملکیت رہتی ہیں اور مملکت ان کی نگران ہوتی ہے۔ مثلاً پانی، چراگاہ، آگ جو حدیثِ رسولؐ میں مذکور ہیں۔ ان پر دوسری ملکیتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک دولت کے ذرائع پیداوار کا تعلق ہے، اسلام شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کی اجازت دیتا ہے۔ صاف ستھرے ذرائع یقیناً وہ ہیں جو سرمائے کو بُرے راستوں سے نہیں بڑھاتے۔

اسلام میں جو ذرائع "حرام" ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ دھوکا، فریب، غبن اور ایسے تمام ذرائع جن سے اسلامی اخوت اور تعاون مجروح ہو۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا: "جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں"۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "حرام سے کمائے ہوئے مال سے گوشت نہیں بڑھتا، اس کا ٹھکانا آگ ہے"۔

۲۔ لوگوں کی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی، جس سے ان کا استحصال ہو اور اُن سے ناجائز منافع کمایا جائے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: "جس نے کسی کھانے کی چیز کو چالیس دن تک ذخیرہ کیا، تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں اور اُسے اللہ سے غرض نہیں"۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "(حلال کی روزی کمانے والا) رزق پاتا ہے اور ذخیرہ اندوز ملعون ہے"۔

۳۔ سود، کیونکہ یہ کسی کوشش کے بغیر نفع ہے۔ یہ روحِ تعاون کو فنا کر دیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کا لالچ پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، اس سے امت کے مختلف طبقوں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کئی اقوام کو استعماریت کا بہانہ ملا اور کئی دوسری اقوام آزادی سے محروم ہو گئیں۔

انفرادی ملکیت، فرد کی بلا واسطہ منفعت کے لیے اور جماعت کی بالواسطہ منفعت کے

Marfat.com

لیے ہے۔ اسی لیے اگر کوئی مالک اپنی ملکیت سے نفع حاصل کرنا بند کر دے تو مملکت کے لیے جائز ہے کہ اُسے اس کا پابند بنائے۔ اس کے بارے میں کئی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ کسی زمین کی پیداوار تین سال سے زیادہ روک دینے جائز نہیں۔

منافع اور بینک

اس موضوع کی ہمارے دور میں خاصی اہمیت ہے۔ منافع کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اسی طرح بنکوں کے بارے میں طویل بحث کی گئی ہے۔ یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ اگر اسلامی نظام کے تحت، بنکوں کو ختم کر دیا جائے اور اس کی سودی اساس باقی نہ رہے، تو اس کا اسلامی بدل کیا ہوگا؟

منافع (یا سُود)

ربٰو (یا عرف عام میں "منافع) کسی کو قرض دیئے ہوئے مال پر منافع ہے جو بلا جہد حاصل ہوتا ہے۔ سود پر قرض دینے والا، قرض پر مقررہ فیصد کے حساب سے منافع لیتا ہے اس سے اس کے مال میں، کسی کوشش کے بغیر اضافہ ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں اپنا نفع لے گا، خواہ قرض لینے والے کو نفع ہو یا نقصان۔

بلادِ اسلامیہ میں بعض مفکرّین نے کہا ہے کہ وہ ربٰو جو اسلام میں حرام ہے، وہ سود مرکّب ہے سود مفرد نہیں اور وہ جو صارف کے لیے ہو پیداوار پر نہ ہو۔ صاف سے لیا جانے والا سود وہ ہے جو کسی کی روزمرہ کی حاجات کو پورا کرنے کے لیے دیئے جانے والے قرض پر لیا جائے، مثلاً کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیماری یا بچوں کی فیس کی ادائیگی یا بیٹی کی شادی وغیرہ کے لیے قرض لے تو اس پر سود (ان مفکرین کے نزدیک) حرام ہوگا اور پیداواری سود وہ ہے جو کوئی شخص اپنے کارخانے یا دکان یا زمین میں وسعت کے لیے یا پیداوار بڑھانے کے لیے حاصل کیے ہوئے قرض پر ادا کرے۔

سود مفرد سے مراد قلیل سُود ہے اور قرض پر دیئے جانے والے مال کے مقابلے میں اس کا تناسب قلیل ہو، سود مرکب وہ سود ہے جو تھوڑی مدت میں ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے یعنی سود پر بھی سود لیا جائے۔

بعض مفکرین نے اسی سود مرکب اور صارف سے لیے جانے والے سود کو حرام کہا ہے کیونکہ

Marfat.com

اس میں واضح استحصال ہے کیونکہ لوگوں کی ان جائز ضروریات کو پورا کر کے استعمال کرتا ہے جن کو پورا کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی طور پر اس کے نتائج ہولناک ہوتے ہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک صارف سے لیا جانے والا سود نزولِ قرآن اور بعثتِ رسولؐ کے ایام میں بھی رائج تھا۔ اور پیداواری سود چونکہ اس زمانے میں تھا ہی نہیں، اس لیے وہ حرام نہیں۔ سود مرکب کی حرمت کی دلیل وہ قرآن سے لاتے ہیں کہ

"یاایھا الذین آمنو الاتأکلوا الربا اضعافاً مضاعفة" (آل عمران ۳: ۱۳۰)

ان کی یہ دلیل کئی وجوہ کی بنا پر ناقص ہے:

۱۔ قرآن و سنت کی نصوص: ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی آیات اور احادیث دونوں مطلق سود کو حرام قرار دیتی ہیں، خواہ وہ کسی نوع کا ہو۔

قرآنِ مجید میں آیا ہے:

"الذین یأکلون الربا .... وحرّم الرّبا" (البقرہ ۲: ۲۷۵)

"یاایھا الذین آمنوا .... لاتُظلمون ولاتُظلمون" (البقرہ ۲: ۲۷۸۔۲۷۹)

"یاایھا الذین آمنوا .... لعلکم تفلحون" (آل عمران ۳: ۱۳۰)

رسول کریمؐ نے فرمایا:

"ہر وہ قرض جو نفع حاصل کرے وہ ربا ہے۔"

ان سے واضح ہے کہ ربا کسی قسم کا ہو، حرام ہے۔ اور سورہ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت میں "اضعافاً مضاعفة" کی ترکیب محض تاکید کے لیے ہے کیونکہ اس میں ذلت آمیز استحصال ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی مکروہ ہے۔

۲۔ بعض لوگ تاریخی دلائل لاتے ہیں لیکن یہ دلیل خود ان کے خلاف جاتی ہے۔ عربوں میں، ایام جاہلیت میں وہ جو سودی قرضے دیئے جاتے تھے وہ پیداواری سود کی قسم میں سے تھے۔ یہ بات ہر واقف تاریخ جانتا ہے کہ اسلام سے قبل عرب تجارت کرتے تھے اور شام، حجاز، یمن، فارس کو مال برآمد کرتے اور وہاں سے درآمد بھی کرتے۔ تجارت اور کاروبار کے لیے وافر مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ عرب تجّار اپنا اور دوسروں کا مال اس میں لگاتے تھے اور غالباً جو لوگ انہیں قرض دیتے تھے وہ منافع کا کچھ فیصد طلب کرتے تھے۔ اہلِ طائف زراعت پیشہ تھے۔ وہ مکہ کے اہلِ ثروت اور طائف

Marfat.com

کے یہودیوں سے، جو اس وقت وہاں آباد تھے، قرض لیتے تھے اور اس قرض کو سود کے ساتھ واپس کرتے تھے۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ عربوں میں بالعموم پیداواری سود کا رواج تھا۔ ہم سود کی حمایت کرنے والوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دورِ جاہلیت کے عربوں کو اشیائے صرف کے لیے سود پر قرض لینے کی حاجت تھی؟ یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال کے نان نفقے کے لیے قرض پر سود لیا جاتا تھا؟ اس معاشرے میں اشیائے صرف کے لیے قرض نادر بات تھی کیونکہ ان کی ضروریات سادہ اور محدود تھیں۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں اشیائے صرف کے قرض پر سود لینے کی بجائے پیداواری سود رائج تھا، مگر حرمت دونوں کے لیے برابر ہے۔

۳۔ اسلامی اقتصادی نظام، منفرد اور ممتاز نظام تھا۔ اپنے دور کے جملہ نظاموں سے یہ اس لیے منفرد اور ممتاز تھا کہ اس نے سودی معاملات کی کسی صورت و شکل میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔

اشیائے صرف کے لیے حاصل کیے جانے والے قرض پر سود تو ویسے ہی انتہائی غیر انسانی ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے معاش کے لیے ضروری اسباب کی حاجت ہے اور اگر کوئی معاشرہ مل جل کر اور ایک دوسرے کی دستگیری کر کے باہمی ضروریات کو پورا نہیں کرتا تو وہ معاشرہ بنیادی اخلاق سے خالی ہے۔

پیداواری قرض پر سود کی تحریم کو شاید ہم پوری طرح واضح نہ کر سکیں مگر ہم وہ بُرے نتائج ضرور پیش کرتے ہیں جو یہ سود اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نتائج سود لینے والے اور ہر پیداوار کے مالک، کارخانہ دار یا صارف کے حوالے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پیداواری سود گزشتہ تین صدیوں میں وسیع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بنکوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بنک، صرف اپنے مالکوں کے پیسے سے نہیں چلتے بلکہ ان رقوم رقوم جمع کرائے والوں کا پیسہ بھی شامل ہوتا ہے۔ بالعموم ابتدا میں ہر بنک بہت تھوڑے سے سرمائے سے کام شروع کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں رقم جمع کرانے والوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، جن سے بنک کثیر منافع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ رقم جمع کرائے والوں کو بہت تھوڑا حصہ دیتا ہے اور جو لوگ بنک سے قرض لیتے ہیں اُن سے بہت زیادہ وصول کرتا ہے۔ اس طرح دراصل رقم جمع کرائے والوں کے مال سے منافع کما کر بنک زیادہ سے زیادہ مالدار ہو جاتا ہے۔

اسی وجہ سے دنیا بھر کے بنک "مرکزیت" کی طرف مائل ہیں، یعنی ایسے بنک چند ایک ہیں جو مقدور بھر دنیا کے زرِ مبادلہ کی منڈیوں پر چھائے ہوتے ہیں۔ اور اسی تسلط کی وجہ سے سیاست اور اقتصادیات

Marfat.com

یکجا ہوگئی ہیں اور دنیا کے بے شمار معاملات میں ان کا عمل دخل ہے۔ اندازہ ہے کہ بڑے بڑے بنکوں میں زیادہ تعداد یہودی مالکوں کی ہے۔

جہاں تک کارخانہ دار وغیرہ کا تعلق ہے، وہ جب بھی کسی مقصد کے لیے قرض لیتا ہے تو اُسے اشیائے پیداوار کے اخراجات میں شامل کر لیتا ہے اور قیمت بڑھا دیتا ہے مثلاً اگر اُسے دس فیصد سود دینا ہو تو وہ اسی قدر قیمت میں اضافہ کر دے گا اور اس کا سارا بوجھ صارف پر ڈال دے گا۔

اگر پیداوار بڑھ جائے (جو پیداواری قرضوں کے آسانی سے ملنے کے باعث ہو سکتی ہے) اور مارکیٹ میں طلب کم ہو جائے تو اشیاء کی فراوانی ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں کساد بازاری پیدا ہو گی اور اقتصادی بحران آجائے گا۔ کارخانہ دار پیداوار میں کمی پر مجبور ہو گا اور اپنے اخراجات کم کرے گا، جس کے لیے اُسے یا تو اجرتیں کم کرنی پڑیں گی یا کارکنوں کی چھانٹی کرنا ہو گی جس سے بیروزگاری بڑھے گی۔ دونوں حالتوں میں اس بحران کے اثرات مزدوروں اور متوسط طبقے کے لوگوں پر پڑیں گے، جن کی قوتِ خرید کم ہو جائے گی اور اس کے بعد اقتصادی بحران شدید ہو جائے گا۔

پیداوار کا ہر مالک چاہے گا کہ خام مال کی قیمتوں میں کمی ہو جو اکثر حالات میں ترقی پذیر ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے، جو اپنی اقتصادی حالت کو اس خام مال کی برآمد سے بہتر بنانا چاہتے ہیں اور پھر اس کی آمدنی سے وہ اشیاء درآمد کرنا چاہتے ہیں جو ان کی معاشیات کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

یہ سب معروضات، ان اثراتِ بد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو پیداواری قرض پر سود کے لین دین کا نتیجہ ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب اسلام سود کی ہر قسم کو مکمل طور پر حرام قرار دیتا ہے تو کیا سودی نظام سے بچنے کا کوئی راستہ ہے؟ اور اشیائے صرف پر سود ہو یا پیداوار پر؟ کیا اسلام کے پاس اس کا کوئی متبادل ہے؟ ہم بنظر اختصار پہلے بنکوں کے فرائض وغیرہ کو دیکھیں گے اور پھر اصل موضوع کی طرف آئیں گے۔

عصرِ حاضر میں بنک بہت اہمیت حاصل کر گئے ہیں اور کئی اہم فرائض ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً زرِ مبادلہ کی آسانی، پیداوار میں سہولت اور سرمائے کی طاقت میں اضافہ۔ اسی لیے اربابِ اقتصاد کے

Marfat.com

نزدیک بنکوں کا وجود لازمی ہوگیا ہے۔ بالخصوص ان ممالک میں جہاں آزاد معیشت ہے کیونکہ وہاں پیداواری سرگرمیاں افراد اور خاص اداروں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کے برعکس اشتراکی ممالک میں تمام پیداواری سرگرمیاں حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔

عام لین دین میں بنک نقدی کا تبادلہ آسان بنا دیتے ہیں، یا قرض دیتے ہیں جس پر "حق خدمت" وصول کرتے ہیں۔ بنکوں کے ذریعے ادائیگی کے کئی طریقے ہیں:

۱۔ چیک: کوئی کھاتہ دار اپنے بنک کو اس کے ذریعے بنک کو پیغام دیتا ہے کہ اس کے جمع شدہ سرمائے میں سے کسی معین شخص کو یا اس چیک کے حامل کو اتنی رقم ادا کر دے۔

۲۔ کریڈٹ کھولنا: جو بنک کسی کھاتہ دار کو دیتا ہے۔ اس کے ذریعے بنک کسی کھاتہ دار کے نام معینہ رقم رکھ دیتا ہے جس سے وہ کھاتہ دار اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق قسط وار پیسہ نکلوا سکتا ہے۔ یہ قرض کی ایک صورت ہے جس پر بنک سود وصول کرتا ہے۔

۳۔ ڈرافٹ: اس کے ذریعے بنک کسی اور بنک کو یا کسی اور ملک میں اپنی شاخ کو کسی کھاتہ دار کے بارے میں ہدایت دیتا ہے کہ اُسے فلاں فلاں مطلوبہ رقم دے دی جائے اس کام کے لیے بنک معمولی سا کمیشن وصول کرتا ہے اور اس خدمت کے لیے سود نہیں لیتا۔

۴۔ پرامیسری نوٹ (درشتی ہنڈی): یہ وہ تحریری دستاویز ہے جو اس نوٹ کا جاری کرنے والا، اس غیر مشروط ضمانت کے ساتھ دیتا ہے کہ عندالطلب یا کسی معینہ مدت کے بعد کسی مخصوص شخص کو یا اس نوٹ کے حامل کو مقررہ رقم ادا کر دے گا۔ اگر کوئی شخص چاہے تو تاریخ مقررہ سے قبل ہی رقم وصول کر سکتا ہے اور اس کے لیے وہ بنک کو مقررہ شرح سے سود ادا کرتا ہے۔

۵۔ بل آف ایکسچینج (ہنڈی): یہ بھی تحریری معاہدہ ہے جس کا جاری کرنے والا غیر مشروط طور پر کسی شخص کو حکم دیتا ہے کہ معینہ مدت کے بعد یا عندالطلب اس معاہدے کے حامل کو مقررہ رقم ادا کرے اس پر بھی بنک سود وصول کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی خدمات ہیں جو بنک ادا کرتا ہے، مگر چند معروف طریقے یہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ چیک اور ڈرافٹ کے سوا، باقی سب خدمات کا معاوضہ سود کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

جہاں تک پیداوار میں مدد دینے کا تعلق ہے تو بنک اس کے لیے بلاسود قرض نہیں دیتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میدان میں بنک جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کا افزائش پیداوار سے گہرا تعلق ہے، لیکن سود کے لین دین کی وجہ سے اس کے نتائج برعکس ثابت ہو رہے ہیں۔

اسی طرح بنک سرمائے کی طاقت مضبوط کرتے ہیں جو پیداواری اداروں میں مستعمل ہے، اس سے پیداوار بڑھانے میں مدد ملتی ہے اور صاحبِ پیداوار کا بوجھ بھی کم ہوتا ہے مگر سود کا لین دین اس کو آلودہ کر دیتا ہے۔ بنک اپنے کھاتہ داروں یا قرض مانگنے والوں کو جمع شدہ سرمائے ہی سے قرض دیتے ہیں کیونکہ بنک کے مالکوں کا اپنا ذاتی سرمایہ اس نسبت سے بہت کم ہوتا ہے۔ بنک انہی کھاتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں کوئی بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تو اپنا منافع پورا لے لیں گے خواہ قرض مانگنے والا فائدہ اٹھائے یا نقصان۔ لوگ اپنا زائد یا فالتو سرمایہ بنک میں جمع کرواتے ہیں اور بنک ان رقوم سے قرض دے کر سود وصول کرتا ہے، جس سے مصنوعی قوت خرید پیدا ہوتی ہے یا نقدی کی قیمت گر جاتی ہے۔ بنکوں کی بدولت کئی نقصانات پہنچ رہے ہیں، مثلاً مقررہ اور پیشگی طے شدہ فوائد کے حصول کی وجہ سے بنک قرض لینے والوں سے غیر قانونی طور پر دولت جمع کر رہے ہیں اور ان قرض لینے والوں کے بُرے بھلے میں شریک نہیں ہوتے کساد بازاری کے زمانے میں بنک نہ صرف قرضوں کی ادائیگی کم کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات بالکل ہاتھ روک لیتے ہیں۔ یہ "بسط وقبض" (دینا اور روک لینا) خود بنکوں کے مالکوں کے اختیار میں بھی نہیں رہتا، جس سے معاشی صورت حال میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سُودی کاروبار کے مقابلے میں اسلامی متبادل

اب ہم ایسے بنکوں اور کاروباری اداروں کا تذکرہ کرتے ہیں، جن کی بنیاد اسلامی ہے، جو سودی معاملات سے پاک ہیں اور وہی خدمات سرانجام دیتے ہیں یعنی اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ اور ملک میں اقتصادی بنیاد فراہم کرنے کے لیے مشارکت، جو دوسرے بنک دیتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ بنک دو طرح کے ہیں: ایک عام کھاتہ داروں کے بنک اور دوسرے طویل منصوبوں یا صنعتی پیداوار کے لیے بنک۔ کھاتہ داروں کے بنک تو ہم "مضاربہ" کے معاہدے پر قائم کر سکتے ہیں اور صنعتی بنک مال میں شرکت کے معاہدے پر۔ دونوں معاہدوں کو شریعت اسلامیہ

Marfat.com

جائز قرار دیتی ہے اور ان کے لیے ایسی تنظیم قائم کرتی ہے جو ہمارا ہدف پورا کر سکتی ہے۔

عقد مضاربہ کے ضروری احکام یہ ہیں:

۱۔ یہ عقد یا معاہدہ طرفین میں ہوگا ان میں سے ایک مال فراہم کرے گا اور دوسرا خدمات اور اسے "مضارب" کہیں گے۔

۲۔ معاہدہ کرنے والے مقررہ تناسب سے نفع میں شریک ہوں گے، اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے ہر ایک کا نفع برابر ہوگا۔

۳۔ اگر فریقین میں سے کوئی اپنے لیے منافع کی مقدار مقرر کر لے تو مضاربت ختم ہو جائے گی کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ دوسرے یا باقی فریقوں کا منافع اس حد تک نہ پہنچ سکے۔

۴۔ مضارب کے لیے صرف نفع میں حصہ ہے اور سرمائے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح مضارب کو خسارے کا متحمل بنانا غلط ہوگا۔

۵۔ مضارب سرمائے کا امین ہوگا اور اسے اپنے پاس امانت خیال کرے گا۔ وہ اس کے تصرف میں صرف رب المال کی طرف سے کاروبار کے لیے ہوگا۔ اگر کاروبار میں نفع ہوگا تو وہ اس میں شریک ہوگا اور اگر اس میں خسارہ ہو تو اسے کچھ نہ ملے گا۔

اگر اسے دور حاضر کے بنکوں کی نظر سے دیکھا جائے تو کھاتہ دار سب کے سب "رب المال" سمجھے جائیں گے اور جو بنک سرمایہ فراہم کرے گا وہ "مضارب" ہوگا سوائے اس کے کہ بنک کے لیے نفع کی مقدار مقرر ہوگی۔

بنک اس سرمائے کو کاروبار وغیرہ میں لگائے گا اور کاروبار کرنے والوں کو قرض دے گا اسے تجربہ میں لا کر اس سے بہتر نتائج حاصل کرے گا۔ اس قسم کا بنک سودی بنکوں سے زیادہ اس بات کا کوشاں ہوگا کہ کاروبار میں منافع حاصل ہو کیونکہ منافع میں اس کا بھی حصہ ہے، درآنحالیکہ دوسرے بنک ہر حالت میں نفع چاہیں گے اور انہیں کاروبار کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

وہ کاروبار جن میں ہمارا تجویز کردہ بنک شریک ہوگا، اچھے منفعت بخش بھی ہو سکتے ہیں، اوسط درجے کے بھی اور خسارے میں جانے والے بھی، اگرچہ ایسے زیادہ نہیں ہوں گے، کیونکہ بنک تو صرف اسی کاروبار میں شرکت کرے گا جو نفع دے گا۔ سال کے آخر میں یا چھ ماہ بعد (جیسا کہ طے کر لیا جائے)، بنک نفع نقصان کا حساب لگائے گا جس میں اس نے سرمایہ لگا رکھا ہوگا اور یہ سرمایہ

Marfat.com

کھاتہ داروں یا دوسرے شراکت داروں کا ہوگا۔ اس حساب کتاب کے بعد، بنک اپنے عمومی اخراجات جن میں تنخواہیں اور دوسرے اخراجات شامل ہیں، وضع کرے گا، جن کی اجازت قانون دیتا ہے، اور باقی ماندہ منافع کو تمام کھاتہ داروں اور شرکاء میں طے شدہ معاہدے کے مطابق، برابر برابر تقسیم کرے گا۔

بنک اور کاروباری شرکتوں کے مالکوں میں رابطے کی صورت

کھاتے داروں سے نسبت کے لحاظ سے ہم نے بنک کو "شریک مضارب" تصور کیا، لیکن کاروباری اداروں سے اس کی نسبت "رب المال" کی ہوگی اور کاروباری اداروں کے مالک مضارب شمار ہوں گے اور اس "رب المال" اور مضارب دونوں کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو ہم نے پہلے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں۔ کاروبار وغیرہ سے جو منافع حاصل ہوگا اس کی حد بنک کے لیے باہمی اتفاق رائے سے مقرر کی جائے گی۔ اگر کسی کاروبار کو خسارہ ہوگا تو اُسے مہلت دی جائے گی اگر یہ خسارہ مالکوں کی کسی غفلت یا بدنیتی کے سبب نہ ہو تو بنک کو خسارہ برداشت نہیں کرنا پڑے گا لیکن اگر غفلت وغیرہ ثابت ہو جائے تو اسے فریق جارح سمجھا جائے گا اور اس پر ضمانت لازم آئے گی۔

صنعتی بنکوں میں بھی مضاربہ کا طریق اپنایا جائے گا بشرطیکہ سارا سرمایہ بنک نے فراہم کیا ہو، اور کاروبار کا مالک اس میں قطعی حصہ دار نہ ہو۔ اس لحاظ سے بنک کو "رب المال" اور کاروبار کے مالک کو شریک مضارب سمجھا جائے گا۔

صنعتوں میں سرمایہ کاری کے معاملے میں کاروبار کا مالک (شریک مضارب) صرف محنت نہیں کرے گا بلکہ سرمائے کا حصہ بھی فراہم کرے گا۔ اس طرح یہاں "شرکت" کا معاہدہ طے پائیگا۔ اور منافع کی تقسیم بنک، اور کارخانے دار دونوں کے فراہم کردہ سرمائے کے، اور کارخانہ دار کی محنت کی قیمت کے تناسب سے ہوگی۔ اس طرح منافع تین حصوں میں تقسیم ہوگا جس کا تناسب باتفاق رائے مقرر ہو سکتا ہے۔ بعض فقہائے مال اور مال و محنت کے اشتمال کی اجازت دی ہے۔

عملی صورت میں اس نئے نظام کے نفاذ میں کچھ پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوں گی کیونکہ جدید بنکاری کا نظام، نفاذ کے لحاظ سے آسان ہے، لیکن یہ الجھنیں بتدریج دور بھی ہو سکتی ہیں، جس طرح موجودہ

Marfat.com

بنکاری نظام میں ہوا اور لوگ اس سے مانوس ہو گئے، البتہ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ پیچیدگیوں کے ڈر سے سود اور اس کی حرمت کو حلال سمجھتے رہیں۔

صارفین کے لیے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کا متبادل اسلام میں آسان ہے اگر کسی مملکت اسلامی میں زکوٰۃ کا حصول اور اس کی تقسیم کے لیے حکومت ادارے مقرر کر دے تو صارفین میں سے زکوٰۃ کے مستحق اس سے اپنا حصہ لے کر حاجات پوری کر سکتے ہیں، غیر مستحقین کو زکوٰۃ کے فنڈ میں سے کم مدت کے لیے قرض حسنہ دیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے ان سے باقاعدہ ضمانت لی جا سکتی ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کی دستگیری کی ترغیب دی ہے کیونکہ ان میں اخوت، وحدتِ فکر اور وحدتِ عقیدہ کا رشتہ ہے۔ اس تعاون کا سب سے بڑا مظہر قرض حسن ہے جو دینے والا، لینے والے کو، محض خدا کی خوشنودی کے لیے دیتا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ سید قطب: العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام

۲۔ آنحضرتؐ سے مروی ہے:

"ہر مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسرے پر حرام ہے۔"

حضورؐ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر وہ لوگ تمہاری اطاعت کریں تو انہیں بتا دو کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امیروں سے لے کر فقرا کو دیا جائے گا۔ اگر وہ اس بات کو قبول کر لیں تو خبردار! ان کے پاکیزہ مال کو مت چھونا۔"

Marfat.com

امدادِ باہمی

اسلام نے جس امدادِ باہمی کی حمایت کی ہے، وہ معاصر نظاموں سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے دورِ حاضر کے معاشروں میں (خواہ وہ فرد کی آزادی پہ قائم ہوں جہاں حکومت کو مت کو شعار سمجھتی ہے یا ہر چیز حکومت کے کنٹرول میں ہو) امدادِ باہمی کے ادارے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان میں اور اسلامی طریقۂ امدادِ باہمی میں کئی نمایاں فرق ہیں:

(۱) جدید نظامہائے حکومت میں، امدادِ باہمی کے ادارے صرف مادّی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے لیے ایک قسم کی ضمانت مہیا کرتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی کو ایسی دشواری پیش آجائے جو اس کے اور اس کے اہلِ خانہ کی زندگی یا صحت پہ اثر انداز ہو تو اسے دور کیا جاسکے۔ اس کے برعکس، اسلام میں امدادِ باہمی، اس مادی صورت سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ہے، اور مادّی ضروریات کے ساتھ ساتھ نیکی، فرد کی بھلائی اور معاشرے کے مفاد کا بھی خیال رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

"وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدہ ۵:۲)

اس مفہوم میں امدادِ باہمی کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کی دعوت، منکرات کے ازالے، ضعیفوں کی حمایت اور فقراء اور بے دست و پا افراد کی ان کے حسبِ ضرورت مدد میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ نازک احساس رکھتا ہو کہ اجتماعی طور پہ کیا چیز بُری ہے اور امت کا مطمحِ نظر کیا ہے اور اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

Marfat.com

(۲) غیر اسلامی معاصر نظاموں میں امدادِ باہمی صرف ایک ہی حلقے یعنی فرد اور جماعت کے دائرے میں محصور رہے جبکہ اسلام میں یہ سب حلقوں اور دائروں کو محیط ہے، یعنی فرد اور اس کی ذات فرد اور اس کے اہل خانہ، فرد اور جماعت امتِ اسلامیہ اور دوسری اقوام، موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے مفادات کو پیشِ نظر رکھنا، فریضہ ہے ؎

فرد کا اپنی ذات سے تعاون یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی تطہیر و تزکیہ کرے، خواہشات سے اُسے روکے، اُسے نیکی کے راستے کی طرف مائل کرے، اور اس کے سامنے اتنی گنجائش رکھے کہ وہ ان حدود کے اندر زندگی سے متمتع ہو جو اس کی فطرت میں بگاڑ پیدا نہ کرے۔ اپنے اہل خانہ سے تعاون اس لیے ضروری ہے کہ یہ معاشرے کی عمارت کی خشت اول ہے اور فرد اپنے خاندان کے زیرِ سایہ اور اس کی حفاظت ہی رہ سکتا ہے۔ اسلام نے ایک ہی خاندان کے افراد میں مضبوط رشتوں کی تاکید کی ہے اور مودّت اور باہمی ہمدردی قائم کرنے کی مادّی اور معنوی ضمانت مہیا کرنے کو کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"ووصینا الانسان بوالدیه حملته امة وهنا علی وهن وفصاله فی عامین أن اشکر لی ولوالدیک" (لقمان: ۳۱: ۱۴)

اس کے بعد فرمایا:

"واولوا الارحام بعضهم أولی ببعض فی کتاب الله" (الاحزاب: ۳۳: ۶)

ایک ہی خاندان کے افراد میں امدادِ باہمی اور تعاون کو فروغ دینے کے لیے اسلام نے دو بہت بڑے اور انقلابی اعلان کیے: وراثت اور نفقہ۔ ان دونوں کے بارے میں کئی احکامات صادر ہوئے اور کئی فرائض عائد کیے گئے۔ وراثت کے ذریعے ترکے کی تقسیم اور فرد کے لیے نان نفقہ کی ضمانت سے معاشرے کو اس ہدف کے حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے، جو اسلام کا ان قوانین سے مقصود تھا۔

فرد اور جماعت کا تعاون زکوٰۃ کے نظام سے حاصل ہوتا ہے جس پر ہم تھوڑی دیر بعد گفتگو کریں گے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ معاصر معاشروں نے امداد باہمی کے احکام افراد کی اور ان کی جماعتوں کی طرف سے برسہا برس کے مطالبات اور ہڑتالوں وغیرہ کے بعد جاری کیے۔ اگر اشتراکی اور

Marfat.com

سرمایہ دارانہ نظاموں میں فکری اختلاف نہ ہوتا تو شاید افراد کو اس کی رعایتیں بھی نہ ملتیں اور شاید ان کا گلا ہی گھونٹ دیا جاتا، کیونکہ دونوں نظاموں پر مادّی چھاپ ہے اور دونوں کا طریق کار ایک ہی ہے۔ دونوں کا مقصود مادّی منفعت ہے اور ان کا رجحان انسانی مفادات کی نگہداشت سے بڑھ کر مادّی مفادات کے تحفظ کی طرف ہے۔[1] اس کے مقابلے میں اسلام اس اصول کو لوگوں کے مطالبے اور شور و غوغا کے بغیر ہی تسلیم کرتا ہے، بلکہ اسلام نے تو اسے ایک قسم کی عبادت کا درجہ دے دیا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ربّ کا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔

(۴) چوتھا فرق یہ ہے کہ معاصر نظام جب اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں تو ایک ایسا مادّی فریضہ بنا دیتے ہیں جس کی پابندی فرد، جماعت اور مختلف اقتصادی اداروں پر لازم ہے۔ جمہوری نظام میں حکومت اس اجتماعی رعایت پر اٹھنے والے اخراجات، ٹیکسوں اور بیمہ کی اقساط کے ذریعے پیشگی ہی وصول کر لیتی ہے۔ اشتراکی نظام میں ٹیکسوں اور بیمہ کی اقساط کے علاوہ، حکومت، محنت اور سرمائے دونوں کی بیک وقت مالک ہوتی ہے اور "حقِ خدمت" بہرصورت وصول کر لیتی ہے۔ دونوں نظاموں میں فرد کے لیے جماعت کی امداد اور جماعت کے لیے فرد کی امداد تعاون کی اساس نہیں بلکہ جو کچھ فرد طوعاً و کرہاً دے دے یا پیشگی کٹوا دے، وہی اس کی بنیاد ہے۔ اسلامی امدادِ باہمی کی بنیاد اس سرمائے پر ہے جو افراد برضا و رغبت یا خدا کے حکم سے دیتے ہیں اور حکومت اُسے صرف مستحقین پر خرچ کرتی ہے۔ وہ مال جو زکوٰۃ کی صورت میں جمع ہوتا ہے۔ (اور جو اسلام میں اجتماعی انصاف کی ریڑھ کی ہڈی ہے) اصل سرمایہ ہے، آمدنی نہیں جیسا کہ دوسرے ہم عصر نظاموں میں متصور ہوتا ہے۔ اس سے معاشرے کے تمام طبقوں کو مناسب مادّی زندگی گزارنے کے وسائل میسر آتے ہیں۔

(۵) ہم عصر نظام، افراد کی مادّی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے قانون کا سہارا لیتے ہیں، اسلام، قانون کے ساتھ ساتھ ضمیرِ انسانی کو بھی بیدار کرتا ہے اور اُمت کے افراد کو بے کس افراد کا خیال رکھنے اور فرائض ادا کرنے کا احساس دلاتا ہے، جس طرح مسلمانوں کے بیے دوسرے اہم معاملات میں اس کا طرزِ عمل ہے اس طرح اسلام چاہتا ہے کہ انفرادی احساس میں اضافہ ہو اور کسے یاد رہے کہ اس پر کیا کیا فرض ہے۔ اس طرح اسلام صدقہ اور خیرات کی طرف توجہ دلاتا ہے اور "انفاق فی سبیل اللہ" کو پسند کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا اجر ہے اور آخرت میں ثواب،

Marfat.com

اور اللہ کے عذاب اور غضب سے بچنے کی سبیل ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اجتناب نفس کو کئی آفات اور نقصانات میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔" (البقرۃ ۲: ۱۹۵)

اللہ کی راہ میں جو خرچ کیا جائے، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے دُگنا تگنا کردے گا:

"من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ ولہ اجر کریم" (الحدید ۵۷: ۱۱)

جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کا ثمرہ بہشت ہے:

"ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتاً من عند انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فآتت اکلھا ضعفین فان لم یصبھا وابل فطل، واللہ بما تعملون بصیر۔" (البقرہ ۲: ۲۶۵)

ان ثمرات کو قرآنِ مجید نے بڑی وضاحت اور دلالت سے بیان کیا ہے:

"مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم۔"

(البقرہ ۲: ۱۴۰)

اسلام میں اجتماعی انصاف کے حصول کے لیے زکوٰۃ سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دین کا ایک رُکن، اور ایمان کے فرائض میں سے ایک فرض بنایا ہے۔ صاحبِ نصاب افراد کے لیے یہ اللہ کا حق ہے، اور اس حق کا مطالبہ اسلامی مملکت شریعت کے حکم اور اپنی تمام طاقت سے کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر نماز کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

"واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین" (البقرہ ۲: ۴۳)

"فاقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ ھو مولاکم" (الحج ۲۲: ۷۸)

"الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ" (الحج ۲۲: ۴۱)

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہم ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ ایسی خدمات یا صدقہ نہیں جسے انسان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ مالدار کے مال پر حق ہے جس کا ادا کرنا فرض ہے اور امام پر

Marfat.com

واجب ہے کہ وہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرے۔ ایک حدیث میں جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ "جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی اور ابو بکرؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو عربوں میں سے کئی اسلام سے پھر گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہیں کہتے (یعنی مسلمان نہیں ہو جاتے) جس نے یہ کہہ دیا کہ اس کا مال اور جان محفوظ رہا باقی اس کا حساب کتاب اللہ تعالےٰ پر ہے۔" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جس نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ حق المال ہے۔ خدا کی قسم! اگر کسی نے ایک رسی تک دینے سے انکار کیا جو وہ رسول اللہؐ کو ادا کرتا تھا تو میں اس پر بھی جنگ سے گریز نہ کروں گا۔" خدا کی قسم! (ابو ہریرہؓ نے کہا) اللہ ہی نے ابو بکرؓ کا سینہ جنگ کے لیے کھول دیا تھا، تو میں جان گیا کہ یہی صحیح راستہ ہے۔"

بعض مصنفین نے اظہار کیا ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کو قرآن مجید میں صدقات میں سے ایک صدقہ کہا گیا ہے، اس لیے یہ احسان کی ایک قسم ہے، جو لازم نہیں اور لوگوں کو اس کا پابند بنانا درست نہیں۔ یہ رائے مسترد کیے جانے کے قابل ہے۔ یہ محض مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور مشرق کے اشتراکی نظام کی تقلید میں کہا جا رہا ہے، جو کلیسائی نظام اور فرون وسطےٰ کے قوانین پر چل رہے ہیں (زکوٰۃ کو "صدقہ" اس لیے کہا گیا کہ یہ بھی دوسرے مالی اخراجات کی طرح ہے، مگر قرآن نے خود ہی اسے خیرات وغیرہ سے الگ کر کے، فرض قرار دیا ہے) اس کا فرض ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد مسلمانوں نے جو پہلی جنگ لڑی وہ اُن عربوں کے خلاف تھی جنہوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کر دیا تھا (انہیں "حروبِ ردّہ" کہا جاتا ہے) اسلامی حکمرانوں نے اس شخص کے، جو کلمہ اور صلوٰۃ ترک کر دیتا ہے اور اس کے جو زکوٰۃ ترک کر دیتا ہے، مابین فرق کرنے سے انکار کر دیا۔

زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہم زکوٰۃ کے موٹے موٹے احکام پیش کر دیتے ہیں زکوٰۃ فریضۂ مالی ہے، اور بیشتر فقہا اس پر متفق ہیں کہ اسے مال کے مطابق عائد کیا جاتا ہے۔ یہ اس مال پر واجب ہے جو بڑھ رہا ہو یا بڑھنے کی اہلیت رکھتا ہو، اس لیے انسان کی

Marfat.com

اصلی ضرورتوں مثلاً ملبوسات، ذاتی جائے سکونت اور ذاتی سواری اس سے مستثنیٰ ہیں۔ عارضی یا کم مدت کے مال پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔ مالِ زکوٰۃ پر ایک سال گزرنا ضروری ہے اور یہ ایسا مال ہو جو ضرورت سے زائد اور سال کے آخر میں بچ گیا ہو۔ پھر ایک حد سے کم مال پر بھی زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ سادہ سا اصول یہ ہے کہ انسان حالتِ فقر سے حالتِ تونگری میں داخل ہو گیا ہو، تو وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہے۔

چار قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے: جانور، مثلاً اونٹ، گائے، بکری وغیرہ، زرعی ملکیت اور باغ، نقدی اور مالِ تجارت۔

جانوروں پر بھی زکوٰۃ سال گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے جبکہ وہ مقررہ نصاب کو پہنچ جائے (چالیس بھیڑ بکریوں سے کم، تیس گائے بیلوں سے کم اور پانچ اونٹوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں) اسی طرح نقدی پر بھی حدّ مقرر ہے (دو سو درہم یا بیس دینار چاندی مگر اس پر ایک سال گزرنا ضروری ہے۔ مالِ تجارت پر کل قیمت کا ½۲ فیصد زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر بھی ایک سال کی مدت کا پورا ہونا شرط ہے بعض فقہاء کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ نہیں، سوائے اس کے کہ وہ تجارت کے لیے ہوں۔ کھیتی باڑی اور باغات اگر چاہی زمین پر ہوں تو نصف عشر اور اگر بارانی ہوں تو عشر وصول کیا جائے گا۔

پہلے اسلامی معاشرے میں یہی چار اصناف مادّی ثروت تصور ہوتے تھے، کیونکہ دیہاتی ہو یا شہری معاشرہ، یہی ثروت کی بنیادی اقسام ہیں۔ جہاں تک صنعت کاری کا تعلق ہے تو یہ اس دور میں فروغ پا گئی ہے اور ان چار بنیادی اقسام پر انسانی اضافہ ہے، اور تجارت ہی سے مشابہ ہے۔ اس پر اٹھنے والے اخراجات، مزدوری، خام مال کی قیمت وغیرہ خارج کر کے، تیار شدہ مال کو تجارت کا مال فرض کر کے زکوٰۃ عائد کی جائے گی۔

زکوٰۃ کی معروف انواع میں اگر کسی نوع کا ذکر نہ ہو تو اُسے ان چاروں اصناف پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان گھوڑوں کو بھی مالِ زکوٰۃ میں شامل کر لیا تھا جو تجارت کے لیے رکھے جاتے تھے، اور امام احمد بن حنبلؒ نے مسکنی مکانوں کے سوا دوسرے مکانوں کو شامل کر لیا تھا۔ نئی چیزوں میں قیاس کرتے ہوئے کسی سبب یا علت کو دیکھا جائے گا، مثلاً کرنسی نوٹ، چاندی اور سونے ہی میں شمار ہوں گے، یا انشورنس جس کی قیمت کو مدِ نظر رکھا جائے گا۔ اسی طرح بنکوں وغیرہ

Marfat.com

کے حصص اور سرٹیفکیٹ وغیرہ ہوں گے۔

اس میں "فطرانہ" بھی شامل کر لینا چاہیئے جو ہر سال عید الفطر کے موقع پر ہر انسان لازماً ادا کرتا ہے اور سربراہ خاندان تمام افراد خانہ کی طرف سے دیتا ہے۔

زکوٰۃ ہر اس چیز پر عائد ہوگی جو انسان خود کماتا ہے یا کاروبار وغیرہ کے ذریعے جمع کرتا ہے اگر وہ صاحب نہیں تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا اور اگر سال کے بعد اس کے پاس زائد مال ہے تو اس پر دس فیصد سے لے کر ڈھائی فیصد تک وصول کیا جائے گا اگر اس کی وصولی اور تقسیم مناسب طریق پر ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرے سے تنگ دستی کا بھوت بھاگ جائے گا اور افراد کی طویل مدت کی یا فوری ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ زکوٰۃ کی شرح اور نصاب، جو بالعموم رائج ہے قلیل ترین شرح ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔ آیات قرآنی تو اشارہ کرتی ہیں کہ مسلمان کے مال پر اللہ کا حق اس سے بھی زیادہ ہے:

"لیس البر أن تولوا وجوھکم ...... واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ" (البقرہ ۲ : ۱۷۷)

اگر زکوٰۃ معاشرے کی حاجات کو پوری طرح روا کرنے کی ضمانت دینے سے قاصر ہو تو اضافی انفاق مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے۔

جہاں تک زکوٰۃ کے مصارف کا تعلق ہے تو قرآن مجید نے انہیں خود ہی مقرر فرما دیا ہے۔

"انما الصدقات للفقراء ...... واللہ علیمٌ حکیمٌ" (التوبۃ ۹ : ۶۰)

ان مصارف کو اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلامی معاشرے میں افراد کی ضروریات پورا کرنے کے ہدف پر ہیں: کھانے پینے کی اشیاء، مانگنے کی ذلت سے بچاؤ، انسان کی حیثیت بشری حاصل کرنے اور اسے تفویض دینے کے لیے ایک دوسرے کی مدد، معاشرے کی اعلیٰ اقدار کو زوال اور بے حسی کی نذر نہ ہونے دینا اور دشمنوں کو اسلامی معاشرے کی مائل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

فقراء اور مساکین، اور انہیں کی مانند ضعیف لوگ، بے روزگار، بیمار اور معذور اور حاجتمند غلام یا آج کے دور میں دوسری قوم کے زیر حکومت بسنے والے افراد، مقروض، جو کسی طرح قرض ادا نہ کر سکیں، مشکلات میں گرفتار لوگ وغیرہ کی امداد زکوٰۃ ہی سے کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تبلیغ دین، اسلامی اقدار کی حفاظت اور اسلامی معاشرے کا دفاع زکوٰۃ ہی سے ہو سکتا ہے

Marfat.com

ایسے مسافر جو سفر میں مالی پریشانی میں مبتلا ہوں، زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کی تالیف قلوب کے لیے بھی زکوٰۃ سے مالی مدد لی جا سکتی ہے۔

یاد رہے کہ زکوٰۃ کا استعمال تعلیم، صحت، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ جائز نہیں کہ یہ معاشرے کو دوسرے طریقوں سے سرانجام دینے چاہئیں اور ان کے لیے حکومت ٹیکس وغیرہ لگا سکتی ہے۔ یہ افراد اور معاشرے کی مادّی اور تہذیبی ضرورتیں ہیں، جبکہ زکوٰۃ کو معاشرے کی تقویت، انسانی تعلقات استوار کرنے اور ایک دوسرے سے بھائی چارہ اور تعاون بڑھانے میں استعمال کیا جاتا ہے، اور دونوں مقاصد کے حصول کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لیے زکوٰۃ، ارکانِ دین میں سے ہے اور دوسری تمام عبادات کی طرح ایک عبادت ہے۔[1]

حواشی

۱۔ سید قطب: "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" ص ۶۳، طبع ہشتم
۲۔ الدکتور محمد البہی: "الفکر الاسلامی و المجتمع المعاصر، مشکلات الأسرۃ والتکافل" ص ۳۴۵۔
۳۔ سید قطب: "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام"۔ ص ۸۳
۴۔ نیل الاوطار: ۴/ ۱۲۷
۵۔ محمد البہی: مرجع سابق، ص ۳۴۹
۶۔ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے فرائض پر بحث کے لیے دیکھئے: "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" از سید قطب اور سیاسۃ المال والحکم فی الاسلام از عبدالقادر عودہ

Marfat.com

عائلی نظام

خاندان ایک اجتماعی ادارہ ہے اور زندگی کی ضروریات اور انسانی فطرت سے جنم لیتا ہے جنس بشری کی بقا اور اجتماعی وجود کے دوام کے لیے یہ اہم ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ضرورت انسان کی فطرت ہی میں ودیعت کی ہے۔

دراصل خاندان ایک مرد اور ایک عورت کے یکجا ہونے، مستقل رفاقت پیدا ہونے اور مل جل کر رہنے کا نام ہے جسے معاشرہ سندِ قبول عطا کرتا ہے۔ انسانی تاریخ کا کوئی دور خاندان کے وجود سے خالی نہیں رہا اور زمین پر پہلے ہی بشری اجتماع سے وجود میں آگیا تھا۔ انسانی معاشرے میں اس کی مستقل حیثیت رہی ہے جبکہ دوسرے اجتماعی گروہ عارضی اور منتشر رہے ہیں اس پر درج ذیل عنوانات کے تحت بحث کی جاسکتی ہے:

۱۔ خاندان کا ارتقاء

۲۔ ازدواج اور اس کے فرائض

۳۔ اسلامی نظام میں خاندان کا قیام

Marfat.com

خاندان کا ارتقاء

اپنی ابتداء ہی سے، خاندان کئی مراحل سے گزرا اور اس میں کئی تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ یہ تبدیلیاں خود خاندان کے دائرے میں یا رشتہ داروں کے محور میں اور اس کے فرائض میں واقع ہوئیں ۔ جہاں تک خاندان کے اپنے ہی دائرے میں تبدیلیوں کا تعلق ہے تو اس کے بعض قدیمی نمونے آج بھی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے قبائل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نمایاں خاندان یہ ہے کہ قدیم خاندان میں افراد کی تعداد زیادہ ہوتی تھی ۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ خاندان کے سب افراد اور رشتہ دار ایک ہی بُت کی پوجا کرتے تھے یا ایک ہی دیوتا کو مانتے تھے جس سے ان میں ربط و اتصال پیدا ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے خاندان میں وسعت پیدا ہوتی تھی اور خاندان کا دائرہ وسیع ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہمیں یونان اور روم کے معاشرے نظر آتے ہیں جن میں خاندان کسی نسبت یا نسبتِ پدری کی بنیاد پر قائم ہوتے تھے اور افراد خانہ یا رشتہ دار اپنے میں سے کسی کو بزرگ مان لیتے تھے یا کسی کو باپ بنا لیتے تھے ۔

اسلام سے پہلے مغرب اس نظام سے قریب تھا اور اس کا احوال کسی کو لے پالک بنانے یا "ذات باہر" کرنے سے معلوم ہوتا ہے ۔ اس نظام کی وجہ سے خاندان کے افراد کم ہونے لگے، پھر جب اسلام آیا اور اس نے متبنّٰی بنانے، اپنی برادری میں شامل کرنے یا اس سے خارج کرنے سے منع کر دیا تو خاندان کا حلقہ مزید تنگ ہو گیا ۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنے باپ کے سوا، کسی اور سے نسبتِ پدری رکھنے سے منع فرما دیا:

"ادعوا لآباۂم" (الاحزاب ۳۳: ۵۱)

اس کی وجہ سے خاندان صرف ازدواج کے رشتے تک محدود ہو گیا ، اور یہی خاندان کی اصل بنیاد ہے جو زوجین اور ان کی اولاد (بالخصوص وہ صغر سن اور غیر شادی شدہ ہوں) پر مشتمل ہوں۔ بچوں کی کی شادی ہو جائے تو ان کا خاندان الگ قائم ہو جائے گا ۔

خاندان کے دائرے میں تبدیلیوں سے قرابت داری کے محور میں بھی تبدیلیاں آئیں پرانے زمانے میں کبھی بچوں کو کبھی باپ کو اور کبھی ماں کو کسی بُت وغیرہ سے نسبت دے دی جاتی تھی پھر ایک دور آیا کہ ماں، محورِ قرابت بن گئی ۔ کہا جاتا ہے کہ عائلی نظام میں یہ خاندان کی قدیم ترین

Marfat.com

قسم ہے۔ یہ وہ دور تھا جب لوگوں کا شکار کرنے اور پھل جمع کرنے پر گزارہ تھا۔ اس وقت ماں استقرار کی علامت تھی کیونکہ وہ ایک ہی جگہ رہتی تھی جبکہ باپ اکثر شکار وغیرہ کے لیے گھومتا پھرتا تھا

اس کے بعد وہ دور آیا جس میں باپ، سربراہ خاندان بنا اور اولاد باپ سے منسوب ہونے لگی۔ مادر سری نظام میں، خاندان بکھرا ہوا رہتا تھا، جبکہ پدر سری نظام میں وہ ایک جغرافیائی حدود میں پابند ہوگیا۔ یہ وہ دور تھا جب زراعت نے ترقی کی۔

اسلام میں ماں اور باپ دونوں ہی محور قرابت ہیں، اگرچہ ترجیح باپ کو ہے۔ یہ ترجیح نظام میراث، نان نفقہ اور خاندان کی ذمہ داریاں برداشت کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مغرب کے کئی طبقوں میں اب باپ اور ماں کی تفریق نہیں رہی اور خاندان میں سبھی اور ہیں اور ان کی اولاد ساری کی ساری اس سے چچا، ماموں، پھوپھی خالہ وغیرہ اور ان کی اولاد کی نسبت رفتہ رفتہ زائل ہوگئی ہے۔

جہاں تک خاندان کے فرائض کا تعلق ہے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ فرائض فراخی سے تنگدستی کی طرف تبدیل ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں خاندان تمام مشترکہ فرائض خواہ وہ دینی ہوں، اخلاقی ہوں، اقتصادی ہوں، سیاسی ہوں یا قانونی، ادا کرتا تھا۔ یونان و روم میں یہ فرائض خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری ہے جو بیک وقت قانون ساز بھی تھا اور منصف تھا اور قوت نافذہ کا مالک بھی۔ پھر کئی اسباب سے یہ ذمہ داریاں سکڑتی گئیں جن میں سب سے اہم مملکتوں کا قیام تھا اور رفتہ رفتہ تمام سیاسی، قانونی، تنقیدی، اقتصادی اور آخر میں تعلیمی اور تربیتی فرائض معاشرے نے سنبھال لیے۔ اگرچہ تربیت کے معاملے میں اب بھی خاندان کا اثر ہے، بلکہ بنیادی اثر اسی کا ہے کیونکہ گھر یا ابتدائی ماحول بچے کے ذہن پر گہرا ڈالتا ہے اور اس کی زندگی اور شخصیت اسی سے تشکیل پاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گھر میں بچے، افراد خانہ، بالخصوص والدین کی نقل کرتے ہیں، کیونکہ نقل کرنا، انسان کی جبلت میں ہے، اور یہی تقلید اکثر اوقات مستقل ہو جاتی ہے۔

ازدواج اور اس کے فرائض

ازدواج وہ رابطہ ہے جو کسی مرد اور عورت میں قائم ہو جاتا ہے، جسے معاشرہ قبول کرے اور اس کے لیے اصول وضع کرے۔ اکثر اوقات یہ نظام خالص معاشرتی بنیادوں پر استوار رہتا ہے اور

Marfat.com

اسے جبلی یا فطری امور سے تعلق نہیں ہوتا۔

ازدواج پر قیود

مختلف ادوار میں انسانی معاشروں نے وہ درجے مقرر کیے جن میں ازدواج مباح یا حرام ہے یہ پابندیاں اختلاف دین یا جنس یا معاشرتی اور خاندانی طبقات کی وجہ سے عائد ہوئیں۔

کئی مذاہب، غیر مذہب میں شادی کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے کسی مسلمان مرد کا مشرک عورت سے نکاح حرام قرار دیا اور اہل کتاب عورت سے مباح کہا، لیکن مسلمان عورت کے لیے مرد مشرک ہو یا اہل کتاب، دونوں سے نکاح حرام ہے۔

اختلاف جنس یا معاشرتی طبقات کے سبب یا اس اعتقاد کے باعث کہ بعض لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز سمجھتے ہیں، جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ بعض معاشروں میں انہیں سند قبول حاصل ہے۔ اسلام نے اس قسم کی پابندیوں کو نا روا قرار دیا اور اعلان کیا کہ بنی نوع انسان ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قریب ترین عزیزہ کی شادی اپنے غلام سے کروا دی جسے آپ ﷺ نے آزاد کر دیا تھا اور اسے خود ہی پالا تھا۔ بعض فقہا نے جو "کفو" (برابری) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ محض مصلحت کی خاطر ہے کیونکہ اگر میاں بیوی میں بہت بڑا تفاوت ہوگا تو جھگڑا پیدا ہوگا۔ یہ شرط اسی وقت ملحوظ رکھی جائے گی جب دولہا دلہن میں سے کوئی اس بناء پر شادی سے انکار کر دے۔ قرابت کی بنا پر جو پابندیاں ہیں وہ کئی معاشروں میں برقرار ہیں۔ مثلاً عیسائیوں، ہندوؤں میں بعض نزدیکی رشتہ داروں سے شادی ممنوع ہے۔

ابتدائی معاشروں میں بہت سے قریبی رشتہ داروں سے شادی مباح نہ تھی مگر رفتہ رفتہ یہ تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ اسلام نے چار انواع کی شادیوں کو حرام قرار دیا ہے۔

(۱) انسان کے باپ دادا اور ماں نانی کے نسبی رشتہ دار یعنی باپ کا باپ کا باپ وغیرہ اور ماں کی ماں کی وغیرہ سے نکاح حرام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

"حرمت علیکم امھاتکم" (النساء ۴ : ۲۳)

(۲) جس طرح اصول حرام ہیں، اسی طرح فروع حرام ہیں یعنی بیٹے اور بیٹیاں اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

Marfat.com

"وبناتکم" (النساء ۴: ۲۳)

(۳) والدین کے فروع جہاں تک جائیں یعنی بھائی، بہنیں اور ان کی اولاد جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا: واخواتکم وبنات الاخ وبنات الاخت" (النساء ۴: ۲۳)

(۴) دادا نانا کے فروع مثلاً چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ۔ ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے یہ اُن قیود کے علاوہ ہیں جو مصاہرت اور رضاعت سے پیدا ہوتی ہیں۔

ازدواج کی مختلف صورتیں

مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلقات کی کئی شکلیں ہیں۔

۱۔ اشتراکِ جنسی: اس شکل میں کسی معاشرے کی عورت، زوجیت کی پابندی کے بغیر، وہاں سب مردوں کی مشترکہ "ملکیت" ہوتی ہیں۔ عمرانیات کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ سب سے اولین نظامِ ازدواج تھا، مگر اسے کوئی نظام کہنا زیادتی ہوگی کیونکہ اس میں کوئی نظم وضبط اور پابندی نہ تھی۔

۲۔ باہمی ازدواج: اس میں کئی مرد مل کر بیک وقت کئی عورتوں سے رشتہ ازدواج قائم کر لیتے تھے، جو سب کی باہمی بیویاں ہوتی تھیں۔ اس سے بھائی بہنوں میں شادی، قریبی رشتہ داروں سے شادی اور ادل بدل کی شادی کرنے کے طریقے نکلے۔

۳۔ چند شوئی ازدواج: یعنی ایک عورت کے کئی شوہر ہوں۔ اس قسم کا نظام اسلام سے پہلے بھی تھا اور اب بھی کئی غیر مہذب قبائل میں ہے۔ اسلام نے اس کی قطعاً مخالفت کردی کہ اس سے نسل کا پتا نہیں چلتا اور نسب خلط ملط ہو جاتا ہے۔

۴۔ تعدد ازدواج: یہ نظام کئی معاشروں میں رائج ہے کہ ایک مرد کئی بیویاں رکھ سکتا ہے۔ قدیم معاشروں میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی اور بعض اوقات مطلقاً اور کبھی کبھی ضرورتاً کئی کئی شادیاں کرلی جاتی تھیں۔ اسلام نے بیویوں کی تعداد محدود کر کے چار کردی۔

۵۔ ایک شوہر ایک بیوی: یہ نظام بھی قدیم وجدید تمام معاشروں میں پایا جاتا تھا، بالخصوص مسیحی معاشرے میں۔ اسلام اس کا مخالف نہیں۔

Marfat.com

ازدواج کے طریقے

انسانی معاشروں میں قانونی شادی کے بالعموم تین طریقے رائج ہیں :

ا۔ طریقہ نکاح : یہ عام اور مقبول طریقہ ہے کہ کسی مرد اور عورت میں، معاشرے کے معینہ اصولوں کے مطابق، عقد کروا دیا جائے۔ اس میں بعض معاشرے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی پر زور دیتے ہیں اور بعض نکاح سے پہلے، منگیتروں کے ملنے جلنے کو بھی ناپسند نہیں کرتے۔ بعض معاشروں میں اس عقد کو پختہ کرنے کے لیے اہل دین کی اجازت لی جاتی ہے جیسا کہ بعض مسیحی فرقوں میں ہے یا ان طبقوں میں جہاں دنیاوی اور دینی معاملات الگ الگ ہیں بعض معاشروں میں نکاح اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا۔ جب تک دنیاوی ارباب اختیار یا عدالتیں اس کی تصدیق نہ کر دیں اور ایسے معاشروں میں اہل دین کی موافقت یا ناپسندیدگی کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ کچھ معاشرے ایسے ہیں جن میں دینی اور دنیاوی دونوں قوانین کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بالعموم اسلامی ممالک میں ہے، اگرچہ اسلام دونوں میں فرق نہیں کرتا اور اگر نکاح کی تمام ضروری شرائط پوری کر لی گئی ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نکاح کہاں پڑھ گیا اور کس نے پڑھایا۔ نکاح کی رجسٹریشن بھی جدید نظام نے عائد کی ہے۔ ورنہ صحت ازدواج کے لیے یہ ضروری شرط نہیں۔

۲۔ لونڈیاں اور غلام : اب یہ طریقہ یعنی بیوی "خریدنے" کا طریقہ دم توڑ چکا ہے اور غلامی کے نظام کے خاتمے سے اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ عصر حاضر کے معاشروں میں غلامی مباح نہیں رہی۔ اسلام اس بارے میں واضح موقف رکھتا ہے (کہ مخصوص حالات میں اس کی اجازت تھی) اور عملاً اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے پر زور دیا۔ اب شاید ہی کوئی اسلامی ملک ایسا ہو جہاں غلامی جائز ہو۔

۳۔ زبردستی قبضہ، لوٹ مار کا یہ طریقہ اب تقریباً ناپید ہو گیا ہے اور غلامی کے دور میں اس کا رواج زیادہ تھا۔ دراصل اس کے رواج کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض معاشرے (جو اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز تصور کرتے تھے) بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے تھے، اور ایسے معاشرے کے مرد مجبوراً دوسرے علاقوں سے لڑکیاں اٹھوا لیتے تھے۔

Marfat.com

ازدواج سے متعلقہ حقوق و فرائض

شادی ایک معاہدہ ہے، اور ہر معاہدے کی طرح اس میں بھی فریقین کے حقوق و فرائض ہیں مثلاً:

۱۔ حق مہر: شوہر کے لیے واجب ہے کہ وہ بیوی کو متفقہ رقم بطور مہر ادا کرے، جیسا کہ موجودہ اسلامی نظام میں ہے، یا جیسے کہ گزشتہ زمانے میں رومی قانون اور کلیسائی نظام میں تھا عورت مرد کو رقم ادا کرتی تھی، مگر بعد دیوانی قوانین نے اسے منسوخ کر دیا۔

۲۔ نان نفقہ: اسلامی نظام کے مطابق، ہر شوہر کا فرض ہے کہ خاندان کو نان نفقہ مہیا کرے اور اگر بیوی مالدار بھی ہو تو اسے گھر کا خرچ برداشت کرنے یا اس میں مشارکت پہ مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے معاشرے جہاں میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں، مشارکت کا اصول اپنائے ہوئے ہیں

۳۔ خاندان کی سربراہی: ہر معاشرے کی طرح، خاندان کا سربراہ ہونا بھی لازمی ہے۔ اسلامی نظام کے مطابق، شوہر خاندان کا سربراہ ہوتا ہے، اور اس میں بیوی کے حقوق میں، یا اس کی شخصیت اور عزت میں کوئی کمی مقصود نہیں۔ اسلام میں عورت ذی مرتبہ اور محترم ہے اور کسی اور معاشرے کی عورت کے مقابلے میں زیادہ حقوق حاصل ہیں، مگر فطرتاً شوہر کا کام زیادہ ہوتا ہے اور خاندان کے مفادات کی نگہداشت کا فرض وہ بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے اور یہ فرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام اس کو جواب دہ بھی قرار دیتا ہے۔

۴۔ تربیت اولاد: میاں بیوی دونوں کا فرض ہے کہ وہ اولاد کی تربیت کی نگرانی کریں۔ یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں۔ مدارس میں تعلیم دلوانے کے باوجود، خاندان کا تربیت کا فرض کم نہیں ہوتا۔

۵۔ عقد نکاح کا احترام۔ میاں بیوی دونوں پر لازم ہے کہ وہ عقد نکاح کا احترام اور التزام کریں۔ اگر ان میں سے نکاح فسخ کر دیا جاتا ہے، کئی معاشرے ایسے ہیں کہ جہاں اس قسم کی خیانت کی پروا نہیں کی جاتی۔ عیسائیوں کے فرقوں میں، دینی ارباب اختیار (پوپ، پادری وغیرہ) کی اجازت کے بغیر نکاح قطعاً فسخ نہیں کیا جا سکتا۔ چند اور فرقے (پروٹسٹنٹ) اس کی دیوانی قوانین کے مطابق اجازت دے دیتے ہیں۔

Marfat.com

اسلام میں خاندان

اسلام نے خاندان پر خاص توجہ دی ہے اور اسے معاشرے کی اساس بتایا ہے۔ اسی لیے اسلام نے شادی پر زور دیا ہے۔ اس کے بارے میں شریعت میں متعدد نصوص وارد ہوئی ہیں جس میں شادی کی ترغیب دی گئی ہے اور جوانوں کو شادی کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسلام نے رہبانیت اور "چھڑے پن" کو پسند نہیں کیا۔ سنن ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ 'تم میں سے جسے گھر بسانے کی استطاعت ہو اُسے شادی کر لینا چاہیے کیونکہ اسی سے آنکھ نیچی رہتی ہے اور شرم گاہ کی حفاظت ہو سکتی ہے اور جو تم میں سے اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ روزے رکھے کہ اس کی شہوت کو بھسم کر دے'۔" مستدرک حاکم میں آیا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو مردوں کے لیے بہترین ہے یہ نیک عورت ہے کہ جب وہ اسے دیکھے تو خوش ہو جائے، جب وہ اس سے دور ہو تو وہ (اس کے لیے) اپنی (عصمت کی) حفاظت کرے اور جب اسے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے'۔"

شریعت نے اسی راہ کو اپنایا ہے جس سے وجود میں نرمی اور ملائمت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی زندگی گزارنے آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ بھی مہذب ہوتا ہے اور خاندان بھی بلندیوں تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

عملی تجربوں نے ثابت کیا ہے کہ جو بچے والدین کے درمیان رہتے ہیں ان بچوں کی نسبت جو یتیم خانے وغیرہ میں پرورش پاتے ہیں، جسم اور عقل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط اور زیادہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس مسئلے کے مطالعے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے کیونکہ بے شمار لاوارث بچے ملے جنہیں یتیم خانوں نے پناہ دی۔ اس سلسلے میں انا فرائیڈ نے ایک کتاب بعنوان "بلا خاندان بچے" لکھی جس میں وضاحت سے بیان کیا کہ جو بچے اپنے خاندان میں پلتے ہیں وہ بالعموم بات چیت، اطاعت اور تعلیم میں فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے مضبوط خاندان کے قیام پر زور دیا ہے اور مسلمانوں کو حسبِ استطاعت شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

Marfat.com

اس مضبوط خاندان کے قیام کو یقینی بناتے کے لیے اسلام نے اور مسلمان فقہاء نے تفصیلی احکام مدوّن کیے ہیں جو شادی کی ضروری شرائط سے لے کر اس کے اثرات کی وضاحت تک پر حاوی ہیں ان میں وہ حقوق و فرائض بھی شامل ہیں جو نسب، میراث اور نان نفقے سے تعلق رکھتے ہیں، اور شادی کے معاہدے کے اختتام (طلاق و خلع) اور اس کے نتائج تک وضاحت کی ہے

اسلام نظام میں شادی کے بارے میں شبہات کا ازالہ

ا۔ تعداد ازدواج: شریعت نے مرد کو ایک سے چار تک کی شادی کی اجازت دی ہے۔ اس "اجازت" سے اسلام کے دشمنوں نے طرح طرح کے الزامات تراشے ہیں۔ اس بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

(ا) اجازت کے معنی حکم نہیں ہوتا۔ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دیتے ہوئے اس کا قطعی حکم نہیں دیا بلکہ اسے مشروع اس خیال سے کیا کہ اُسے انسانی فطرت کا لحاظ تھا اور وہ کئی معاشرتی مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا جو مطلق تحریم یا پابندی سے پیدا ہو سکتے تھے۔

(ب) اسلام نے یہ شرط عائد کی ہے کہ نان نفقے کے معاملے میں بیویوں میں عدل ضروری ہے۔ جو شخص عدل نہیں کر سکتا یا اپنی ازواج میں امتیاز کرنے پر مجبور ہے تو وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر کے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

(ج) مرد کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنی ازواج اور ان کی اولاد سے یکساں سلوک کرے اور ایک جیسا خرچ مہیا کرے۔ رسول اللہ ؐ نے جب "استطاعت" کا لفظ استعمال فرمایا تو اس کا مفہوم یہی تھا کہ بدنی اور مالی استطاعت رکھتا ہو۔

(د) یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام سے قبل، تعدد ازدواج معروف نظام تھا اور بعض معاشرے بلا قید و شرط تعداد کی اجازت دیتے تھے۔ اسلام نے اسے چار تک محدود کر دیا اور اس کے ساتھ عدل اور اخراجات کی قدرت کی شرط عائد کر دی۔

اسلام کی اس اجازت سے کوئی اسباب کا مداوا ہو گیا، مثلاً:

ہو سکتا ہے بیوی بانجھ ہو اور مرد اولاد اور وارث کی خواہش رکھتا ہو۔ اگر تعداد ازدواج کی اجازت نہ ہو تو ایسی صورت میں مرد کے لیے ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ وہ اس بیوی کو

Marfat.com

طلاق دے دے اور دوسری شادی کر کے اولاد کی خواہش پوری کر ے ، طلاق لے کر الگ ہو جانے اور دوسری شادی کر کے اولاد کی خواہش پوری کر ے ، طلاق لے کر الگ ہو جانے اور تکلیف دہ زندگی گزارنے سے عورت کے لیے کہیں بہتر ہے کہ وہ سوکن کے باوجود اپنے گھر میں، اپنے شوہر کے ساتھ رہے ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی بیمار رہو اور فرائض زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہو ۔ ایسی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کی نگرانی میں رہنا، اور سوکن پر راضی ہو جانا ، اس کے لیے زیادہ محفوظ اور اطمینان بخش ہو گا ۔

بعض اوقات تعداد سے کسی سابقہ غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے جس میں کسی مرد اور عورت کے مابین غیر قانونی تعلقات ہو گئے ہوں ۔ ایسے معاملے میں عورت ہی قابو آ جاتی ہے اور اس کی عزت اور شہرت خطرے میں پڑ جاتی ہے ۔ ایسی صورت حال کا مداوا یہی ہے کہ وہ مرد اسی عورت سے شادی کر لے خواہ وہ اس سے پہلے شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو ۔ تعدد ازدواج اس غلطی اور نقصان سے محفوظ رکھتا ہے ، یا شادی نہ ہو تو یہ نقصان زیادہ شدید ہو سکتا ہے ۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ جنگ وغیرہ میں مردوں کی کثیر تعداد کام آ جائے اور " ایک مرد ، ایک عورت " کا اصول قائم نہ رہ سکے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی ملکوں میں ایسا ہوا ۔ اس سے واضح ہوا کہ ایسی حالت میں معاشرے کو یکجا رکھنے اور مرد اور عورت میں قانونی تعلقات برقرار رکھنے کے لیے تعدد ازدواج ضروری ہے ، اور اسی کے باعث کوئی قوم اپنی بشری مرتبے کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے ۔

یہ تماماً و کمالاً ساری وجوہ نہیں ، یہ تو محض چند مثالیں ہیں جن سے تعدد کی ضرورت اور اجازت واضح ہوتی ہے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ تعداد ازدواج پر پابندی ، خود عورت کے لیے مضر ہے ۔ جو شخص اس کے برعکس کہتا ہے وہ صرف ظاہری بات کو دیکھتا ہے اور چند عورتوں کے دردناک قصوں سے غلط نتیجہ اخذ کر کے تمام عورتوں کے حقیقی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے ۔

۲ ۔ طلاق

یہ بھی ان موضوعات میں سے ہے جن پر بہت کچھ کہا گیا ہے ۔ چونکہ اسلام نے طلاق کو مباح

Marfat.com

قرار دیا ہے اس لیے اسلام کے بعض دشمنوں نے اس کو اسلام پر اعتراضات کا ہدف بنایا ہے ان کے خیال میں یہ اسلامی ملک میں نوجوانوں کی بے راہ روی کا سب سے بڑا سبب ہے اور وہاں کے معاشروں میں لوٹ پھوٹ اور افراتفری اسی کی وجہ سے ہے۔ ان کے نزدیک طلاق کی اجازت عورتوں کے حقوق کی پامالی اور ان کے شرف و کرامت اور انسانیت کی بناہی ہے۔

اس کے جواب میں بہت کچھ جاسکتا ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ طلاق کا رواج اسلام سے پہلے بھی تھا اور بعد میں بھی جاری رہا۔ اسلام نے اس کی اجازت دے کر اس رواج کی کئی خرابیوں کو دور کیا اور اس کو بعض معاشرتی پیچیدگیاں دور کرنے کے لیے ایسی حلال چیز قرار دیا جس کے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ جو مسیحی اور مغربی لوگ اسلام میں طلاق کی اجازت پر تنقید کرتے ہیں جانتے ہیں کہ تمام عیسائی مملکتیں بھی آج طلاق کے قوانین نافذ کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ کلیسائی نظام اس کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیتا تھا اور اگر زوجین میں سے کوئی بے وفائی کا مرتکب بھی ہوتا تو اسے طلاق کے لیے کافی جواز نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے زوجین میں، طلاق کی اجازت کے بغیر محض "جسمانی جدائی" کر دی جاتی تھی۔ اب ان ملکوں میں طلاق کی اجازت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام انسانی طبائع سے خوب واقف تھا اور اسے خوب معلوم تھا کہ اسی بشریت کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن کے حل کرنے کا یہ ایک معقول طریقہ ہے۔

۳۔ اسلام نے طلاق کی اجازت دیتے ہوئے اسے ازدواجی مسائل کا واحد حل قرار نہیں دیا، بلکہ رسول کریم ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا اور اسے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند کیا۔ قرآن مجید نے ازدواجی مسائل کو بالعموم صلح اور افہام و تفہیم سے حل کرنے کا مشورہ دیا، اور طلاق کی اجازت دیتے ہوئے، اور اسے آخری چارۂ کار سمجھتے ہوئے بھی میاں بیوی کو غور و فکر کی مہلت دی، پھر طلاق کو "رجعی" کہا جس کے ذریعے مرد کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بغیر عقد جدید یا مہر جدید، پھر رجوع کر سکتا ہے اور تعلقات زن و شوئی بحال کر سکتا ہے اسی طرح فقہا کی ایک جماعت کے نزدیک حیض کے دنوں میں طلاق واقع نہیں ہوتی اور نہ اس "طہر" (حیض کے بعد پاکیزگی) کے دنوں میں واقع ہوتی ہے جس سے زوجین نے وظیفۂ زوجیت ادا کیا ہو۔ یہ سب اس بات کی کوشش ہے کہ زوجین اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور درد سر سے بچ جائیں۔

Marfat.com

۴۔ یہ کہنا کہ بعض اسلامی ممالک میں طلاق، نوجوانوں میں بے راہ روی کا باعث ہے بلا دلیل ہے طلاق کے بارے میں اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ بالعموم طلاق حاصل کرنے کی کوشش کے واقعات پہلے ہی سال میں پیش آتے ہیں اور اس کا سبب اکثر حالات میں شادی کرنے سے پہلے چھان پھٹک کا نہ ہونا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق دینے سے منع کر دینا یا اس پر پابندی لگا دینا زوجین میں سے کسی کے مفاد میں نہیں ہو سکتا اور میاں بیوی کا یکجا رہنا گھر کو جہنم بنا دے گا۔ یہ بات بھی کہ طلاق معاشرے میں انتشار اور فساد کا باعث ہے، بڑا لمبا چوڑا دعویٰ ہے جس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، جو ان مدعیوں کے پاس نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاس وہ مبالغہ آمیز یا غلط اعداد و شمار ہیں جن میں طلاق رجعی کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اعداد و شمار تو یہ بتاتے ہیں کہ جب بھی خاندان کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، طلاق کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ۷۷ فیصد طلاق کے واقعات کسی بچے کی بھی پیدائش سے پہلے ہوتے ہیں۔ اور ۱۷ فیصد ایک بچے کی پیدائش کے بعد، اور اسی لحاظ سے خاندان کے بڑھنے پر طلاق کے واقعات کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

گویا اسلام نے طلاق کی صرف ان حالات میں مباح کہا ہے۔ جب ازدواجی زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے۔ اسلام اس معالج کی طرح ہے جو جسم کی سلامتی کے لیے مجبوراً کسی عضو کو کاٹ دیتا ہے۔

عورت کی حیثیت

مغرب میں اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کا مرتبہ کم کر دیا ہے اس کے حقوق نہ دیئے اور اسے مرد کے مساوی درجہ بھی نہ دیا۔

دراصل یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے اور معاملہ دراصل اس کے برعکس ہے اسلام ہی نے عورت کو عزت بخشی، اس کا مرتبہ بلند کیا اور اسے وہ حقوق عطا کیے جو مغرب کی عورت کو اب تک حاصل نہیں۔ اگر ہم اسلام سے قبل عورت کی حالت پر نظر ڈالیں تو دکھائی دیتا ہے کہ محرف یہودیت حوا کو، اور ان کے سبب عورت کو، انسانی بدبختی کا عام سبب قرار دیتی تھی کیونکہ ان کے خیال میں اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اور بنی نوع انسان کو ہمیشہ کے لیے رنج و تعذیب کے حوالے کر دیا اسی لیے یہودیت میں عورت اس وقت وارث نہیں ہوتی جب اس کا کوئی بھائی ہو

Marfat.com

مسیحیت نے بھی یہودیت کے اسی نظریے کو اپنایا اور عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ تک مسیحی معاشرے اس بحث میں الجھے ہوتے تھے کہ عورت "انسان" ہی ہے یا نہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک عورت "سورگ" (جنت) میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ناپاک مخلوق ہے، گھٹیا ہے، حقیر ہے جسے کوئی حق حاصل نہیں۔ اسی لیے ان میں "ستی" کی رسم رائج تھی کہ شوہر کے مرتے ہی عورت بھی اس کے ساتھ جل کر راکھ ہو جاتی۔ برطانوی حکمرانوں کو اس قبیح عادت کے ختم کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔

رومیوں کے قانون میں عورت نااہل سمجھی جاتی تھی۔ اور صغر سنی یا دیوانگی کی طرح، عورت ہونا بھی معاشرتی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دیتا تھا۔

اسلام سے قبل بعض عرب معاشروں میں، عورت کو شمار قطار میں سمجھا نہ جاتا تھا مگر اپنے ہمعصر معاشروں سے مختلف سلوک نہ ہوتا تھا۔ بعض عرب قبائل بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہ تھا، بلکہ مال اسباب کی طرح خود اُسے میراث میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب باپ مر جاتا تو بیٹے اس کی زوجات کے بھی وارث بن جاتے تھے۔ عام طور پر لڑائی اور لوٹ مار کا ایک عام سبب، اس زمانے میں، عورت کی ذات ہی ہوتی تھی۔ اس طرح مرد کو "اجازت" تھی کہ وہ بلا حد و حساب جتنی عورتوں کو چاہے، عقد میں لے آئے۔

اسلام نے آکر پہلے تو یہ اعلان کیا کہ مرد و عورت میں انسانیت کے لحاظ سے مکمل مساوات ہے کیونکہ تخلیق میں مذکر و مؤنث دونوں کا عمل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عورت، مرد کا حصہ ہے:

خلقکم من نفس واحدۃ وخلق ... وجھا (النساء ۴: ۱)

قرآنِ کریم نے مسلسل مرد و عورت دونوں کو ذمہ داریوں اور ثوابِ عمل میں برقرار رکھا ہے:

فاستجاب لھم ربھم انی لا ... عمل عامل منکم من ذکرٍ او انثیٰ بعضکم من بعض"۔ (آل عمران ۳: ۱۹۵)

اور پھر

"المسلمین والمسلمات"، "القانتین والقانتات" (الاحزاب ۳۳: ۳۵) کی تراکیب کا اعادہ کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم، مرد و عورت میں انسانی مساوات کی

Marfat.com

تاکید کرتا ہے، دو انحالیکہ اس دور میں بے شمار معاشرے ایسے تھے جو اس مساوات کے نام تک سے آشنا نہ تھے۔

اسلام نے اس ظلم کا بھی خاتمہ کر دیا جو عورت پر دورِ جاہلیت میں توڑا جاتا تھا۔ اس نے بچیوں کو زندہ گاڑنے کو ممنوع قرار دیا اور بے حساب تعدد ازدواج کو بھی روک دیا۔ اسلام نے عورتوں کی لوٹ مار کو بھی بند کر دیا اور اسی طرح اُسے مال اسباب کی طرح وراثت میں تقسیم کیے جانے سے بھی منع کر دیا۔ اسلام نے عورت کو میراث میں مرد کے برابر بنایا سوائے اس کے کہ اس کا حصہ نصف مقرر کیا کیونکہ مرد کو اسلامی معاشرے میں سارا مالی بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور عورت پر ایسا کوئی بوجھ یا ذمہ داری نہیں۔

اسلام نے عورت کو پورے پورے جدید حقوق عطا کئے۔ مثلاً اپنے مال میں تصرف واختیار مال کا ہبہ اور بیع وشراء اور اس کے اس مال پر کسی مرد کا حق، حتیٰ کہ اس کے شوہر کا حق بھی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جس کو یورپ کے قوانین نے آج بھی عورت کو نہیں دیا۔ ۱۹۳۹ء تک فرانسیسی قوانین کسی عورت کو اس کے شوہر کی اجازت یا رضامندی کے بغیر اپنے مال میں تصرف کا کوئی حق نہیں دیتا تھا۔ پھر اس قانون کو بدل دیا گیا اور عورت کو اس حق کے استعمال کی چند قیود کے ساتھ اجازت دے دی گئی۔ جرمنی میں تو عورت کو یہ حق ۱۹۵۷ء میں دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی وصیت فرمائی کہ وہ مردوں کی نصف بہتر ہیں، اور ماں کے ساتھ حسنِ سلوک ہر قسم کی نیکی سے بڑھ کر ہے حتیٰ کہ باپ کا بھی وہ حق نہیں۔ آپ ﷺ نے اس حق کی اپنے خطبۃ الوداع میں تاکید فرمائی۔

اگر اسلام مرد اور عورت میں معاشرتی امور کی تقسیم کی ہے تو وہ دونوں کی طبیعی مناسبت سے کی ہے، اس سے ان کے رتبۂ بشریت میں کوئی فرق واضح نہیں ہوتا، اور اس تقسیم کار سے معاشرہ بحسن وخوبی چلتا ہے۔ یہ تقسیم کار اس نوعیت کی ہے جیسے زندگی کے دوسرے امور میں کسی خصوصیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ عورت جو امور سرانجام دے سکتی ہے، بلکہ بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے۔ وہ عورت کی بساط سے باہر ہیں۔ مثلاً کسی مملکت کی سربراہی۔ احادیث میں آیا ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاتی جو اپنے امور کسی عورت کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ عورت اپنی تانیث کے سبب اُن امورِ مملکت کو بجالانے سے قاصر رہتی ہے جو صحیح احکام یا رائے سلیمہ کے متقاضی ہوتے

Marfat.com

ہیں انہی میں سیاسی امور میں مشارکت بھی ہے کیونکہ ان میں مرد و زن میں اختلاط کا احتمال ہے۔ جس کی توثیق اسلام نہیں کرتا۔

تعلیم بنات یا عورتوں کے علاج معالجے یا ایسے امور میں جو عورتوں کے مفاد میں ہوں یا معاشرے کے مفاد میں، اسلام عورتوں کی مشارکت کی اجازت دیتا ہے کیونکہ یہ اسلام کی روح سے متعارض نہیں۔

اسلام میں حقوقِ زوجیت

اسلام میں یہ حقوق تین قسم کے ہیں:

۱۔ وہ حقوق جو دونوں میں مشترک ہیں۔

۲۔ شوہر کے بیوی پر حقوق۔

۳۔ بیوی کے شوہر پر حقوق۔

مشترک حقوق میں سب سے بنیادی حق تو ازدواجی زندگی گزارنا ہے۔ پھر مصاہرت کی حرمت ہے یعنی مرد کے لیے عورت کے اصل اور فرع (ماں بیٹیاں وغیرہ) دونوں حرام ہیں، اسی لیے عورت کے لیے مرد کے اصل اور فرع (باپ، بیٹا وغیرہ) دونوں حرام ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں سے ایک انتقال کر جائے تو دوسرا اس کے مال کا وارث ہوتا ہے۔

شوہر کے بیوی پر جو حقوق ہیں اُن میں حق اطاعت سرِ فہرست ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے گھر میں قیام کرے اور شوہر کی اجازت کے بغیر باہر قدم نہ رکھے۔ علماء نے اس بارے میں تفصیل بیان کی ہے۔ عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کے نسب کی، اپنی اولاد میں، حفاظت کرے۔

بیوی کے شوہر پر جو حقوق ہیں ان میں اوّل حق مہر ہے۔ یہ ایک لحاظ سے شوہر کی طرف سے بیوی کو ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے امداد ہے۔ پھر بیوی کا حق نفقہ ہے کہ شوہر اس کا خرچ برداشت کرے۔ اگر عورت کا فرض ہے کہ وہ گھر کی نگہداشت اور اولاد کی پرورش کرے۔ تو مرد کا فرض ہے کہ وہ مالی بوجھ اٹھائے۔ عورت کو انصاف کا بھی حق حاصل ہے۔ یعنی مرد کا فرض ہے

Marfat.com

ہے کہ اُس سے حسنِ سلوک کرے اور اُسے قول یا فعل سے ایذا نہ پہنچائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہے۔ تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے اچھا ہے اور میں اپنے اہل وعیال کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔"

Marfat.com

فرد اور معاشرہ

عمرانیات میں فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق اساسی موضوع ہے۔ اس تعلق کی حقیقت کا علم ایسا ہے کہ اس سے عالم نفس بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس تعلق کو سنوارنا اور نکھارنا مختلف ادیان، فلسفوں اور مختلف نظاموں کا بہت بڑا ہدف رہا ہے۔

اس تعلق کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ علمائے عمرانیات اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ فرد اور معاشرے میں سے پہلے کون تھا۔ ان کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ معاشرہ اپنے وجود میں بنیادی ہے جس کا ظہور بعد میں ہوا اور فرد صرف معاشرے کا جزو ہے بلکہ اس کے جاندار عناصر میں سے ایک عنصر ہے۔

اس نظریے پر قدیم اور جدید، دونوں فلاسفہ کی بڑی تعداد متفق ہے۔ اسلامی نظریہ بھی یہی ہے کہ معاشرہ دنیا میں پہلے وجود میں آیا، گو بظاہر بعد میں قائم ہوا، اور اس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کے "اہل و عیال" کو زمین کی سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا:

قلنا اھبطوا منھا جمیعاً فإما یأتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ ۲ : ۳۸)

زمین پر جو زندگی شروع ہوئی وہ انسانی معاشرے ہی کی شکل میں تھی، جس میں کم از کم ایک مرد اور ایک عورت شامل تھے۔

Marfat.com

جس طرح معاشرے کی ابتداء کے بارے میں اختلافِ رائے ہے، اسی طرح معاشرتی تنظیم کے بارے میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک، خاندان معاشرے کا پہلا خلیہ تھا، اور اس کی دلیل میں وہ ان ابتدائی خاندانوں کو پیش کرتے ہیں جن کے آثار اب بھی افریقہ میں باقی ہیں اور اس کا ثبوت بعض ابتدائی معاشروں میں اپنے آبا و اجداد کی تقدیس سے ملتا ہے۔ دوسرے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ معاشرہ، سب سے پہلے قبیلے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قبیلہ افراد کا وہ مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے بعض مشترک روابط رکھتے ہیں مثلاً ایک ہی نسل سے تعلق یا ایک ہی خطۂ ارضی پر سکونت۔ ان کی رائے میں، خاندان، طرزِ زندگی مستقل ہونے کے بعد، وجود میں آیا اور یہ استقرار انسان کو اس کے ابتدائی دور میں حاصل نہ تھا۔

لیکن معاشرہ ہے کیا؟ کیا یہ محض منفرق افراد کا مجموعہ ہے، یا یہ منظم اجتماعِ بشری ہے جسے سوچ سمجھ کر اور بالارادہ قائم کیا گیا اور اس کے اصول و ضوابط، جماعت کے شعور، عقائد اور رسوم کے مطابق طے کئے گئے۔ معاشرے کی تعریف خواہ کچھ بھی ہو، یہ محض کسی خاص زمان و مکان میں افراد کا اجتماع نہیں، بلکہ افراد کا کسی معاشرے میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس میں افراد کی موجودہ ضرورتوں اور مستقبل کے مطمحِ نظر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ معاشرتی، اجتماع، حسابی مرکب نہیں بلکہ کیمیاوی مرکب ہے، جس میں مختلف عناصر مل کر ایک نیا وجود بناتے ہیں، جس میں اصل عناصر کی صفات معدوم ہوتی ہیں، جس طرح پانی کہ دو گیسوں —— ہائیڈروجن اور آکسیجن —— سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ معاشروں کے اپنے نظام میں، اپنے نصب العین کی وجہ سے، بہت اختلاف ہو سکتا ہے یا ان افراد کی آراء کی وجہ سے اختلاف ہو سکتا ہے جو اسے ترکیب دیتے ہیں۔

فرد اور معاشرہ میں تعلق کو دونوں کی اپنی اپنی اہمیت اور اپنے اپنے دائرے کار کی نسبت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، عصرِ حاضر کے فلسفے اور نظام، فرد اور معاشرے کو ایک دوسرے کی ضد یا ایک دوسرے کے مخالف قرار دیتے ہیں۔ اس "جھگڑے" کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ بعض فلسفے اور نظام، معاشرے کو غالب فریق گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل "چیز" معاشرہ ہے اور انسان کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرد کی حیثیت اس میں معکوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ فلسفے فرد کی ذاتی حیثیت کی نفی کرتے ہیں اور معاشرے کی مقابلے انسان کی شخصیت کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ معاشرہ ہی سب افراد میں ربط ضبط پیدا کرتا

Marfat.com

ہے اور ان کی چھوٹی بڑی سب ضرورتیں پوری کرتا ہے

اس نظریے کے مقابلے میں دوسرے فلسفے اور نظام، فرد کو فریق غالب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاشرہ، افراد ہی سے بنتا ہے اور ان کے بغیر اس کا کوئی وجود نہیں۔ انفرادی کاوشوں کا تمام مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے، اسی لیے معاشرہ، فرد کے گرد گھومتا ہے اور اس کی سرگرمیوں پر پابندیاں ناگوار سمجھتا ہے، اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کرنے سے روک نہیں سکتا۔

اسلام فرد اور معاشرے کے مابین اس جھگڑے کی تائید نہیں کرتا اور نہ ان دونوں کے مفادات کو ایک دوسرے سے متعارض سمجھتا ہے۔ انفرادی سرگرمیاں ہوں یا اجتماعی، دونوں ایک دوسرے پر انحصار کرتے تھے اور دونوں ہی انسانی فطرت کے لیے ضروری ہیں۔ اسلام نے واضح طور پر فرد کو بھی بعض معاملات میں ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس نے فرد کو مستقل شخصیت عطا کی ہے اور اُسے ہر وہ حق دیا ہے جو اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے :

بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ (القیامۃ ۷۵: ۱۴) یا

وأن لیس للانسان إلا ما سعیٰ (النجم ۵۳ : ۳۹)

اسلام نے فرد کی ذات پر کچھ مخصوص فرائض بھی عائد کیے ہیں اور اُسے بعض امور میں معاشرے کے ساتھ مشترکہ طور پر ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور اسی طرح معاشرے کو فرد کے معاملے میں ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں قرآنِ مجید کی مجیدہ آیات ہیں جن میں تعاون اور عملِ مشترک کی ترغیب دی گئی ہے، اور احادیثِ رسول ﷺ بھی اس بات پر اُکساتی ہیں :

"والعصر۔ ان الانسان لفی خسر، الا الذین آمنو وعملوا الصالحت
وتواصوبالحق وتواصوبالصبر"۔ (العصر ۱۰۳ : ۱-۳)

اور

وتعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان"۔ (المائدہ ۵:۲)

اسی طرح رسول کریم ﷺ سے مروی ہے :

"مومن ایک دوسرے سے محبت رکھنے اور ہمدردی کرنے میں ایسے ہیں جیسے کوئی جسم اگر اس کا کوئی عضو شاکی ہو تو اس کے تمام اعضاء بخار اور شب بیداری کی شکایت

Marfat.com

کرتے ہیں۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر ایک اپنے گلّے (رعیت) کا جواب دہ ہے۔"

حضورؐ نے مشترکہ جواب دہی کو نہایت بلیغ اور مؤثر پیرائے میں بیان فرمایا:

"جو شخص حدود اللہ پر قائم رہتا ہے اور جو ان کے اندر رہتا ہے ان کی مثال ایسی قوم کی طرح ہے جو کشتی میں سوار ہوئے تو بعض کو نچلے حصے میں اور بعض کو اوپر کے حصے میں جگہ ملی۔ نچلے حصے والے لوگ پانی مانگنے اوپر والوں کے پاس جاتے اور کہتے: ہم چاہیں تو اوپر والوں کو نقصان پہنچائے کے بغیر اپنے حصے میں سوراخ کر سکتے ہیں اگر یہ لوگ اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہیں روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔"

فرد کو مطلق آزادی دینا جس پر کوئی ایسی پابندی نہ ہو جو معاشرے نے پسند کی ہو اور جو فرد اور معاشرے کے مفادات کو مساوی حدود میں رکھتی ہو، انانیت اور مصلحت ذاتی کو جنم دیتی ہے اور معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی اور اجتماعی زوال پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فرد کی شخصیت کی کامل نفی اور اس کا معاشرے کے نظام اور اختیار میں مکمل انضمام، فرد کی آزاد سوچ پر پہرے بٹھا دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں افراد لوگوں کا ایسا گروہ بن جاتے ہیں، جو جانوروں اور چوپاؤں کے گروہ سے مختلف نہیں۔

فرد کو اتنی زیادہ آزادی دینا کہ وہ معاشرے کی رسوم و اخلاق کو پس پشت ڈال دے تاکہ اس کی ذات پر کوئی پابندی نہ رہے، بالکل اسی طرح ہے جس طرح فرد کو معاشرتی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مکمل طور پر غلام بنا دینا۔ دونوں باتیں غلط ہیں اور دونوں ہی فرد اور جماعت کی حیثیت کے لیے خطرناک ہیں۔ نظام صالح، جو فرد کی ضروریات اور مفادات میں، اور اس کی مستقل فرد اور جماعت کے رکن ہونے کی دونوں حیثیتوں میں توازن پیدا کرتا ہے گویا ایک نسل اور آنے والی تمام نسلوں کو وسیع اور جامع انسانیت کے دائرے میں داخل کرتا ہے —— اور اسلام نے یہی کیا ہے[1]

اسلام فرد اور معاشرے کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے:

"اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی متوازن فرد کی تشکیل کرے۔ اس قسم کا متوازن فرد

Marfat.com

کبھی دوسروں کے حقوق سلب نہیں کرتا کیونکہ یہ خواہش 'اسراف' سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس فرد کے دل میں عدم توازن کا ہونا۔ جب ہر فرد متوازن ہو جائے تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس کے اغراض و مقاصد بھی متوازن ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسلام ہر فرد پر علیحدہ علیحدہ توجہ دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی وحدت ہے جو دوسری وحدتوں کے ساتھ مل کر معاشرہ بناتی ہے اور ایسی اینٹ ہے جس سے پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔"[43]

اسلام افراد کی زندگی کے ہر مرحلے پر، بچپن، لڑکپن، شباب، اُدھیڑ عمر اور بڑھاپے تک خاص توجہ دیتا ہے اور وہ اس توجہ کو خود حکومت کے سپرد نہیں کر دیتا کہ وہ معاشرتی اداروں کے ذریعے حکومت اور حکمرانوں کی تقدیس و عظمت قائم کرے، بلکہ وہ اس توجہ کو خود افراد اور ایسے گروہوں کی ذمہ داری بناتا ہے جو عرصۂ دراز سے تشکیل شدہ ہیں۔ مثلاً خاندان، کیونکہ اسلام پر لوگوں کا ایمان، جو معاشرتی عقیدہ ہے، حقیقی اور برضا و رغبت ہے، وہی یہ حکم دیتا ہے، کہ خاندان اپنے ارکان کی صحیح تربیت کرے اور انہیں اخلاق، محبت اور عزت کا درس دے اور انہیں زندہ رہنے کا صحیح طریقہ سکھانے کے لیے ان میں زندہ اوصاف پیدا کر دے۔ یہی توقع اُسے معاشرے کے تمام اداروں سے ہے۔

اسلام جس معاشرے کو تعمیر کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی ابتدا، اور غرض و غایت کے لحاظ سے فکری اور اخلاقی ہے، اور تمام افراد کو اسی مقصد کے لیے اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی معاشرہ حسب نسب اور نسل پرستی کی بنیاد پر قائم نہیں، نہ اقتصادی برابری اس کا مقصود ہے۔ وہ تو ایک مخصوص عقیدے اور ضابطۂ اخلاق پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک تمام بنی نوع انسان ایک ہی اصل سے متعلق ہیں اور ہر وہ شخص جو "اللہ کو اپنا رب اور مالک سمجھ کر ایمان لاتا ہے، اور اس کے رسول جو ہدایت اور دین حق لے کر آئے اُسے اپنی زندگی کا عملی ہدف بناتا ہے، وہ اس معاشرے کا رکن بن جاتا ہے اور اس کا ایک فرد ہوتا ہے۔[44]

اسلامی معاشرے کا "دروازہ" ہر اس شخص کے لیے کھلا ہے جو ایک ہی عقیدہ رکھتا ہے، اور جو معاشرے رنگ و نسل وغیرہ پر مبنی ہیں، وہ اسی خاص نقطۂ نظر رکھنے والوں کے لیے مخصوص ہیں اور ان کے دروازے دوسروں پر بند ہیں۔

Marfat.com

اسلامی معاشرہ طبقاتی نظام کی بھی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس میں تو جملہ افراد کے درمیان ربط فقط اخوت، تعاون اور ایک دوسرے کی کفالت و مدد کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس میں "طبقاتی جنگ" اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی گنجائش نہیں۔ یہ تو نفوس و ضمائر کا معاشرہ ہے، جو صرف دعوتِ دین پر مجتمع ہے۔ اگر اسلام کسی خاص گروہ کو خطاب کرتا ہے تو محض اس لیے کہ امت میں اُسے علم اور فکری سلاست کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔

اسلام نے مسلمانوں پر روحانی بلندی حاصل کرنے کی ممانعت نہیں کی، لیکن اس نے قبیلے، مملکت اور مذہب کی حدود سے بالاتر ہو کر "روحِ جماعت" کا ارتقا چاہا ہے تاکہ وہ وسیع تر اور جامع انسانی روح" بن جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مشرکین رسول اللہؐ اور مسلمانوں سے مسلسل جنگوں میں الجھے رہے لیکن رسول اللہؐ نے ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں رکھی اور جب بھی ان کے قیدی پکڑے آئے، روحِ انسانیت کے ارتقاء کی خاطر، آپؐ نے اُن سے ہمیشہ حسنِ سلوک روا رکھا اور اسی کی تلقین فرمائی۔ یہودی، اسلام کے بدترین دشمن تھے، مگر حضرت عمرؓ نے جب ایک یہودی کو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، بھیک مانگتے دیکھا تو مسلمانوں کے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔ اس دور میں بھی بڑے سے بڑے ترقی یافتہ معاشرے بھی اس نیک جذبے سے عاری ہیں اور انہیں انسانی کرامت کا شعور تک نہیں۔ مسلمان، دوسرے مذاہب، قیدیوں، اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کے ساتھ جس طرح حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے، مغرب اپنی تمام تر ترقی اور تہذیب کے باوجود اس حد تک پہنچنے سے آج بھی قاصر ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسلام تمام انسانیت کو اپنی اصل، حیات اور موت میں ایک گردانتا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ محمد عبداللہ العربی: نظام الحکم فی الاسلام۔ ص ۲۵
۲۔ محمد قطب: الانسان بین المادیۃ والاسلام۔ ص ۱۶۰
۳۔ ایضاً
۴۔ ابوالاعلیٰ مودودی: نظریۃ الاسلام وہدیہ

Marfat.com

اِخلاقی نظام

انسان، ہر انسان، ہر دور میں، اجتماعی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ اجتماعی یا معاشرتی زندگی دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور سلوک کا نام ہے۔ اس تعاون کے لیے قواعد و ضوابط کی ضرورت پڑی، خواہ کوئی معاشرہ ہو یا اس کے رسم و رواج یا اقتصادی اصول اُن سے موافق ہوں یا نہیں۔

مل جل کر رہنے سے نیک و بد میں تمیز پیدا ہوئی اور یہ شعور پیدا ہوا کہ بُرا اور اچھا کیا ہے، مفید اور مضر کیا ہے؟ اس طرح انسان کو خیر و شر، نیک و بد اور مفید و مضر میں فرق بتانے کے لیے احکام صادر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

خیر و شر اور نیک و بد وغیرہ کا موضوع انسانیت کے مختلف ادوار میں تمام فلاسفہ، مفکرین، اور مصلحین کے زیرِ بحث و غور رہا ہے۔ انسان نے اپنی تخلیق ہی سے یہ چاہا ہے کہ اس کے کردار کو واضح کرتے اور اخلاقی نافذ کرنے کے لیے ضوابط ہوں، خواہ اس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نکلے یا بُرا، اُسے اجر ملے یا سزا، کردار کی اصلاح کے لیے انسان کے ہر فعل کو، خواہ کب بھی ہو، مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اخلاقی بحث کئی سوالات پیدا کرتی ہے: انسان کو عمل پر اُکسانے والے دوسرے عوامل کیا ہیں؟ خیر اور شر کا علم ہمیں کیسے ہوتا ہے؟ یہ علم ہمیں کہاں لے جاتا ہے؟ قتل اور چوری بُرے فعل کیوں ہیں؟ جھوٹ غیر اخلاقی کیوں ہے؟ زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟ اگر اس کی غرض و غایت نیکی ہے، تو نیکی کیا ہے؟ کیا یہ سعادت اور خوش بختی کا حصول ہے؟ سعادت کیسے حاصل کی جائے؟

Marfat.com

کیا یہ معرفتِ حق سے حاصل ہوتی ہے یا ہر اُس فعل سے جو ہمیں مسرت سے ہمکنار کرے، ہمیں لذت بخشے یا جو ہمیں پسند ہو، سعادت حاصل ہوتی ہے؟ اور یہ ضمیر، باطن کی آواز کیا ہے جو انسان کے ہر فعل پر چونک اٹھتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے؟ اور یہ مفروضہ اخلاقی احکام کیا ہیں؟ ان سوالات کے مختصر جواب میں ہم علمائے اخلاق کے اہم نظریات کا احاطہ کریں گے تاکہ ان کے مقابل اسلام کا مؤقف پیش کر سکیں۔

۱۔ شعور اخلاقی کی اصل کیا ہے، یعنی ہم کیسے جانتے ہیں کہ کوئی عمل اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی؟ اس کے بارے میں دو رائیں ہیں؟ ایک رائے کے مطابق، اس کا مصدر، انسانی فطرت یا جبلت ہے، جو ہر سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھاتی ہے اور تربیت سے راسخ ہوتی ہے، اور ضروری نہیں کہ انسان نے یہ تجربہ خود اٹھایا ہے۔ دوسری رائے کے مطابق، خیر و شر کی معرفت، تجربے سے ہوتی ہے اور وقت گزرنے اور فکر کے ارتقاء کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔

اسلام جس اخلاقی نظریے کا حامل ہے وہ یہی شعور فطری ہے، جس پر اللہ نے اُسے بنایا:

ونفس وما سواها فالهمها فجورها وتقواها قد افلح من زكّاها و قد خاب من دسّاها۔ (الشمس ۹۱ : ۷ - ۱۰)

اور یہی شعور ہے جو انسان کو بعض اچھے اوصاف اختیار کرنا اور بُری خصلتوں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے: "خواہ مختلف انواع بشر میں ان میں تفاوت ہو یا مختلف اقدار پائی جاتی ہوں، سوائے اس کے کہ، افراد سے قطع نظر، یہ (شعور) بعض اخلاقی خصائص کو ہر زمانے میں اچھا اور بعض کو بُرا کہتا رہا ہے۔"[1]

۲۔ دوسرا محرک باطنی اور نفسی ہے جو ہمیں ہر اس چیز کو اختیار کرنے کو کہتا ہے جس کی طرف ہمارا شعور اخلاقی مائل کرے اور جو ہمیں سب راہوں کو چھوڑ کر ایک راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے یہ سبب یا محرک اُن مقاصد و اغراض سے تعلق رکھتا ہے جو انسان کا ہدف ہوں۔ انسان ہی وہ تنہا ہستی ہے جو اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی کام شروع کرنے سے پہلے اس کے مقصد پر ضرور غور کر لیتا ہے اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ تلاش کرتا ہے۔ لوگوں میں عقائد اور فکر کے اعتبار سے اختلاف کی وجہ سے اُن کے اغراض و مقاصد میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی عمروں اور حالات کے سبب بھی فرق ہو سکتا ہے بعض

Marfat.com

کے نزدیک انسان کی غرض لذت کا حصول یا منفعت کی ضمانت ہے اور دوسروں کے خیال میں انسان کی غرض سیادت کا حصول ہے جبکہ دوسری اغراض ہمارے کردار کی تشکیل میں رخنہ اندازی کرتی ہیں محرک نفس کا تعلق بھی شعور سے ہے اور شعور کا تعلق ہمارے میلانات اور خواہشات سے ہے اور میلانات اور خواہشات کبھی عقل کی ہم نوا نہیں ہو سکتیں بلکہ عقل پر غالب آجاتی ہیں اور اس سے ہمارا جو کردار واضح ہوتا ہے وہ منطق عقلی کے مخالف بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ تیسرا محرک، اپنے مقاصد کی، یا آخری نتائج کی معرفت، جن تک ہم اپنے اخلاقی اعمال کے ذریعے پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ مقاصد ایک طرح سے محور ہیں جس کے گرد ہماری فوری اغراض گھومتی ہیں اور رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ اگر انسان کا ہدف ذاتی عظمت حاصل کرنا ہو تو اس کی ساری اغراض اسی کے گرد گھومتی ہیں اور اس کا ساری سرگرمیاں اس کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں اور وہ خطرات کی پروا نہیں کرتا، ان کے باعث بھی اس کا موقف نہیں بدلتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ کو خوش کرنا اور سب کی بھلائی چاہتا ہے، وہ اسی نظر سے ہر چیز کو دیکھے گا اسی لیے اسلام اچھے مقاصد رکھنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کا ہدف بھی بلند رہے اور وہ اسی کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔

۴۔ کسی عمل کو اچھا یا برا کہنے، یا خیر و شر میں امتیاز کرنے کا پیمانہ ہمارے پاس اخلاقی قانون ہے لیکن اس کو نافذ کرنے کی قوت نہیں جو انسان کو اس کے بموجب عمل کرنے پر مجبور کرے عقلیت پرستوں نے کہا: یہ قانون ہمارے اندر ہے اور اس کا مقصد انسانی ضمیر ہے۔ یہ جبلی ہے اور اکتسابی یا ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں اور علمائے عمرانیات نے کہا: اس قانون کے مصادر خارجی ہیں، جن میں مذہبی اعتقادات شامل ہیں، یا وہ حالات جن کی وجہ سے اول اول انسان نے ان قوانین کو برضا و رغبت مان لیا اور پھر معاشرے نے انہیں مجلہ ماننے پر مجبور کر دیا اور اس طرح وہ عرف و عادت بن گئے۔ ان میں اللہ کا خوف، معاشرے کا خوف وغیرہ آتے ہیں۔ جن سے اخلاقی قانون تشکیل پاتے ہیں جس کی ترازو میں ہم اپنے امور و اعمال تولتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ہر حکم کا پیمانہ اور ہر عمل کی میزان صرف وہ اخلاقی قواعد ہیں جو رسول کریم ؐ نے بیان فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو (اور سب رسولوں کو) مبعوث کیا اور آپؐ کو انسانی ہدایت کے لیے کتاب دی جس میں خیر اور سعادت کی راہ ہے اس لیے اللہ کی شریعت میں اچھی بات ہے وہ اچھی بات ہے اور جو اس کے نزدیک قبیح ہے وہ بری ہے۔

Marfat.com

۵۔ ارادے کی آزادی یا جبر و اختیار کا مسئلہ۔ کیا انسان اپنے عمل میں آزاد ہے یا فطرت اور قدرت کے حکیم کے تابع ہے؟ یہ مسئلہ تاریخ انسانی میں شدید بحث مباحثے کا باعث رہا ہے اور اب تک مفکرین اس مسئلے پر بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ جبر کے حامی ہیں اور کچھ اختیار کے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بیک وقت مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے جس خلعت پر بنایا ہے، جو قوی اسے ودیعت کیے ہیں اور جیسی جبلت اس کی بنائی ہے اُس کے اعتبار سے وہ مجبور ہے۔ وہ ان قوانین اور رسم و رواج کے لحاظ سے بھی مجبور ہے، جس کی پابندی لازمی ہے اور وہ اس اعتبار سے مختار ہے کہ وہ اپنے اعمال پر غور و فکر کر سکتا ہے، اپنی اغراض کا اندازہ لگا سکتا ہے، پھر ان کے مطابق کرتا ہے اور اس عمل کے مطابق اُس کے نتائج برداشت کرتا ہے۔

۶۔ اخلاق، اضافی ہے یا مطلق۔ لوگوں میں کل بھی اور آج بھی اس بات پر اختلاف رہا ہے کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے، اور یہ کہ آیا ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم حسن و قبح اور خیر و شر کے بارے میں احکام عام وضع کر سکیں اور ان کا اطلاق بھی کر سکیں؟ بالفاظِ دیگر کیا "خیر مطلق" اور "شر مطلق" کی تراکیب استعمال کر سکتے ہیں، جن کا اطلاق ہر زمانے اور تمام حالات میں یکساں ہو؟ یا خیر و شر اضافی ہیں، یعنی جو بات ایک زمانے میں ایک جگہ اچھی ہے، دوسرے وقت اور دوسری جگہ بُری ہو، یا اس کے بالعکس؟ قدیم مفکرین میں بھی ایسے لوگ تھے جو خیر و شر کو مطلق سمجھتے ہیں اور کچھ اس کے برعکس اصرار کرتے تھے۔ فلاسفۂ یونان میں افلاطون شاید سب سے پہلا شخص ہے جس نے خیر و شر کو مطلق کہا تھا۔

مسلمان مفکرین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، اور دوسروں کی طرح اس میں بھی اختلافِ رائے رکھتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ اُن کے نظریے کی اساس دوسروں سے مختلف تھی انہوں نے اس اساس کو خدا کی اس توجہ سے منسلک کر دیا تھا جو اُسے اس دنیا اور اس کے مکلفین کی طرف ہے۔ اس موضوع پر عصر حاضر میں بھی جدال جاری ہے اور اس کا تعلق علمائے اخلاق کے نظریے اقدار سے ہے، یعنی قدر و قیمت ان کے اچھے یا بُرے ہونے، یا حسین و قبیح کی نسبت سے کیا ہے۔

اخلاق کے اضافی یا مطلق ہونے کے بارے میں اسلامی نظریہ یہ ہے کہ وہ اخلاق کے مطلق ہونے کی تائید کرتا ہے۔ مثلاً صدق، امانت، عدالت اور وفائے عہد وہ اعلیٰ صفات ہیں جنہیں

Marfat.com

انسانیت نے ہمیشہ لائق تعریف سمجھا ہے اور انسانیت پر ایسا دور شاید ہی گزرا ہو جب جھوٹ، ظلم اور خیانت کو اچھا سمجھا گیا ہو۔ یہی حال تمام معاشروں کا ہے۔ انسانیت نے کسی ایسے معاشرے کو احترام کا مستحق نہیں سمجھا جس میں حسن انتظام، اداروں کا بہترین نظام، خیر خواہی، ہمدردی اور انصاف نہ ہو اور نہ ایسے معاشرے کی تعریف کی ہے جس میں فتنہ و فساد، عناد، نفرت، حسد اور تکبر ہو گا۔

ادیان سماوی نے ہمیشہ مکارم اخلاق کی طرف دعوت دی ہے:

"وانک لعلی خلق عظیم" (القلم ۶۸: ۴)

اسی وجہ سے انسان روز اول ہی سے، اس کرۂ ارض میں خیر و شر اور فضیلت و رذیلت کے معنوں میں انبیاء کے ذریعے واقف چلا آتا ہے۔ انسانیت پر ایسے ادوار بھی گزرے کہ مذہب کا اثر زائل ہو گیا یا کم ہو گیا۔ اسی لحاظ سے ایسی اخلاقی آراء و افکار اور اعلانات ظاہر ہوتے رہے جو کبھی سیدھے سے قریب تھے اور کبھی دور۔ جب ہم اخلاقی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے جو بیج لوگوں کے ضمیروں میں بوئے تھے ان کی تاثیر ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک مفکر سے دوسرے مفکر کو منتقل ہوتی رہی۔

اسلام نے اخلاقیات کے اصول و معانی کے میدان میں ایک جامع انقلاب برپا کر دیا۔ جس نے پرانی اقدار کو مٹا کر نئی اقدار پیش کیں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ انسان کامل اور معاشرۂ کامل تخلیق کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اپنی کتاب "حیات محمدؐ" میں کہتے ہیں:

"اہل قلم نے مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا نمونہ تحریر کیا ہے اور شعراء و فلاسفہ نے عہد قدیم کے انسان کامل کی تصویر کھینچی۔ ان کی یہ مشق صفحۂ قرطاس پر مسلسل جاری ہے مگر ایسی غیر منقطع مشق کے باوجود کسی قوم کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جو اپنے قد و خال کی رعنائی میں اس قدر جاذب ہو جیسا کہ قرآن کی سورہ بنی اسرائیل میں مذکور ہے۔ یہ نمونہ اس حکمت بالغہ کا کرشمہ ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے اپنے رسولؐ پر اتاری اور جو کسی گزرے ہوئے دور میں انسان کامل کی حکایت نہیں بلکہ بنی آدم کو اس کے وظیفۂ حیات سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

وقضی ربک ألا تعبدوا الا ایاہ ...... کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا۔" (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳-۳۸)

پھر قرآن مجید نے یہ بھی نصیحت کی:

"یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم ...... فاولئک ھم الظالمون"

(الحجرات ۴۹: ۱۱)

اس موضوع پر اور آیات بھی ہیں۔ مثلاً

"یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا ...... فکرھتموہ" (الحجرات ۴۹: ۱۲)

اور یہ بھی فرمایا:

"إن اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات إلی اھلھا" (النساء ۴: ۵۸)

اس طرح قرآن مجید کی اور بھی کئی آیات اس موضوع پر ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام، اس کے تصور کائنات و موجودات، کا لازمی حصہ ہے۔ اس تصور کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں جس نے یہ کائنات تخلیق کی ہو، اور یہ کائنات خدا کے حکم اور مشیت کے تابع نظام کے مطابق چل رہی ہے اور انسان اس کائنات کا محض ایک جزو ہے جسے خدا نے اپنی عبادت اور اپنے حکم کی اطاعت کرنے کے لیے خاص مزاج دے کر پیدا کیا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ صرف خدا کی عبادت کرے۔ انسان کی تمام جدوجہد اور کاوشوں کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے اسلام میں ہر عمل کو ناپا جاتا ہے اور اس پر خیر یا شر کا حکم لگایا جاتا ہے کہ دوسرے نظاموں میں یہ پیمانہ لذت، مصلحت، سعادت وغیرہ کا حصول ہے اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے انسان کو یہ پیمانہ دیا اور اُسے اچھائی اور بُرائی کے جانچنے کے لیے دائمی اصول مہیا کیا۔ اس دائمی، مستقل اصول کی وجہ سے ہم اخلاقی قدروں کو عقل، تجربے، یا دوسرے انسانی علوم کے ذریعے مفرکرنے سے محفوظ ہیں، جو وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ یہ اصول کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے سوا کچھ نہیں جو تمام احوالِ زندگی کے لیے کامل رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے مستقل اصولِ اخلاق وضع کرتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام میں نظامِ اخلاق کی تین خاصیتیں بیان کی ہیں:[۵]

Marfat.com

۱۔ اسلام کا نظام اخلاق حیات انسانی کے لیے خدا کی رضا اور خوشنودی کو غایت اولیٰ قرار دیتا ہے۔ اس کا پیمانۂ اخلاق بہت عمدہ ہے اور اس نظام اخلاق میں ایسی کوئی بات نہیں جو انسان کی اخلاقی ترقی اور پیش قدمی میں حارج ہو۔ یہ نظام کسی خارجی عوامل کی مداخلت کے بغیر انسان کو خشیت الٰہی کی بنا پر اخلاقی قوت مہیا کرتا ہے۔

۲۔ اسلامی نظام اخلاق، اس ترغیب و تحریض سے کوئی نیا ضابطۂ اخلاق تیار نہیں کرتا نہ عرفِ عام میں مقبول اخلاق کو نظر انداز کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔" اسلامی نظام اخلاق کا منشا ہے کہ انسان کی پوری زندگی کا ہر گوشہ نہ صرف اچھے اخلاق سے روشن ہو بلکہ اخلاقی قدریں سلامت بھی رہیں۔

۳۔ اسلامی نظام انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسا نظام حیات قائم کریں جس کی بنیاد "معروف" پر ہو اور اس میں "منکر" کی کوئی آمیزش نہ ہو، اور انہیں یہ دعوت دیتا ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ نیکیوں کو مدنظر رکھیں اور ان نیکیوں کو ساری دنیا میں عام کریں۔ یہی اسلامی معاشرے اور امتِ مسلمہ کا مطمح نظر ہے۔

اسلامی اقدار کئی فرائض عائد کرتی ہیں ان میں سے بعض خود فرد سے تعلق ہیں جو اس کا مرتبہ حیوانی سطح سے بلند کرنا چاہتی ہے، جن کا مقصد حیات صرف کھانا پینا ہوتا ہے۔ ان کا مقصود انسان کی شرف و کرامت اور ارتقاء ہے۔ جن اقدار کا تعلق معاشرے سے ہے، اُن کی غایت انسانی جمعیت کو مہذب اور متمدن بنانا ہے، جس کے تمام افراد ایک دوسرے کے لیے ایثار کے واسطے سے مربوط ہوں اور اپنے آپ کو معاشرے کی بھلائی کے لیے قربان کر سکتے ہوں، اور محض خود غرضی اور ذاتی منفعت ان کا مقصود نہ ہو۔ اسلام چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن صفات سے نوازا ہے وہ اس کے تمام کردار و احوال میں روشنی کا مینار بن کر اس کی رہنمائی کریں۔ مثلاً کرم، حلم، احسان، ہمدردی اور رحم تمام اعلیٰ اقدار ہیں جن کی پیروی سے انسان دنیا میں مثالی زندگی گزار سکتا ہے۔ جو معاشرہ ایسے افراد سے تشکیل پائے گا وہ یقیناً ایک سرفراز معاشرہ ہوگا۔ مشرق و مغرب، ایران، روم اور عرب میں یہ اقدار ایک لحاظ سے نئی نہیں اور شاید اسی وجہ سے اسلام اقطار عالم میں سرعت سے پھیل گیا اور اسی وجہ سے اسلامی اقدار ایرانی اور یونانی اقدار پر

Marfat.com

غالب آگئیں جن کی اساس مادیت تھی، جبکہ اسلامی اقدار پوری انسانیت کے لیے ترقی اور خوشحالی کی خواہش مند اور ضامن تھیں، اور اسی باعث اسلامی اقدار کامران ہوئیں ۔۶

حواشی

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی : نظام الحیاۃ فی الاسلام، ص ۷
۲۔ ایضاً، ص ۷۔۸
۳۔ حیاتِ محمد (اردو) ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور بارچہارم ۱۹۸۸ء، ص ۶۷۹
۴۔ ابوالاعلیٰ مودودی : نظام الحیاۃ فی الاسلام، ص ۱۴
۵۔ ایضاً، ص ۲۰
۶۔ عبدالکریم عثمان : اصول علم الاجتماع

Marfat.com

اسلام کے اثرات

اسلامی ثقافت کی خصوصیات

اسلامی ثقافت نے، جس پر ساری کائنات کے دروازے وا ہیں، انسانی فکر پر تمام سرگرمیوں کی نئی راہیں کھولی ہیں جن مثالیوں اور اقدار کی طرف اسلامی ثقافت نے دعوت دی ہے۔ ان کی اساس ایمان، صداقت، انصاف، حریت، مساوات اور اخوت پر ہے۔ کائنات وما فیہا کے بارے میں اس کا نظریہ بے حد جامع اور متوازن ہے اور اس کی بنیاد منو اتر احادیث اور اللہ کے احکام پر ہے۔ اللہ سے انسان کا رشتہ اُس نے عبادت اور اعمال کی جواب دہی پر استوار کیا ہے۔ عبادت سے مراد وہی فرضی یا رسمی عبادات نہیں بلکہ اس میں انسان کا ہر عمل شامل ہے۔ جواب دہی صرف اعمال پر ہے اور انسان جو اچھا یا بُرا کام کرتا ہے اُس کے مطابق اُسے بدلہ ملتا ہے۔

معاشرتی تعلقات کے میدان میں، اسلامی ثقافت نے فرد، خاندان اور معاشرے میں روابط قائم کرنے کے لیے نیا فلسفہ پیش کیا، جو ان تمام اداروں کی کفالت کرتا ہے اور انہیں ایسے اعمال کی ترغیب دیتا ہے جو انسانیت کے مفاد میں ہوں۔ یہ کفالت اتنی جامع ہے کہ صرف مادی ضروریات پورا کرنے پر زور نہیں دیتی۔ بلکہ روحانی اور اخلاقی کفالت بھی مدنظر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ جدید دور کے اُن روابط ہی کو پروان نہیں چڑھاتی جو فرد اور مملکت میں قائم ہو گئے ہیں، بلکہ مختلف سطحوں پر ان روابط کو پختہ کرتی ہے۔

مملکت، عوام کے حکومت سے تعلق، اور مملکت کے دوسری مملکتوں سے تعلقات کے

Marfat.com

بارے میں اسلامی ثقافت، مملکت کے لیے اعلیٰ ترین ہدف مقرر کرتی ہے کہ عوام اور حکومت دونوں اُسے حاصل کرنے کی کوشش کریں، اور وہ ہے ایک ایسی مملکت کا قیام جو اپنے تمام معاملات میں اللہ کے احکام کو نافذ کرے، اعلائے کلمۃ اللہ کو باقی ہر چیز پر سبقت دے، فرد کو اللہ کے سوا سب کی غلامی سے نجات دلائے اور تمام جھوٹے خداؤں کا خاتمہ کر دے خواہ وہ انسان ہوں، رسم و رواج ہوں یا پتھر کے صنم۔

اسلامی ثقافت کے نشانات میں سے ایک نشان یہ ہے کہ اس نے عربوں کو بالخصوص اور مسلمانوں کو بالعموم ایسی ممتاز فکری شخصیت عطا کی جو اسلام سے پہلے انہیں نصیب نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ عرب سادہ اور فطرت سلیم کے مالک تھے اور اُن کے معاشرے میں اچھے اخلاق کے اصول رائج تھے، ان میں شعر و خطابت کا زور تھا مگر ان میں اُمت کو تشکیل کرنے والے شخصیت کو مکمل بنانے والے، اپنی ذات کا احساس دلانے والے اور اپنے آپ پر اعتماد کرنے پر اُبھارنے والے عناصر ناپید تھے ___ اور وہ تھے توحید، رسالت اور عقیدہ۔ یعنی جنہیں عرف عام میں وہ قوتیں کہا جا سکتا ہے جن کے گرد انسان کی تمام سرگرمیاں گھومتی ہیں اور جن سے تمام آراء تشکیل پاتی ہیں، اور ایسی مثبت قوت بن جاتی ہیں جو اپنے مقاصد سے واقف ہوتی ہے اور اپنی ذات کی حقیقت سے آگہی رکھتی ہے۔ عربوں کی فطری صلاحیتوں کو اسلام نے جلا بخشی۔ جاہلیت کے دور میں عربوں کی زندگی پست اور رذیل تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کی ثقافت بلند پایہ اور ارفع ہو گئی۔ جب عربوں نے اپنے وجود کا راز پا لیا تو بہت کچھ پانا ممکن ہو گیا، نہ صرف اُن کے لیے بلکہ انسانیت نے ان کی وجہ سے تہذیب و تمدن پا لیا اور انہوں نے مشرق کی نئی تاریخ کی بنا ڈالی۔ اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی نئی تہذیبیں، نئے علوم و فنون اور زندگی کی نئی راہیں پیدا ہوئیں۔

اس ثقافت کے نشانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فکر اور علم کے میدان میں، بقول ڈاکٹر حتی: "قرون وسطیٰ کے پہلے دور میں انسانوں کے کسی گروہ نے انسانیت کی ترقی کے لیے وہ کام نہیں جو مسلمانوں نے کیا، اور عربی زبان، تمام متمدن دنیا میں عرصہ دراز تک علوم و آداب اور فکر کی زبان کے طور پر قبول رہی، اور اس کی ایک نمایاں شان یہ ہے کہ نویں اور بارہویں صدی عیسوی (تیسری اور چھٹی صدی ہجری) کے درمیان عربی زبان میں فلسفے، طب، تاریخ، الٰہیات،

Marfat.com

ہیئت اور جغرافیہ میں جو کچھ تحریر کیا گیا وہ دنیا کی ہر زبان سے مجموعی طور پر فوقیت لے گیا۔"

جب مسلمانوں کو قرآن اور سیرت رسولؐ سے اچھی طرح متعارف ہونے کا شوق ہوا اور انہوں نے اس کے مطالعے کے اصول بنائے تو علم تفسیر، علم سیرت اور علم الرجال وجود میں آئے اور تشریح اور قانون سازی کی ضرورت محسوس ہوئی تو علم فقہ اور اصول فقہ وضع ہوئے۔ جب مسلمانوں کو اس کائنات کے بارے میں جستجو ہوئی اور انہوں نے اس کی تعمیر و تسخیر میں دلچسپی لی تو تجرباتی اور دوسرے مجرد علوم جیسے ریاضیات، ہیئت اور علم حیوانات وغیرہ نے ترقی کی۔ جب مسلمانوں نے دوسری قوموں سے ربط ضبط بڑھایا اور ان کا احوال جاننے کی خواہش کی تو فلسفہ، دینیات، عقائد اور علم تقابل ادیان نے جنم لیا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کے درمیان عربی زبان ایک مضبوط رابطہ ہے کیونکہ وہ قرآن کی زبان ہے تو انہوں نے عربی زبان اور اس کے قواعد وغیرہ کو ترقی دینے والے علوم ایجاد کیے۔ ابھی چوتھی ہجری ختم نہیں ہوئی تھی کہ مسلمان اقوام، علم وفکر اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے سب اقوام سے بڑھ گئیں اور تعداد و شخصیت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگئیں۔ انہوں نے انسانیت کے لیے علم و ادب کی بہت بڑی میراث چھوڑی۔

جن اہل فکر نے اس ثقافت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی تحریروں کے ذریعے ایسے مالا مال کیا ان کی تعداد میں اتنی زیادہ ہوگئی کہ "طبقات الرجال" پر کتابیں ظہور میں آئیں اور ہر نوع کی کتاب نے مختلف خصائص کے حامل اہل فکر کا تذکرہ قلم بند کیا۔ ان میں رجال حدیث، رجال ادب، اطباء اور حکماء وغیرہ پر الگ کتب تھیں۔ اس قسم کا کام ماضی میں کسی اور قوم نے نہیں کیا تھا چنانچہ ہزاروں مسلمان مفکرین اور علماء نے علم کے لاکھوں خزانے اور ذخائر چھوڑے، جن سے بحیرہ سے بحر اوقیانوس تک اور ترکستان سے عدن اور دہلی تک سارے علوم اسلام کے کتب خانے بھرے پڑے تھے۔ یہ ایسی ثقافتی بیداری تھی جو آج تک دنیا کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ جلیل القدر ثقافت بارھویں صدی ہجری (۱۸ ویں صدی عیسوی) تک تابناک رہی اور اسی سے یورپ اور مغربی دنیا میں بیداری کا آغاز ہوا اور اسے مہمیز ملی۔

اس عظیم ثقافت میں عربوں کا جو حصہ تھا اس کی وسعت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا جنہوں نے اس ثقافت کی بنیادیں رکھیں اور پھر اسے شاندار معیار تک پہنچایا، لیکن ہم ان اقوام کے حق کا اعتراف بھی کرتے ہیں جو اسلام لائیں اور اس اسلامی ثقافت میں بھرپور حصہ لیا ان میں

Marfat.com

وسط ایشیا، ایران، ترکی اور ہندوستان کی مغل سلطنت شامل ہیں۔

یہاں ثقافت اسلامیہ کی تمام کامرانیوں کا تذکرہ دشوار ہے، جو اس نے فکر انسانی کے نشو و نما حاصل کیں، لیکن مختصر طور پر ان علمی کارناموں کا ذکر ضروری ہے جو اس نے طبیعیات اور ریاضی کے میدان میں تھا اور یہ علوم کی حقیقت تک پہنچنے کا نیا طریقہ تھا جسے ہم "کشف و اختراع" کہہ سکتے ہیں اور جس سے قدیم تہذیبیں نا آشنا تھیں، خاص طور پر یونانی تہذیب، جس سے عربوں کا بالعموم واسطہ رہا، ان تجرباتی طریقوں سے گریزاں حکمران سے نفرت کرتی تھیں اور صرف مجرد، نظریاتی تعلیم پر اکتفا کرتی تھیں۔ سیدیو "تاریخ عرب" میں کہتا ہے:

"مدرسۂ بغداد کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے علمی روح کی پرورش کی جو اس کی تمام سرگرمیوں پر حاوی تھی اور اس سے مراد ہے معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر اور ظواہر کو دقت نظر سے دیکھنا تاکہ اسباب کو نتائج سے الگ کیا جا سکے۔ ان کے ہاں وہ اشیاء قبول نہیں کی جاتی تھیں جو تجربے سے ثابت نہ ہو سکیں۔ نویں[9] صدی میں عرب اس شاندار علمی طریقے کے مالک بن گئے تھے جو نئی ایجادات کا مؤثر ذریعہ تھا۔ مشہور مستشرق، گب نے بھی کہا ہے کہ مسلمان علماء نے اپنے خیالات انفرادی حوادث پر مذکور کر دیئے جن سے انہوں نے نیا علمی راستہ نکالا جو سکندریہ اور یونان کے اسلاف نے سوچا تھا، لیکن اس طریقے کا استعمال یا اس کی یورپ کو واپسی کی فضیلت انہی کو حاصل ہے۔"

عربوں کے عالمانہ نظریے کے سبب اور مشکل علوم کی طرف اسلامی ثقافت کی توجہ کے باعث علم ہیئت اور ریاضی وہ پہلے علوم تھے جن سے مسلمان علماء کو شغف پیدا ہو گیا یہاں تک کہ ان کے وجہ سے خلفاء، امراء اور سلاطین کو بھی اس کا شوق پیدا ہو گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں علماء ہیئت نے بطلیموس کے نظریے کو غلط ثابت کرتے ہوئے واضح کیا کہ سورج کا مدار بیضوی ہے جو مسلسل گھٹتا رہتا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت اور تفصیل سے سال کی مدت مقرر کی۔ اس طرح انہوں نے چاند کی منازل کا تعیین بھی کیا۔ انہوں نے سورج میں دھبے دریافت کیے۔ انہوں نے گرہن کا حساب بھی لگایا اور شہاب ثاقب کے ظہور کی وجہ بھی دریافت کی۔ ہیئت میں شرق اسلامی کے مشاہیر میں البتانی بھی ہے، جسے دائرۃ المعارف علم ہیئت

Marfat.com

کے بیس بڑے بڑے ماہرین میں شمار کرتا ہے ۔ دوسرا نام ابوالعرفا کا ہے جس سے چاند کی منازل کے بارے میں ایک مشہور قاعدہ دریافت کیا ہے جسے "چاند کے تیسرے انحراف کا قاعدہ" کہا جاتا ہے، جو دس صدیوں بعد غلطی سے یورپی ماہرین کے نام لگا دیا گیا۔ پھر ابن یونس ہے جس نے گھڑی کا پینڈولم اور دھوپ گھڑی ایجاد کی اور قاہرہ میں مدرسۂ ہیئت قائم کیا۔ ابن یونس نے ہیئت کی جو جدولیں تیار کیں وہ گزشتہ تمام جدولوں سے باریک بینی میں بڑھ گئیں۔ حسن ابن الہیثم نے سب سے پہلے بصریات پر مقالہ لکھا، اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ سب سے پہلے اس نے اسوان کے مقام پر بند باندھنے کا خیال پیش کیا تھا تاکہ نیل کا پانی بلند کیا جا سکے (جس پر عمل ایک ہزار سال بعد ہوا)

البیرونی، محمود غزنوی کے دور کے مشاہیر مسلمان علماء میں سے ہے اس نے بغداد اور ہندوستان کے علمی ورثے کو ایک حلقے میں پرانا چاہا۔ اس کے بے شمار کارناموں میں سے ایک طول بلد اور عرض بلد کے خطوط ایجاد کرنا تھا۔ اس کے علاوہ، الخازنی اور عمر خیام جس نے ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں بڑی محنت سے تقویم کی تصحیح کی (جسے دس صدیوں بعد پوپ گریگوری نے اپنایا) نصیر الدین طوسی نے تیرہویں صدی عیسوی میں ہلاکو کے حکم پر تبریز میں رصدگاہ قائم کی اور اس رصدگاہ میں استعمال کے لیے نئے نئے آلات ایجاد کیے گئے جن کی شہرت چین اور یورپ تک پہنچی۔

اندلس میں فلکیات کا مطالعہ بہت بڑھ چکا تھا مگر سپین میں خانہ جنگی اور مسلمانوں کے خلاف جنگوں کی وجہ سے بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ اندلس کے علماء میں مسلمہ المجریطی، ابن خلدون، ابن رشد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے پر آشوب دور میں بھی اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور دنیا کو نئے نئے انکشافات سے روشناس کرایا۔

علوم ریاضی میں مسلمان علماء نے حساب، الجبرا اور ہندسہ (جیومیٹری) میں نئے اصول اختراع کیے۔ اور الجبرا تو ہے ہی مسلمانوں کی اختراع، اور اس میں جو اعداد وغیرہ استعمال ہوتے ہیں وہ خالصتاً اسلامی اختراع ہیں۔ علم مثلثات بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ انہوں نے "جیب زاویہ" وغیرہ کا نظریہ پیش کیا۔ مغرب نے اعتراف کیا ہے کہ مثلثات میں عربوں نے جو کچھ دریافت کیا اور پیش کیا وہ دوسروں پر پانچ سو سال بعد

Marfat.com

منکشف ہوا۔

صفر کی دریافت علم ریاضی میں انقلابی قدم تھا جبکہ مغرب نے اس کا استعمال اٹھارہویں صدی میں شروع کیا۔ اس کے لیے "بیت الحکمت" بغداد کا سربراہ محمد الخوارزمی فراموش نہیں کرنا چاہیے جس نے الجبرا میں بڑی پیش قدمی کی۔ مغرب نے اس کے نام کو بگاڑ کر (الگوریتھم) اپنا لیا مگر یہ اعتراف کیا کہ بلاشک و شبہ وہ علم ریاضی میں سب پر سبقت لے گیا تھا۔ الخوارزمی نے جس کام کی ابتدا کی تھی اُسے ثابت بن الجراح نے ہندسہ اور الجبرا میں تکمیل تک پہنچایا۔

فلکیات اور ریاضیات کے علاوہ مسلمان محققین فزکس یا طبیعیات کے موجد بھی ہیں۔ ابن الہیثم کی "کتاب البصریات" اس میدان میں مسلمان علماء کی بڑی نمایاں پیش کش ہے۔ اسی سے روشنی، منشور اور آئینوں کا استعمال شروع ہوا۔ ابن الہیثم نے بڑے بڑے عدسے ایجاد کیے جن سے بعد میں دُوربین اور خوردبین تیار کی گئی۔ اسی نے سب سے پہلے آنکھ، اس کے ڈھیلے اور بھینگے پن کا مطالعہ کیا۔

مسلمانوں نے اپنے استعمال کے لیے نئے آلات بھی ایجاد کیے۔ میکانکیات کے موجد بھی رہی تھے۔ گھڑی میں پنڈولم بھی انہوں نے ایجاد کیا۔ انہوں نے قطب نما اور مقناطیسی سوئی ایجاد جس نے جہاز رانی میں بڑی مدد دی۔

علم کیمیا میں بھی عربوں نے نئی نئی ایجادات کیں۔ ان سے پہلے یونانیوں کا اس کے بارے میں علم ناقص تھا اور عناصر اربعہ (خاک، باد، آب، آتش) کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ مسلمانوں نے کئی عناصر اور مواد دریافت کیے اور سب سے پہلے انہوں نے عمل تقطیر رائج کیا اور جرِ ثقیل اور انجماد بھی دریافت کیے۔ انہوں نے سیسے کی مدد سے معدنیات کو صاف کرنے کا طریقہ نکالا۔ اور آج بھی علم کیمیا میں یہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس علم میں جو اصطلاحات آج بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کی اصل عربی ہے۔ قلمی شورہ، روئی سے کاغذ سازی اور دوسری اہم ایجادات جو آج بھی انسان کے لیے مفید ہیں، انھی کی وجہ سے ہوئیں، بالخصوص کاغذ کی ایجاد تو انسانیت کی ترقی میں بے حد اہمیت رکھتی ہے جس نے ریشم، کھال اور کپڑے وغیرہ پر لکھنے سے نجات دلا دی۔ ایک اور اہم خدمت جو عربوں اور مسلمانوں نے سرانجام دی، وہ کیمیا سے صیدلہ (فارمیسی) کو الگ کر کے عملی اور تجرباتی بنانا تھا۔

Marfat.com

کیمیا میں مسلمانوں میں سے ایک اہم شخصیت ابوموسیٰ جعفر الکوفی ہے۔ اس کی تصانیف حقیقت میں سائنس کا دائرۃ المعارف ہیں۔ اُن میں سے کئی ایک کا ترکی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ابوبکر الرازی ہے جس کی کتاب الحاوی ہے جس میں سب سے پہلے گندھک کا تیزاب بنانے کا طریقہ بیان کیا گیا۔

جہاں تک طب کا تعلق ہے تو اس میں بھی مسلمانوں کو فوقیت رہی۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہماری ثقافت انسان اور اس کی حاجات سے بخوبی آگاہ تھی۔ مسلمان اطباء نے مغرب کے طریقۂ علاج اور طبی تعلیم پر گہرا اثر ڈالا۔ صدیوں تک الرازی، ابن سینا اور ابن زہر کی تالیفات یورپ کی یونیورسٹی میں طبی تعلیم کی اساس رہیں۔ الرازی کی کتاب الحاوی نے تو بالخصوص یورپ میں خاصی شہرت پائی اور پیرس کے طبی ادارے کی لائبریری میں یہ نو اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی۔ الرازی نے بعض جلدی بیماریوں مثلاً چیچک اور خسرہ کے علاج کے بارے میں واضح ہدایات دیں۔ اس نے فالج کی حالت میں ہلکے جلاب اور پچھنے لگانے کا طریقہ بھی ایجاد کیا اور مزمن بخاروں کے لیے سرد پانی کا استعمال تجربہ کیا۔ جہاں تک ابن سینا کا تعلق ہے تو وہ کسی شک وشبے کے بغیر مسلمانوں میں سب سے بڑا طبیب تھا۔ اس کی کتاب "القانون فی الطب" پوری چھ صدیوں (بارھویں سے اٹھارویں صدی عیسوی) تک فرانس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں طبی تعلیم کی اساس رہی۔ اس نے امراضِ قلب کے علاج کا طریقہ دریافت کیا اور علاج نفسی کا طریق بھی اسی نے جاری کیا۔ اس کے مشاہدے میں آیا کہ بیماریاں اوہام کے یا نفسیاتی الجھنوں کے باعث پیدا ہوتی ہیں اور اُن پر اس نے خاص توجہ دی۔

مسلمانوں نے جراحت (سرجری) میں بھی کمال حاصل کیا اور تخدیر (سُن کرنے) کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کا موجد ابوالقاسم خلف بن عباس القرطبی تھا جس نے داغ اور چرکہ لگانے کا استعمال کیا اور پیپ وغیرہ خارج کرنے کے لیے فتیلے استعمال کیے۔ اس نے آنکھ میں موتیا بند کا علاج بھی دریافت کیا اور موتیے کو نکالنے کے لیے آپریشن بھی کیے۔ اس نے مثانے سے پتھری نکالنے اور جریانِ خون روکنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔

مسلمانوں نے طب میں سائنسی مشاہدات کے قوانین بھی رائج کیے۔ سب سے پہلے انہیں ابن زہر الاندلسی الاشبیلی نے رائج کیا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ انسانی جسم میں قدرتی طور پر خود بخود

بعض امراض کو ختم کرنے کی طاقت ہے۔ اس نے سانس کی نالی کا آپریشن ایجاد کیا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے میں کمال پیدا کیا۔

ابن رُشد کا بھی طب کے میدان میں بڑا دخل ہے۔ اس نے تریاق دریافت کیے، مختلف زہروں پر تجربے کیے اور کئی قسم کے بخاروں کا علاج دریافت کیا۔ اس کی کتاب الکلیات آج بھی یورپ میں شائع ہو رہی ہیں۔

ابن النفیس السوری نے دورانِ خون کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں اور بڑی محنت سے اسے بیان کیا۔ پرتگالیوں نے اس کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ سب سے پہلے اسے ابن النفیس نے بیان کیا ہے۔

اسلام نے حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی بہت زور دیا ہے۔ مثلاً غسل (بالخصوص غسل جنابت) شراب اور سؤر کے گوشت کی حرمت قابل توجہ ہے۔ مسلمان طبیب بیماریوں کے علاج میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر بہت زور دیتے تھے اور آج بھی طب میں صفائی اور پاکیزگی پر اصرار کیا جاتا ہے۔ گستاف لیبان کہتا ہے:

"عرب شفاخانے حفظانِ صحت کے اعتبار سے آج کے شفاخانوں سے کہیں زیادہ صاف ستھرے اور فائق تھے۔ یہ شفاخانے بہت وسیع اور عمدہ تھے اور پانی اور ہوا کا وافر اور کافی بندوبست تھا۔ سالرنو کی یونیورسٹی، جو حفظانِ صحت کے اصولوں کی پاسداری کے لیے شہرت رکھتی ہے اور یورپ کا بہترین ادارہ ہے، عرب طب کے رائج کردہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر چل رہی ہے۔"

یہ تو "دیباچہ" ہے، ورنہ اسلامی ثقافت نے فکر کے میدان اور عملی پیش قدمی میں انسانیت کو بے نیاز کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں پر عملاً اسلامی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ اگر مسلمان اسلام کی روح سے انحراف نہ کرتے اور اپنا رُخ صحیح طور پر اسلامی رکھتے تو آج علوم و معارف کی نشوونما کس پائے کی ہوتی لیکن بدقسمتی سے وہ فلسفیانہ جنگ و جدال اور عقائد کی لایعنی بحثوں میں اُلجھ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ضروری طور پر ان کی لایعنی بحثوں میں اُلجھ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ضروری طور پر ان کی ذہنی طاقتیں ضائع ہو گئیں۔

جغرافیہ کے میدان میں بھی مسلمانوں نے سبقت حاصل کی۔ انہوں نے پہلے یونان سے

Marfat.com

ضروری معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے مشاہدات، اور سیاحتوں کے ذریعے حاصل کی ہوئی معلومات سے ان میں اضافہ کیا۔ عربوں کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہی سب سے پہلے امریکہ پہنچے تھے۔ انہوں نے بطلیموس کی کئی غلطیوں کی اصلاح کی اور کئی ایسے منطقوں تک رسائی حاصل کی جہاں روم و یونان کے قدم نہ پہنچے تھے۔

مامون کے رشید کے عہد میں الخوارزمی اور اس کے ساتھیوں نے آسمان اور زمین کے نقشے تیار کیے اور کرۂ ارض کے محیط کا کامیاب اندازہ لگایا۔ اس کے بعد الادریسی نے کرۂ سماوی اور دنیا کا نقشہ تیار کیا جس میں واضح طور پر اس کے سرچشمے درج کیے جو بعد میں یورپیوں نے بیان کیے۔

المقدسی نے بیس برس تک سیر و سیاحت میں گزارے اور اس عرصے میں دنیا کے کئی علاقے دیکھے۔ اس نے جغرافیائی دائرۃ المعارف مدوّن کیا جس میں بڑی تفصیل سے ہر اس مقام کا تذکرہ کیا جہاں وہ گیا تھا۔ اور البیرونی نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں روس اور شمالی یورپ کی تفصیل بھی درج کی۔ ابو اسحٰق، ابراہیم بن یحییٰ الزرقالی نے بحیرۂ روم کا طول بلد ناپا جو ۴۲ درجے تھا اور یہ پیمائش آج کے علماء کے حساب سے بے حد قریب ہے۔ ہمیں الاصطخری کی کتاب، المسالک والممالک کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس میں اُس نے اسلامی ممالک کے کئی رنگین نقشے شامل کیے لیکن عرب جغرافیہ دانوں میں سب سے بڑا نام یاقوت الحموی کا ہے جس نے معجم البلدان کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں جغرافیے کا دائرۃ المعارف تالیف کیا۔ مسلمانوں نے یونان اور ہندوستان کے جغرافیہ دانوں سے جو حاصل کیا اس میں معتد بہ علمی اضافہ کیا، مثلاً انہوں نے زمین کی شکل، زمین کی گردش اور اسباب مد و جزر اور کئی دوسرے مسائل وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ عربوں نے سمندر کے سفر کے لیے بھی بڑے مفید نقشے تیار کیے اور واسکوڈی گاما نے انہی نقشوں کی مدد سے ۱۴۹۷ء میں دنیا کی سیاحت کی۔

علم تاریخ و عمرانیات میں تعلیم و تدریس کے میدان میں کئی کارنامے سر انجام دیئے۔ انہوں نے علم الحدیث کی مصطلحات وغیرہ سے استفادہ کیا اور اس سے تنقید اور روایات کی چھان پھٹک کا طریقہ اخذ کیا۔ کئی مؤرخین نے برسہا برس تاریخی مواد جمع کرنے اور اس کی تحقیق میں صرف کیے۔

Marfat.com

مسلمان مؤرخین نے قبل اسلام سے لے کر بعد تک کے ادوار کی تاریخ مرتب کی اور انہوں نے جو کچھ مرتب کیا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ضخامت کے لحاظ سے بعد میں لکھی جانے والی کتابیں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ان میں المسعودی ہے جس نے دنیا کے کئی خطوں کی سیاحت کی جن میں چین اور مدغاسکر بھی شامل ہیں اور ایسا ورثہ چھوڑا جو تیس جلدوں میں موجود ہے اس نے قبل اسلام سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کے حالات تفصیل سے بیان کیے۔ ان مؤرخین میں ہم ایک اور اہم شخصیت، ابن بطوطہ کو بھی شامل کر سکتے ہیں جس نے دنیا کی وسیع سیاحت کی اور آج بھی اس کے مشاہدات تاریخ اور عمرانیات کے علماء کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

ان مؤرخین میں ایک اہم نام ابن خلدون کا ہے، جس نے تاریخ کا رخ عمرانیات کی طرف سے موڑ دیا۔ اس نے تاریخی مطالعے کو تاریخی بحث کی اساس بنایا اور اس کے ذریعے فطری قوانین تغیر اور قوموں کے احوال میں تبدیلیوں کے اسباب بیان کیے۔ نقادان فن کا کہنا ہے کہ اس سے بڑا فلسفی مؤرخ آج تک نہیں گزرا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ عمرانیات کا بانی بھی ہے۔

جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے تو اس کی ابتداء عربوں میں یونانی کتابوں کے تراجم سے بہت پہلے ہو چکی تھی کیونکہ وہ اللہ کے وجود، اس کے عدل، اس کی رحمت، قضا و قدر، خلافت زمانی، روحانی وغیرہ پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ انہی مباحث کے نتیجے میں خوارج، مرجیہ، قدریہ وغیرہ کا ظہور ہوا۔ پھر معتزلہ کا مکتب فکر سامنے آیا اور اس کے ساتھ ہی اشاعرہ اور ماتریدیہ ظاہر ہوئے۔ مسلمانوں کے علم کلام نے مسیحی علم کلام پر خاصا اثر ڈالا۔

انہی فلسفیانہ مباحث میں دین اسلام اور فلسفہ یونان میں موافقت پیدا کرنے کی کوششیں بھی شامل ہیں، جن کے مؤید بالخصوص فارابی اور ابن رشد ہیں۔ اسلامی فلسفیانہ فکر کے نتائج کا جب بھی ذکر ہوگا تو ہم دیکھیں گے کہ ایجابی فلسفے سے چل کر یہ تصوف تک پہنچے۔

فلسفے کے میدان میں ہم کئی اہم نام گنوا سکتے ہیں مثلاً فارابی، جس کی تصنیفات اس میدان میں اہم ہیں، اور ابن سینا جس نے فلسفے میں کئی تصنیفات پیش کیں اور اپنے فکر

Marfat.com

اور اثر میں وہ افلاطون اور ارسطو کی ٹکر کا ہے، ابن رشد، ارسطو کا سب سے بڑا شارح ہے۔ اور اسی کے ذریعے ارسطو یورپ میں متعارف ہوا اور اس نے مشہور کیتھولک دینی عالم، ٹامس اکوائنس (Thomas Aquinas) اور دوسرے علما کو بے حد متاثر کیا۔

Marfat.com

اسلامی ثقافت
کے
سنگِ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

ترجمہ و تلخیص: راجہ ف۔م۔ ماجد

Institute of Islamic Culture

ادارہ ثقافت اسلامیہ

Lahore - Pakistan

Marfat.com